جولائی تا دسمبر ۶۹ء

بشطو نمبر ا (۵۲۰)

جولائی ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

مجلسِ ادارت

جلد ۱۰۴ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۹ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ابھی تک لکھنؤ کے شیعہ سنی اختلاف کا کوئی حل نہیں نکلا ہے، لیکن دونوں کے سنجیدہ طبقہ میں اسکی کوشش جاری ہے، اسلیے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا، ہم نے گذشتہ مہینہ اجمالاً اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا تھا، اس مہینہ کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، شیعہ سنی اختلاف کے نقصانات اسقدر کھلے ہوئے ہیں، خصوصاً ہندوستان کے مسلمان جن نازک حالات میں گھرے ہوئے ہیں، اُن میں اس اختلاف پر اور بھی حیرت ہوتی ہے، اس سے دونوں فرقوں کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے قطع نظر، اس سے ہمیشہ مسلمانوں کے دشمنوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، جس سے مسلمانوں کو من حیث القوم بڑا نقصان پہنچا ہے، اسوقت ہندوستان میں یہی صورتِ حال ہے، چنانچہ فرقہ پرور جماعتیں اس اختلاف کو بھڑکا کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں، ان کا افسوں سنیوں پر تو چل نہیں سکتا، اسلیے انکی کوشش ہے کہ وہ شیعوں سے ظاہری ہمدردی کرکے ان کو سنیوں سے الگ کر دیں، اس ہمدردی میں انھوں نے سنیوں کے بزرگوں پر تبرا بازی بھی شروع کر دی ہے، اور یہاں تک انکا دعویٰ ہے کہ شیعہ اپنے کو مسلمان نہیں صرف شیعہ کہتے ہیں، یعنی وہ اپنے کو مسلمانوں میں شامل نہیں کرتے جس کو کوئی شیعہ گوارا نہیں کر سکتا، انکی ہمدردی صرف فریب ہے، جس جماعت کا مقصد ہی اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا ہو وہ شیعوں کا وجود کب گوارا کر سکتی ہے، اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس کی زد سب سے زیادہ شیعوں ہی پر پڑتی ہے، مگر یہ اطمینان ہے کہ شیعوں کا سمجھدار طبقہ اس فریب کو پوری طرح سمجھتا ہے،

اس سے انکار نہیں کہ شیعہ سنیوں کے عقائد میں بعض بنیادی اختلافات ہیں، اسکے باوجود اختلاف کے مقابلہ میں وحدت کے پہلو زیادہ ہیں، دونوں توحید و رسالت کے قائل ہیں، ان کا رسول ایک، کتاب ایک، قبلہ ایک،

عبادات میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ یا خمس دونوں کے یہاں ارکان اسلام میں ہیں، معاملات کے بیشتر مسائل یکساں ہیں، دونوں کی تہذیب بھی ایک ہے، وحدت کے اتنے پہلوؤں کے ہوتے ہوئے آپس میں ایسا اختلاف جو عناد و دشمنی تک پہنچ جائے [illegible]

اگرچہ شیعہ سنیوں میں ہر دور میں اختلاف رہا، ان میں لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن اسی کے ساتھ بہت سے معاملات میں اشتراک و تعاون بھی رہا ہے، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ کا کوئی صفحہ انکے مشترک کاموں سے خالی نہیں ہے، یہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت مغل امپائر کو بنانے اور اسکو مستحکم کرنے میں شیعوں کا بڑا حصہ ہے، اسکے بڑے بڑے مدبر اور امراء اور اراکین سلطنت زیادہ تر شیعہ تھے، خود اورنگزیب جیسے کٹر سنی بادشاہ کی ماں اور ایک بیوی شیعہ تھی، اس دور کی سب سے بڑی اسلامی حکومت پاکستان کے بانی محمد علی جناح شیعہ تھے اور آج بھی اسکا صدر شیعہ ہے، اس سے پہلے سکندر مرزا بھی شیعہ تھے، ہندوستان میں جس کو اسلامی تمدن کہا جاتا ہے تمامتر ایرانی ہے، اور اسکو فروغ دینے والے شیعہ ہی ہیں، اکبری دور سے ہندو رانیوں کے ذریعہ شاہی محلات میں ہندو تمدن کے جو اثرات پہنچ گئے تھے، انکو نورجہاں نے مٹایا جو شیعہ تھی، اردو زبان کو تراش خراش کر ادبی زبان بنانے میں شیعوں کا بڑا حصہ ہے، اسکے بڑے بڑے شاعر اکثر شیعہ تھے، اردو شیعوں کی دوست نما دشمن فرقہ پرور جماعتیں ان سب کو مٹانا چاہتی ہیں، اسلیے اسکی زد سب سے زیادہ شیعوں ہی کے اوپر پڑتی ہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ شیعہ سنی ہمیشہ حریف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی رہے ہیں، اور ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی تاریخ بنانے میں دونوں کا حصہ ہے، اس زمانہ میں بھی مسلم یونیورسٹی دونوں کی مشترکہ کوشش کی یادگار ہے، مغلوں کے دور عروج تک مذہب کے دائرے سے باہر شیعہ سنی کا کوئی سوال نہیں تھا، یہ سارے جھگڑے زوال اور طوائف الملوکی کے دور کی پیداوار ہیں، جب انکے سامنے کوئی مشترک تعمیری کام نہیں رہ گیا تھا اور ہر امیر اپنے اقتدار کی فکر میں تھا، اس لیے یہ مذہب سے زیادہ اقتدار کی جنگ تھی،

شیعہ سنی اگر سمجھداری سے کام لیں تو اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے بھی متحد ہو سکتے ہیں، اس وقت اختلافی مسائل دو ہیں، ایک تبرا دوسرا مدح صحابہ، ان دونوں کے دو پہلو ہیں، اگر تبرا شیعوں کا جزو ایمان ہے تو اس سے ان کو کوئی نہیں روک سکتا، وہ اپنے عقیدہ پر قائم رہیں، اور اپنے گھروں اور اپنی مجلسوں میں جس طرح چاہیں اس پر عمل کریں،

لیکن کوئی قانون و اخلاق اسکی اجازت نہیں دے سکتا کہ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں اور سنیوں کے پیشواؤں کو جن کو خود قرآن نے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی سند دی ہے، اور جن کی عظمت کے غیر مسلم تک معترف ہیں، علانیہ اور برسر عام برا بھلا کہا جائے، جو شیعہ مورخین انکی دینی حیثیت کے قائل نہیں ہیں وہ بھی ان کے اسلامی خدمات اور کارناموں کے ذکر پر مجبور ہیں، اس لیے کہ تاریخ سے ان کو نہیں مٹایا جاسکتا، ایسی محترم ہستیوں پر دشنام طرازی قرآنی شرافت کے خلاف ہے، اس لیے بہت سے شیعہ مفکر اور اہل علم سرے سے تبرا کے خلاف ہیں، قرآن نے تو غیر مسلموں کے معبودان باطل کو بھی برا کہنے کی ممانعت کی ہے، اور برسرعام تبرا حضرت علیؓ کی سنت نہیں، بلکہ امیر معاویہؓ کی بدعت ہے، جس کو حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے بند کیا تھا،

مدح صحابہ کے بھی دو پہلو ہیں، ایک صحابہ کرام کے فضائل و مناقب، ان کے اسوۂ حسنہ اور انکے اسلامی خدمات کا بیان تو کسی حیثیت سے بھی قابل اعتراض نہیں، یہ تو دنیا کے لیے سبق آموز ہیں، اور ان کے بغیر اسلام کی تاریخ ناقص رہتی ہے، اس لیے اگر سنی اپنی مجلسوں اور مذہبی اجتماع میں ان کو بیان کرتے ہیں تو اس سے شیعوں کی کیا دل آزاری ہوتی ہے، اس کا دوسرا پہلو مدح صحابہ کے جلسے اور جلوس ہیں اپنی محرم کے جلوس کی طرح مدح صحابہ کا جلوس نکالا جائے اور اس میں مدح صحابہ کے اشعار پڑھے جائیں تو اہل سنت کے عقیدہ کی رو سے بھی بدعت ہوگا اگر شیعوں کی ضد میں ایسا کیا جائے تو اور بھی برا ہو اسلیے سنیوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے،

شیعہ سنی اختلاف کی یہ شکل کسی اسلامی ملک میں نہیں ہے، نہ شیعہ ملک ایران میں تبرا کی یہ شکل ہے اور نہ سنی ملکوں میں مدح صحابہ کی، وہاں ان مسائل کا وجود ہی نہیں ہے، یہ فخر صرف ہندوستان کے شیعہ سنیوں کو حاصل ہے کہ ان حالات میں بھی جب یہاں کے مسلمان ہر طرح کے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، وہ ان خرافات میں مبتلا ہیں، جس کا نتیجہ دونوں کو بھگتنا پڑے گا، امید ہے کہ ان سطور کی اشاعت کے وقت مفاہمت کی کوئی شکل نکل چکی ہوگی،

مقالات

عبدالقادر نورس اور اس کا کلام

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۲)

دیوان اور شاعری | دیوان نورس کا نادر نسخہ مدراس کے مشرقی مخطوطات کے سرکاری کتابخانے میں زیر شمارہ ف ۹۵ محفوظ ہے، اس میں ۱۸۶ صفحے اور ہر صفحے میں ۹ سطریں ہیں، خط نستعلیق ہے اور یہ جدید خط سو سال سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا، مرتب فہرست (ج ۱ ص ۲۰۱ - ۲۰۲) بعض امور کے متعلق غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں، مثلاً

۱۔ نورس کو خاصہ مشہور (well-known) شاعر قرار دیا ہے، حالانکہ اس کو اتنی شہرت حاصل نہ تھی،

۲۔ دیوان کو خط قدیم بتایا ہے، جو حقیقت سے دور ہے،

۳۔ یہ خیال کہ نورس نے اپنی ماں کا مرثیہ لکھا تھا اور اس میں اپنے ممدوح محمد علی سے مدد طلب کی تھی، سراسر غلط ہے، ماں کے مرثیہ میں کسی ممدوح کا ذکر نہیں، البتہ سلطان محمد عادلشاہ اور سلطان علی عادلشاہ کے لیے الگ قطعات لکھے ہیں، اور ان دونوں مخدوموں کا نام یکجا کر کے ایک فرضی نام محمد علی بنا لیا ہے، جس سے امداد طلب کرنے کی روایت فرض کر لی ہے۔

۴۔ اس کو نثر نویس بھی قرار دیا گیا ہے، مگر زیرِ نظر دیوان میں کوئی نثری نمونہ شامل نہیں،
اس لیے یہ بیان یقیناً کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے،
نورس کا دیوان حسبِ ذیل اجزا پر مشتمل ہے:

(الف) غزلیات بترتیب حروف تہجی	ورق ۱ب — ۸۰ا
(ب) مقطعات	ورق ۸۰ا — ۸۸ا
(ب) رباعیات	ورق ۸۸ب — ۹۲ب
(ج) مثنوی ساقی نامہ	ورق ۹۲ب — ۹۴ب

دیوان بہت اچھی حالت میں ہے اور بحالت موجود مکمل ہے، اوراق بھی بے ترتیب نہیں،
اگرچہ نورس ایک قادر الکلام شاعر تھا، مگر اس کو درجۂ اول کا شاعر نہیں قرار دیا جا سکتا، اس نے غزلیں زیادہ لکھی ہیں مگر ان میں بھی وہ سوز و گداز نہیں جو شاعری کی جان ہے، قادر الکلامی کے باوجود اس کے اشعار ضرب المثل نہیں ہو سکے، اسی طرح اس کے تراشے ہوئے فقرے بھی کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں، اور حسن تخئیل اور حسن بیان اس کی شاعری کی عمومی خصوصیت نہیں ہے، مگر اس کے بعض اشعار بڑے دلکش ہیں، جنھیں اچھی شاعری کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے، ایک خاص بات یہ ہے کہ باوجود کم گو ہونے کے (یہ قیاس مختصر دیوان کی بنا پر ہے) کلام یک رنگ نہیں، بعض اشعار بہت پست اور بعض بہت بلند ہیں، اس کی غزلوں کی حسبِ ذیل خصوصیات قابل ذکر ہیں:

۱۔ عام شاعروں کی طرح نورس نے بھی اپنے پیشرو شعرا میں سعدی اور کمال خجندی کا ذکر کیا ہے:

بندۂ[1] آں سعدی و قیتم چو عیشی کز دمش — لفظ و معنی در سواد جامہ بوی گل گرفت

بجا طرم[2] زخیالات نورسی گذرد — کہ رشک شعر کمال خجند خواہد شد

---

[1] دیوان ورق ۱۵ا [2] ورق ۴۰ب۔ اس بیت میں مصائب کا ذکر کرتا ہے۔

بر دشعر نورس بصائب رساں — کہ او غیرت از شعر سنجر برد (ورق ۳۲ب)

معلوم نہیں کہ اس میں میر سنجر کاشی کی طرف اشارہ ہے یا کسی اور کی طرف۔

معلوم نہیں کمال خجندی کی شاعری سے واقعی متاثر تھا یا محض قافیہ کی مجبوری سے اس کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ بعض شاعروں کی تقلید اس طرح کی ہے کہ ان کی مشہور غزلوں کے جواب میں غزلیں لکھی ہیں مثلاً حسب ذیل غزل حافظ کی مشہور غزل

ساقی حدیث سرو وگل ولالہ می رود　　　　واین بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

کے جواب میں واقع ہوئی ہے، اور اس غزل[1] کو ایک کامیاب کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔

چون سرزند سرشک تف نالہ می رود　　　　آری تب از دمیدن بتحالہ می رود

درخوبی رخ تو تفاوت نشد ز خط　　　　کی روشنی مہر ومہ از ہالہ می رود

گویم نخلق چون لب تو حرف سرزند　　　　آری بتحفۂ قند بہ بنگالہ می رود

درمیکدہ اگر دل من شاد شد، چہ شد　　　　اینجا سخن ز کلفت صد سالہ می رود

چون تو گلم بناز کند سیر باغ وراغ　　　　از شرم رنگ وروی گل ولالہ می رود

زاہد برو برای فریبم مکن تلاش　　　　از جا چنا کلیم ز گو سالہ می رود

چون می رود بہ بزم سخن طبع نورسی　　　　معنی ز پیش ولفظ ز دنبالہ می رود

۳۔ بعض غزلوں میں شاعر کی ہمعصر اہم شخصیتوں کا ذکر ہے، مثلاً سپہ سالار احمد غازی (ورق ۴ب)، عیشی (ورق ۱۵آ)، ابراہیم عادلشاہ (مسمی خلیل) ورق ۱۸، عجائب وشجر (ورق ۳۲ب) شہنشاہ دکن (ورق ۵۳ب) حسن محمد خاندیسی (۴۴آ)، شاہ نورس ابراہیم (۴۵آ)، شہ عادل لقب (۴۲ب)[2]

۴۔ بعض غزلیں روانی حسن تشبیہ اور تخیل کی اچھی مثالیں ہیں، اسکے نمونے حسب ذیل ہیں:

بہار آمد وبلبل چمن بنالہ گرفت　　　　خوش آن کسی کہ درین ذوق خوش پیالہ گرفت

سپاہ حسن تو بر روشنان شبخون زد　　　　ازان سبب مہ روشن حصار ہالہ گرفت

---

[1] ورق ۵۳ب [2] ورق ۱۲ الف

ذوزرفت بصد دجلہ شد گرہ در حلق — ز خوان چرخ خنک ہر کہ یک نوالہ گرفت

خراب کردۂ آں چشم فتنہ انگیزم — کہ طرز گردش او نکتہ بر غزالہ گرفت

بی نظارۂ گل در چمن مرد شیریں — کہ اشک دیدۂ فرہاد رنگ لالہ گرفت

ز دعوی چگونہ شود ذلیل فلک — کہ در ازل ز خط سکہ اش قبالہ گرفت

ز نوزسی سخنداں دگر چہ می طلبی — کہ یک دو بیت ترا از صد رسالہ گرفت

جان من از من بریدی عہد الفت را چہ شد[1] — طرح یکرنگی و آغاز محبت را چہ شد

پیش ازیں ہر ساعتم صد لطف میکردی کنوں — مہربانی را چہ پیش آمد مروت را چہ شد

ہیچکس گرم تعصب نیست در ایام ما — اختلاف کیش ہفتاد و دو ملت را چہ شد

سر زند در گلشن از بلبل دمادم صد غزل — گل ہمہ بردی بسی خندد فصاحت را چہ شد

کام دل اینجا بصد منت نمی افتد بدست — ہاں برو کمند باغم ساز ہمت را چہ شد

غیر خرسنداست اگر می ہر شب نوزسی — زود ترک فکر کار خویش نوبت را چہ شد

نوزسی کے قطعات بڑی اہمیت رکھتے ہیں، شاہان دکن کے ذیل میں بعض قطعات کا ذکر آچکا ہے،

پہلے ان قطعات کا ذکر کیا جاتا ہے، جن سے کچھ تاریخی مواد فراہم ہوتا ہے، مثلاً

۱۔ خواص خاں[2] ایک نالائق حاکم تھا،

۲۔ ۱۰۴۷ھ[3] میں محمد عادل شاہ کے وزیر کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، وزیر کی خوبیوں کے ساتھ لڑکے کی پیدائش کی تاریخ "مہر سپہر سعادت" (۱۰۴۷ھ) نکالی گئی ہے،

۳۔ اسی سال ایک ممدوح کے دو بچے فوت ہوئے، اس پر اس نے حسب ذیل قطعہ لکھا:[4]

صاحبا از دو جگر گوشۂ توصیف کہ نیست — خلد را چوں رخ ایشان بحدیقہ وردی

سال شان گر بتثل از تو بپرسند بگو — آہ دردی و گرم داد فلک بر دردی

---

[1] ورق ۱۴۳ ب [2] ورق ۱۰۶ ب [3] ورق ۲۸۵ [4] ورق ۱۵۸ ب

۴۔ فتح خاں غالباً علی عادل شاہ کے دور کا امیر تھا، اور بڑا بادہ نوش تھا، ۱۰۱۹ھ میں اس نے شراب سے توبہ کی۔ نورس نے "فتح خاں" گذاشتہ "مل" سے اسکی تاریخ نکالی ہے،[۱]

۵۔ محمد عادل شاہ کی وفات کا سال ایک قطعہ میں درج کیا ہے۔[۲]

اس میں ضمناً ذکر ہے کہ اس نے ماں کے مرثیے میں جو قطعہ لکھا ہے وہ بڑا پر تاثیر اور دلکش ہے،

نورس کے وہ قطعات جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، ان میں سے بعض کی تفصیل پیش کیجاتی ہے،

۱۔ ایک قطعۂ تاریخ خواص خاں کے قتل پر لکھا ہے، اس میں "در یجان سرش برید" سے قتل کی تاریخ ۱۰۴۵ھ نکلتی ہے۔[۳]

خواص خاں جو محمد عادل شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ہی مصطفیٰ خاں کے ساتھ ناظم مہمات مملکت مقرر ہوا تھا، نہایت بد سرشت حاکم تھا، اس کا نام دولت یار تھا، یہ اور اس کا بھائی مبارک یار دونوں بادشاہ کے ایک متنبیٰ شاگرد چاند خاں کے غلام تھے، یہ دونوں اصلاً مرہٹہ تھے چاند خاں نے دونوں کو بادشاہ کے حوالے کر دیا، بادشاہ نے ۱۰۳۲ھ میں دولت یار کو دولت خاں کا خطاب دیکر بیجاپور کا حوالہ دار مقرر کیا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کی خفیف الحرکاتی سے ناخوش ہو کر قید کر دیا، مگر پھر مرزا امین کی سفارش پر جو بعد میں محمد عادل شاہ کے دور میں مصطفیٰ خاں کے لقب سے ملقب ہوا، اس کے عہدہ پر دوبارہ بحال کر دیا اور مرزا امین سے کسی معاملے میں انحراف نہ کرنے کی تاکید کی، محمد عادل شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر اس نے اپنے محسن محمد امین کے دوش بدوش اپنے اخلاص و وفاداری کا ثبوت دیا، اس کے نتیجے میں محمد امین مصطفیٰ خاں اور دولت خاں خواص خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے، اور دونوں کو امور مہمات مملکت کا ناظم مقرر کیا گیا۔[۴] لیکن خواص خاں کی طبیعت میں دنائت تھی جس کا اظہار تھوڑے ہی دنوں میں ہونے لگا،

---

[۱] ورق ۲۶ ب، اس قطعہ میں "بجز کشی" کا فقرہ دلچسپ ہے، [۲] ایضاً [۳] ورق ۱۸ ب - ۱۸۳ [۴] دیوان ورق ۱۸۳
[۵] یہ تفصیلات بساتین السلاطین ص ۲۸۲، ۲۸۴ سے ماخوذ ہیں،

اور وہ اپنے عزیزوں اور اپنے قدیم ہم مذہبوں کی بیجا طرفداری کرنے لگا، محمد ظہور نے محمد نامے[1] میں اس پر یہ قطعہ لکھا ہے جس کا پہلا شعر حسب حال ہے

سفلہ را جا بر دی صدر مدہ تا نگردی ایمن بخوف وخطر

رفتہ رفتہ اس نے اپنا اقتدار اتنا بڑھا لیا کہ مصطفے خاں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا، اور اب اس کے عجب و غرور کی کوئی حد نہ رہ گئی، سپہ سالاری کا منصب مراری نام ایک برہمن کے سپرد کیا اور سارے نظم ونسق پر پوری طرح مسلط ہو گیا، اس کا ایک بھائی حسین خاں تھا، اس کو قلعہ دار مقرر کیا، اس کا فسق وفجور اور خلق آزاری ضرب المثل بن گئی، ظہور لکھتا ہے:

نام شس حسین خاں بغلط کرکشیدی بنام نیکاں خط

نوبت یہاں تک پہنچی کہ مراری پنڈت کے اغوا سے مصطفے خاں سے برسر پیکار ہو گیا اور خاں مذکور کو مع اس کے رفقا اسد خاں، مرزا نور الدین وغیرہ کے قید کر لیا، مگر اس طرح دوسرے معتمدان بارگاہ کو برطرف کر دینا آسان کام تھا، اس لیے جب اس کی شقاوت اور مردم آزاری حد سے بڑھ گئی تو امرانے رستم زماں سے ملکر اس کے برطرف کرنے کی سازش کی، اس درمیان میں بادشاہ کو خبر لگی کہ خواص خاں مغل بادشاہ شاہ جہاں سے خفیہ طور پر سازش کر رہا ہے، اس خبر سے محمد عادل شاہ کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی، اس نے اخلاص خاں کو جو اس وقت سیدی ریحاں رقعہ رساں کے نام سے مشہور تھا، اس کام پر مامور کیا، اس نے کریم شہزادہ اور حسین خاں سے مشورہ کیا، دونوں خواص خاں کے قتل پر تیار ہو گئے، اور ایک روز جب خواص خاں شاہی دربار سے نکل رہا تھا، موقع پاکر کریم شہزادہ نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا، اور حسین خاں نے آگے بڑھ کر دوسرا وار کر کے کام تمام کر دیا، اسکے

---

[1] نسخہ کتابخانۂ دانشگاہ اسلامی علی گڑھ ورق ۱۳۶

بعد ہی مبارک خاں بھی قتل ہوا، اور دونوں کے سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیے گئے، اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد مرار بھی جو خواص خاں کا پروردہ اور سپہ سالاری کے معزز عہدے پر متمکن تھا، اپنے کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا۔ تاریخ محمدی کا مولف ظہور بن ظہوری لکھتا ہے کہ خواص خاں[1] کا قتل ایسا مبارک ثابت ہوا کہ لوگوں نے قحط کی مصیبت سے نجات پائی، عرصے سے بارش نہیں ہوئی تھی، اس کے بعد بارش خوب ہوئی اور لوگوں کی امیدیں بر آئیں،

محمد نامے کے نسخہ علی گڑھ میں خواص خاں کے زوال اور قتل کا واقعہ ۱۰۳۹ھ[2] میں بتایا گیا ہے، جو سراسر غلط ہے، یہ واقعہ ۱۰۴۵ھ کا ہے، جیسا کہ عبد القادر نورس کے قطعے سے ظاہر ہوتا ہے، بساتین السلاطین میں صحیح تاریخ ۱۰۴۵ھ[3] بتائی گئی ہے، اور نورس شاعر کی تاریخ[4] بھی درج ہے (اگرچہ اس میں شاعر کا نام مذکور نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ جب یہ پورا قطعہ اس کے دیوان میں موجود ہے تو پھر اسے کسی اور کی ملک قرار نہیں دیا جا سکتا، وہ قطعہ یہ ہے[5]

آں بیش بد قیافہ زمانہ کہ روی او	اہل زمانہ دیدہ بس آزردہ دل شدہ
پیش دلیس پرنیدہ قبل کردہ مدتی	چوں نادرش بدست بسی منفعل شدہ
از شرم لاف مردی و مردانگی خود	چنداں گریستہ کہ سراپا بگل شدہ
برخاست چوں خجل شدہ از پای آں حصار	تاریخ شد چنیں کہ زمانہ خجل شدہ

"زمانہ خجل شدہ" سے ۱۰۴۵ھ تاریخ نکلتی ہے، اس قطعہ میں مغلوں کے حملے کی طرف اشارہ مقصود ہے،

قلعۂ پرندہ پہلے نظام شاہی قلمرو میں تھا، پھر محمد عادل شاہ کی تخت نشینی کے چند ہی سال کے اندر[6]

---

[1] یہ تفصیلات محمد نامہ نسخہ کتابخانہ دانشگاہ اسلامی علی گڑھ ورق ۱۳۶ا - ۱۴۲ب سے ماخوذ ہیں [2] ورق ۱۴۱ا

[3] ص ۳۴۵ - ۳۴۶ [4] ص ۳۱۲ [5] دیوان ورق ۸۷ا

عادلشاہی سلطنت میں شامل ہو گیا، جب نظام شاہی سلطنت میں ابتری پھیلی تو وہاں کے حاکم آغا رضوان نے یہ قلعہ عادلشاہی امرا کے سپرد کر دیا اور ۱۰۴۲ھ میں وہاں سے شہرۂ آفاق توپ ملک میدان سپہ سالار[۱] مراری برہمن کے واسطے سے بیجاپور لائی گئی، ۱۰۴۵ھ میں مغل سپہ سالار مہابت خاں نے شاہزادہ[۲] دارا شکوہ کی سرکردگی میں اس قلعے کا محاصرہ کیا، اس کی فوج چار ماہ تک قلعہ کا محاصرہ کیے پڑی رہی مگر سرنگ لانے میں کامیابی نہ ہو سکی، عادلشاہی امرا جو قلعہ کی حفاظت پر متعین تھے، ان میں رستم زماں، پیش جنگ خاں، فرہاد خاں اور آنکس خاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان ہی کی مردانہ مدافعت سے مغل لشکر محاصرہ اٹھانے پر مجبور رہا، ظہور[۳] تاریخ محمدی میں لکھتا ہے :۔

"چون دریافتند کہ در پای برج حصار بہ نقب زدن کار از پیش نمی رود، بنایت دل تنگ گرفتہ خاطر گشتند و مہابت خاں از امتداد محاصرہ و جنگ بنایت محزون واندوگہیں شدہ ..... بی اختیار قدم در راہ فرار نہاد و شہزادہ دارا شکوہ را بجہت محافظت بجای چتر زرین سپہر آمنیں بر سر گرفتہ در میان لشکر جای داد و فرمان طلب شاہجہاں را بہانہ ساختہ متوجہ ہندوستان شد، و بہادران سپاہ حضرت پادشاہ غازی تمام راہ مغولان را تعاقب نمودہ غارت کنان می رفتند، خان ظفر توام رستم زماں اگر دران زماں پاس امر حضرت پادشاہ غازی نمی داشت از لشکر مخالفاں ہیچ گریزندہ را زندہ نمی گذاشت..... مہابت خان بہر منزلی کہ می رسید نقود نامعدود بطریق باج و خراج پیشکش دز را حضرت پادشاہ غازی می نمود و بہمیں نہج خود را بہ برہان پور رسانید"

واضح ہے کہ نورس نے اسی محاصرہ کا ذکر اپنے قطعہ میں کیا ہے، اس قیاس کی تائید حسب ذیل امور سے ہوتی ہے،

---

[۱] یہ اطلاع بساتین السلاطین ص سے ماخوذ ہے، [۲] دیکھئے محمد نامہ ورق ۱۰۰ الف و بساتین [۳] محمد نامہ ورق ۱۱۸ ب
[۴] ایضاً ورق ۱۱۸ - ۱۱۹ ملخصاً

۱- پرینده کا یہ محاصرہ تاریخوں میں مذکور ہے۔

۲- اگرچہ محمد نامہ اور بساتین السلاطین میں اس واقعہ کی کوئی متعین تاریخ درج نہیں ہے، لیکن دونوں میں اس کو ۱۰۴۴ھ اور ۱۰۴۵ھ کے درمیان بیان کیا گیا ہے (یعنی مراری کے ۱۰۴۲ھ میں دوبارہ ملک میدان کے لانے کے بعد اور خواص خاں کے واقعہ سے پہلے) بساتین[۱] میں اس کو مصطفیٰ خاں کے قید ہونے کے قریب کا بتایا گیا ہے، ان ہی ایام میں خواص خاں بھی مقتول ہوا جس کی تاریخ بساتین وغیرہ میں ۱۰۴۵ھ تصریح کے ساتھ ملتی ہے، اس بنا پر پرینده کا محاصرہ بھی ابتدائے ۱۰۴۵ھ کا قرار دیا جا سکتا ہے، اور چونکہ نورس کے قطعے میں یہی تاریخ واضح طور پر درج ہے، اس لیے اس قطعہ کو پرینده کے علاوہ کسی اور محاصرہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

قطعہ میں "بیش بد قیافہ" سے بظاہر مہابت خاں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۳- نورس نے رندولہ کی وفات پر[۲] یہ قطعہ نظم کیا تھا،

رندولہ خاں کہ حضرت شاہ گفت او را بہ رستم زمانم
چوں شدہ ز جہاں، فغان کردم از چرخ گذشت چوں فغانم
ایں بیش کہ سرنگوں نوید تا بخشش ... خانہ بانم
سرزد ز زبان حضرت شاہ "افسوس ز رستم زمانم"

"افسوس ز رستم زمانم" سے ۱۰۵۲ھ تاریخ نکلتی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رندولہ خاں نے جو "رستم زماں" کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا اسی سنہ میں وفات پائی، رندولہ خاں عہد محمد شاہی کا نامور سپہ سالار گذرا ہے، اسی کی فوجی قابلیت سے عادلشاہی حکومت کو استحکام اور وسعت حاصل ہوئی، اس کے بارے میں تاریخ محمدی[۳] اور بساتین[۴] میں بڑی مفید اور کارآمد باتیں ملتی ہیں، اول الذکر

---

[۱] ص [۲] دیوان ورق ۱۰۹ [۳] ورق ۱۵۰، ۱۵۸ [۴] ص

سے معلوم ہوتا ہے کہ کرناٹک اور ملنار کی ابتدائی فتوحات اس کی قابلیت کا نتیجہ تھیں، بکیری[1] کا زمیندار دیر عبدر[2] اسی کے ہاتھوں پسپا ہوا، اور اس نے اٹھارہ[3] لاکھ ہون اور اپنی نصف ولایت دے کر صلح کی، چند ہی دنوں بعد پھر قلعہ بکیری پر بادشاہی افواج کا قبضہ ہوا، گنگ[4] نایک بکیری کی فتوحات میں رستم زماں کے ساتھ تھا، جب باغی ہوا تو رستم زماں ہی اس کی سرکوبی پر مامور ہوا، اور اس کو ایسا مجبور کیا کہ چالیس[5] لاکھ ہون دینے پر راضی ہونا پڑا، چکنا کین ہلی[6] پھلے کے موقع پر رستم زماں افضل خاں سپہ سالار کے ساتھ تھا، اسی طرح قلعہ ٹکور اور بلور کی فتح کے موقع پر افضل خاں اور رستم زماں دونوں بادشاہی افواج کے سردار اور سرگروہ تھے، بالاپور کی فتح بھی رستم زماں کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی،

ان واقعات کی تفصیل اور قلعوں کے ناموں میں تاریخ محمدی اور بساتین السلاطین میں کچھ اختلاف ہے، راقم نے محمد نامہ کے بیان کا خلاصہ دیا ہے، ہمارے پیش نظر نسخے میں اغلاط بہت ہیں، اس بنا پر ہمارے بیان میں بھی غلط مبحث کا امکان ہے، اگرچہ بساتین کے اہم مآخذ میں محمد نامہ شامل تھا، لیکن بعض اہم امور میں دونوں میں بظاہر اختلاف پایا جاتا ہے، محمد نامہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رندولہ خاں کا عروج ۱۰۴۵ھ[7] کے بعد ہوا ہے، اور اس کو اس خطاب سے اس تاریخ کے بعد ملقب کیا گیا، چنانچہ ظہور[8] رقمطراز ہے:-

" درہزار وسی[9] رندولہ خاں ابن فرہاد خاں راکہ یکی از خانہ زادگان درگاہ معلی بود بحضور موفور السرور طلبیدہ خطاب رستم زمانی وخلعت سپہ سالاری مرحمت فرمودند وجہت انتظام ولایات آں حدود (کرناٹک وملنار) دبرای تنبیہ نمودن دیر عبدر کہ در قلعہ بکیری بجمعیت خزانہ وکثرت خیل وحشم دم از نافرمانی میزد، نامزد نمودند، رستم زماں باسپاہ ظفر آثار بسرحد ملنار رسیدہ ..... قلعہ بکیری را متصرف گردید قریب یک ماہ در آنجا مقام نمود ..... بر قلعہ کنول درک کہ

---

[1] بساتین میں آنگیری ہے، [2] معلوم نہیں صحیح قرأت کیا ہوگی [3] نام کی قرأت قطعی نہیں [4] اسکا املا مختلف طرح پر ہے [5] اسکی صحیح قرأت معلوم نہ ہوسکی [6] ورق ۱۵۰ [7] یہ تاریخ غلط ہے، اس تاریخ میں غلط تاریخ کی متعدد مثالیں ملتی ہیں

در عہد رندولہ خان متصل بود تاخت نمود ..... "

اس تفصیل سے واضح ہے کہ رندولہ خان کو اسی مہم کے موقع پر رستم زماں خان کا خطاب ملا تھا، اور چونکہ یہ مہم ۱۶۳۴ء - ۱۰۴۴ھ میں شروع ہوئی، اس بنا پر اس خطاب کی تاریخ بھی یہی ہوگی ۱۰۴۴ھ میں خواص خاں مقتول ہوا اور اس کا معتمد علیہ مراری پنڈت بھی ایک ماہ کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اس سے مزید یہ خیال ہوتا ہے کہ مراری کے بعد یہ عہدہ رستم زماں کے سپرد کیا گیا،

رستم زماں نام کا ایک سردار اس مہم سے قبل کی دو بڑی مہموں میں تاریخ محمدی میں نظر آتا ہے، ایک پرندہ کے محاصرہ[۱] کے موقع پر، اس مہم میں جو عادلشاہی سردار کی محافظت پر مامور تھے اُن میں رستم زماں سرلشکر تھا، دوسری بار جو امراء خواص خاں کو برطرف کرنے میں پیش پیش تھے ان میں رستم زماں بھی شامل تھا[۲]، بساتین میں دونوں جگہ[۳] رستم زماں کے بجائے رندولہ خاں تحریر ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رستم زماں کا عہدہ اس کو ۱۰۴۵ھ سے قبل مل چکا تھا، مگر تاریخ محمدی کے واضح بیان کی موجودگی میں اس خیال کو صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ یہ معلوم ہے کہ ان واقعات میں بساتین کا اصلی ماخذ یہی آخر الذکر تاریخ ہے، واقعہ یہ ہے کہ رستم زماں کا خطاب اسی زمانہ میں رائج تھا، مگر ۱۰۴۵ھ سے قبل جو امیر اس خطاب کا حامل تھا، اسکے نام سے ہم واقف نہیں، ۱۰۴۶ھ کے بعد یہ خطاب رندولہ خاں کو ملا، اور اس کی وفات ۱۰۵۲ھ کے بعد ۱۰۵۴ھ میں شاہزادہ علی کے تقریب جشن ختنہ[۴] کے سلسلہ میں رحیم خاں کا ذکر اس خطاب کے ساتھ ہے، علی عادلشاہ ثانی کے دور میں رستم زماں کا خطاب مروج تھا، چنانچہ "تاریخ علی عادلشاہی"[۵] میں دو بار رستم زماں وزیر کا ذکر آیا ہے،

مختصر یہ کہ رندولہ خاں ۱۰۴۶ھ - ۱۶۳۶ء میں رستم زماں کے خطاب سے سرفراز ہوا، لیکن

۱؎ ورق ۱۱۷ - ۱۱۹ ۲؎ ورق ۱۳۷ - ۱۳۸ ۳؎ ص ۳۰۷ - ۳۰۹ علی الترتیب ۴؎ ورق ۲۱۴ | ۵؎ صفحات ۱۴۹

صاحب بساتین کی غلط فہمی کی بنا پر تاریخ محمدی میں جہاں جہاں رستم زمان آیا ہے اس کو رندولہ خاں سے بدل دیا ہے۔ اس بنا پر محاصرۂ پینڈہ اور واقعۂ خواص خاں میں جو رستم زماں مذکور ہے اس کو رندولہ سے الگ سمجھنا چاہیے، اس کے باوجود رندولہ خاں کی شخصیت کی اہمیت اور اس کی ذاتی قابلیت کسی ثبوت کی محتاج نہیں، نوروز کے قطعے کی اہمیت یہ ہے کہ تاریخ میں رندولہ کی وفات کا ذکر نہیں ہے، اس اہم شخصیت کی تاریخ وفات درج کر کے اس کمی کو پورا کیا،

نوروز کی رباعیات بھی تاریخی مواد کا کام دیتی ہیں، ایک رباعی شب برات کے چراغاں کے موقع پر لکھی گئی تھی، دکن میں عام طور پر شب برات کا چراغاں بڑی خصوصیت رکھتا تھا، شاہان وقت بھی اس میں بڑی دلچسپی لیتے تھے، اس لیے شعراء کے دواوین میں اس تقریب کی اکثر نظمیں موجود ہیں، نوروز کی اس تقریب کی رباعی یہ ہے:[1]

ای بر تو شب برات میموں باد   عمر تو زہر چہ ہست افزوں باد
از فرط چراغ مجلس تو ہر شب   زینت دہ دہر ہمچوں گردوں باد

درج ذیل رباعی کسی "کاکا غیز" سے جنگ کے موقع پر لکھی گئی تھی،

از بیم تو گشت زرد کاکا غیز[2]   پیچید رخ از نبرد کاکا غیز
شاہ ز تو پرسد گر تاریخش گو   رہ بگریز کرد کاکا غیز

نام سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ کوئی پرتگیزی تھا،

بظاہر اس واقعہ کی تاریخ ۱۰۳۹ھ ہوگی جو کاکا غیز کے کاکے اعداد کے نکالنے سے حاصل ہوتی ہے،

دو رباعیوں میں سلطان علی عادل شاہ کی تاریخ جلوس ہے، اور ایک رباعی قدیم ہے جو

---

[1] دیوان ورق ۸۸ ب [2] ورق ۱۰ ب

۱۱۳۲ھ[1] میں حضرت عتیق اللہ کے روضے کی تعمیر کے موقع پر لکھی گئی تھی، اس میں بیت العتیق" سے تاریخ نکلتی ہے،

بعض رباعیاں دلکش ہیں، حسب ذیل رباعی سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا:-

از رنگ تو ایزد شفق گردوں کرد　　مرقوم ز نعت ورق گردوں کرد

تا بر تو فرشتگاں فرستند درود　　پر از گل انجم طبق گردوں کرد

آخر میں ۳۴[2] ابیات پر مشتمل ایک ساقی نامہ ہے، لیکن نہ اس کے ممدوح کا پتہ ہے اور نہ تاریخ تصنیف کا، اس میں ساقی و شراب کی تعریف ہے، اور عام ساقی ناموں کی طرح تشبیہات و استعارات کے اچھے نمونے پیش کیے گئے ہیں، چند اشعار درج ذیل ہیں،

من و مدح پیر خرابات من　　کہ چوں مہر روشن کند ذات من

بدل صبح و شامش ستائش کنم　　بجاں شام صبحش ثنائش کنم

مروت بطبعش چو نشا ء بمی　　سخاوت بدستش چو نغمہ بنی

حریفاں بعبد جاں فدائی دہند　　شہان دو عالم گدائی دہند

گدا را بیک جرعۂ جام می　　دہد پادشاہی کاؤس و کی

کند گاہ دیوانہ فرزانہ را　　کند گاہ فرزانہ دیوانہ را

گہ از خندہ چوں جام خندانم　　گہ از گریہ چوں شیشہ گریاندم

ازاں غازہ و وسمۂ مشکبوی　　کشد مہر و مہ را برابروی و روی

شد از اہتمام تماشش شراب　　بمعنی چو آتش بصورت چو آب

دمی رنگ و بویش چو ساغر گرفت　　گل و لالہ را گرم شد در گرفت

---

[1] ورق ۸۸ ب [2] ورق ۹۲ تا ۹۴ ب

مگر تاک او را خضر داد آب	کہ زندہ کند مردہ را از شراب
بدست از سبو چو برارد شراب	زند پنجہ در پنجۂ آفتاب
شب تیرہ چون در ایاغ کسی	فروافگند می زشیشہ بسی
حباب آن زمان سر زند از ایاغ	کند کار صد گوہر شب چراغ
گر از می دمی شعلہ افروز دش	زمین وزمان را چو خس سوزدش
سخن کوتہ او پیر پیران بود	غلط گفتم از بی نظیران بود
از و شد برونق چنین میکدہ	کہ گویم بہشت برین میکدہ

فاتح ہند محمد بن قاسم ثقفیؒ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

۹۶ھ میں محمد بن قاسم کی موت اور اس کی نوعیت

اموی دور خلافت کا درمیانی حصہ اس اعتبار سے بڑا شاندار تھا کہ اس میں بہت سے ممالک فتح ہوئے اور حدود خلافت میں بڑی وسعت پیدا ہوئی، امام ذہبیؒ نے لکھا کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا زمانہ (۸۶ھ ۔ ۹۶ھ) بہت ہی برکت وسعادت کا زمانہ تھا، اس کے دور میں ہندوستان، ترک اور اندلس کی فتوحات ہوئیں اور ۹۳ھ میں خاص طور سے ارض مغرب، اندلس، روم اور سرزمین ہند کے ملک فتح ہوئے، بلکہ سن ۹۰ھ کے بعد مشرق ومغرب میں جس قدر فتوحات ہوئیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے بعد اس قدر فتوحات کسی زمانہ میں نہیں ہوئی تھیں[۱]، ان ہی ایام میں محمد بن قاسم کی قیادت میں ہندوستان میں بھی فتوحات ہوئیں، مگر اسی کے ساتھ خلافت کے اندرونی نظام میں ابتری بھی پیدا ہو چکی تھی، حجاج کی سفاکی نے ہر طرف بے چینی برپا کر رکھی تھی، اور امراء وحکام میں بھی رقابت، عداوت، حسد اور انتقام کے جذبات پیدا ہوگئے تھے، اسکی زد میں بڑے بڑے لوگ جو اموی حکومت کے دست وبازو تھے آگئے، محمد بن قاسم بھی اسی میں تھے، چنانچہ وہ ہندوستان کے میدان جہاد سے گرفتار کرکے عراق پہنچائے گئے اور انتقامی جذبات نے

۱؎ العبر ج ۱ ص ۱۰۶ و ۱۱۴

ان کو واسط کے قید خانہ میں موت کے گھاٹ اتار دیا،

۹۵ھ میں حجاج نے اپنی موت کے وقت اپنے لڑکے عبد الملک بن حجاج اور یزید بن مسلم کو عراق پر مقرر کیا تھا، اس کے ایک سال بعد ۹۶ھ میں ولید کی موت پر سلیمان بن عبد الملک خلیفہ ہوا، اس نے عبد الملک بن حجاج کی جگہ یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو عراق کی حکومت پر مامور کیا، پھر یزید بن ابی کبشہ اور یزید بن مسلم دونوں کو عراق سے ہٹا کر یزید بن مہلب ازدی کو امیر حرب اور صالح بن عبد الرحمٰن تیمی کو امیر خراج بنایا، اس کے بھائی آدم بن عبد الرحمٰن تیمی کو حجاج نے خوارج کے ہم خیال ہونے کی بنا پر قتل کیا، خلیفہ سلیمان نے جب یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو عراق سے ہٹا کر سندھ کی امارت عطا کی تو امیر عراق صالح تیمی نے سابق امیر عراق یزید سکسکی سے ساز باز کرکے اپنے بھائی صالح کا انتقام حجاج کے بھائی محمد بن قاسم سے اس طرح لیا کہ یزید بن ابی کبشہ نے سندھ آتے ہی ان کو گرفتار کرکے یزید بن مہلب دوسرے امیر عراق کے بھائی معاویہ بن مہلب کی نگرانی میں صالح کے پاس عراق بھیجدیا، اس نے واسط کے قیدخانہ میں بند کر دیا، جہاں محمد بن قاسم کے خاندان کے کئی افراد انتقامی جذبہ کا شکار ہو کر شدائد و مصائب برداشت کر رہے تھے، محمد بن قاسم اور دوسرے آل ابی عقیل نے اسی حال میں جان دی،

بلاذری نے لکھا ہے :-

ومات الولید بن عبد الملک	جب ولید کے مرنے پر سلیمان خلیفہ ہوا تو
وولی سلیمان بن عبد الملک	اس نے عراق کے صیغۂ مالیات کا امیر
فاستعمل صالح بن عبد الرحمٰن	صالح بن عبد الرحمٰن کو بنایا، اور یزید بن
علی خراج العراق، وولی یزید بن	ابو کبشہ سکسکی کو سندھ کی امارت دی، یزید

لے معارف ص ۱۵۱ و ۱۵۸

ابی کبشۃ السکسکی السندی، فحمل	ابوکبشہ نے محمد بن قاسم کو قید کرکے معاویہ بن مہلب کی نگرانی
محمد بن القاسم مقیداً مع	میں عراق بھیجا، اور صالح بن عبدالرحمٰن نے انکو واسط
معاویۃ بن المهلب، فحبسہ	میں قید کرکے خاندان ابوعقیل کے دوسرے
صالح بواسط فعذبہ صالح	افراد کے ساتھ سخت اذیت دی،
فی رجال من آل ابی عقیل	یہانتک کہ ان سب کو مار ڈالا، حجاج
حتی قتلهم وکان الحجاج قتل	نے صالح کے بھائی آدم کو خوارج
آدم اخا صالح وکان یری رأی الخوارج[1]	کا ہمخیال ہونے کے جرم میں قتل کیا تھا،

محمد بن قاسم نے بڑی بہادری اور صبر و استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دی، جس وقت انکو سندھ میں گرفتار کیا گیا تو انھوں نے اس ناقدری پر یہ شعر پڑھا،

اضاعونی، وایُّ فتی اضاعوا لیوم کریھۃ وسداد ثغر

(لوگوں نے مجھے ضائع کرکے ایسے بہادر کو ضائع کیا جو لڑائی کے دن اور سرحد کی حفاظت کے موقع پر کام آتا)

اور واسط کے قید خانہ میں یہ دو اشعار کہے

فلئن ثویتُ بواسط وبارضها رهن الحدید مکبّلاً مغلولا

(اگر میں آج واسط میں لوہے کی زنجیروں میں ڈوبا ہوا ہوں اور بیڑیوں سے میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں تو کوئی غم نہیں)

فلربُّ فتیۃٍ فارس قد رعتها ولربّ قرن قد ترکت قتیلا

کیونکہ میں نے فارس میں بہت سے مردوں کو لرزہ براندام کیا ہے اور کتنے ہی بہادروں کو قتل کرکے چھوڑ دیا ہے،

اسی زمانہ میں یہ شعر بھی کہے تھے:۔

لوکنتُ جمعت القرار لوطئت اناثٌ اعدت للوغی وذکور

اگر میں زندہ رہتا تو سکون و قرار کی ایسی فضا قائم کر دیتا کہ میدان جنگ میں مرد اپنی بیبیوں کے ساتھ عیش کرتے،

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۴۲

ومادخلت خیل السکاسک ارضنا ولا کان من عک علی امیر

آج یزید سکسکی نے مجھے قید کیا ہے حالانکہ ہمارے وطن تک میں انکے شہسوار داخل تک نہیں ہو سکے تھے اور قبیلہ عک میں سے کسی نے ہم پر حکومت و امارت کی تھی۔

ولا کنت للعبد المزدنی[1] تابعا فیالک دھر بالکرام عثود[2]

اور مروان ازدی مجھے اپنے ساتھ لایا ہے حالانکہ میں کبھی کسی بحرینی غلام کے تابع نہیں ہوا، ہائے زمانہ! شرفاء کے ساتھ ہ تیری کیا ٹھوکریں!

ادھر واسط میں محمد بن قاسم قید و سلاسل میں اسیر تھے۔ اُدھر سندھ میں ان کے غم میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی، اور ... محمد بن قاسم کی تصویر بنا کر اپنی عقیدت و محبت کا نذرانہ پیش کر رہے تھے، علامہ بلاذری کا بیان ہے،

فبکی اھل الھند علی محمد، وصوّ | ہندوستان کے باشندے محمد بن قاسم پر بہت روئے
بالکیرج | اور انھوں نے کیرج میں انکی تصویر بنائی،

اس صاف و صحیح روایت کے مقابلہ میں یعقوبی، ابن حزم اور صاحب چچ نامہ نے اور ہی باتیں بیان کی ہیں، یعقوبی نے تو سرے سے یزید بن ابو کبشہ سکسکی کی ... امارت کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے حالانکہ وہ سندھ کا والی ہو کر آیا اور چند ہی دنوں کے بعد مرگیا، اور اسی اثنا میں محمد بن قاسم گرفتار کر کے بغداد بھیجدیا، اس کے بعد سلیمان نے حبیب بن مہلب کو یہاں کی امارت پر مقرر کیا، جو عراق کے امیر حرب یزید بن مہلب کا دوسرا بھائی تھا، یعقوبی نے لکھا ہے کہ حبیب بن مہلب نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے اور ٹاٹ کا لباس پہنا کر قید کیا، انکی موت کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی

[1] ایران والے قدیم زمانہ میں بحرین کو مزدن کہتے تھے، اور بنو ازد پہلے بحرین اور عمان کے درمیانی مقام دبا میں رہتے تھے، جو موجودہ دُبی کے آس پاس تھا۔ [2] فتوح البلدان ص ۴۲۸

فوجه سليمان حبيب بن المهلب	خلیفہ سلیمان نے حبیب بن مهلب کو
اليها فدخل البلاد، وقاتل	سندھ بھیجا، اس نے یہاں آکر دریائے سندھ
قوما كانوا ناحية مهران، واخذ	کے کنارے پر رہنے والوں سے جنگ کی
محمد بن قاسم فالبسه المسوح	اور محمد بن قاسم کو پکڑ کر ٹاٹ پہنایا، اور
وقيده وحبسه[1]	گرفتار کر کے جیل خانہ میں ڈال دیا،

اس میں نہ عراق بھیجنے کا ذکر ہے اور نہ صالح بن عبد الرحمٰن اور واسط کے قید خانہ کا کوئی بیان ہے،

علامہ ابن حزم نے ان دونوں باتوں سے الگ بات کہی ہے:

وقتل نفسه في عذاب	محمد بن قاسم نے یزید بن مهلب کی ایذا رسانی
يزيد بن المهلب[2]	میں خودکشی کر لی،

مگر ان میں سے کوئی بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، یہ واقعہ ہے کہ یزید بن مهلب بھی اس وقت عراق کا امیر تھا، مگر اس کے اور حجاج یا محمد بن قاسم کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ یزید محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے خودکشی پر مجبور کرے، بلکہ یہ کام دوسرے امیر عراق صالح بن عبد الرحمٰن کا تھا، اسی کو حجاج سے شکایت تھی، البتہ محمد بن قاسم کو سندھ سے عراق لانے والا یزید بن مهلب کا بھائی معاویہ بن مهلب تھا، البتہ محمد بن قاسم کے صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم نے ۱۲۶ھ میں سندھ میں محمد بن عزان کلبی کے مصائب کے ڈر سے خودکشی کر لی تھی جس کا ذکر آگے آرہا ہے، ممکن ہے کہ امام ابن حزم کو باپ بیٹے کے معاملہ میں اشتباہ ہو گیا ہو،

محمد بن قاسم کی موت کے سلسلہ میں ان واقعاتی روایات کے ساتھ ساتھ ایک افسانوی روایت بھی ہے جو تقریباً چھ سو سال گذرنے کے بعد سندھ سے چلی ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں ہے

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۵۶ [2] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۰

اور بعد کے ہندی مورخوں نے اسے زیب داستان کے طور پر اپنی کتابوں میں درج کر دیا،
سب سے پہلے علی بن حامد کوفی اوشی نے چچ نامہ میں لکھا، اس کے بعد نظام الدین بخشی، میر معصوم بھکری
اور میر شیر علی قانع تتوی وغیرہ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم
نے راجہ داہر کی دو لڑکیوں سریادیو، اور پرمل دیو کو خلیفہ ولید کے پاس بھیجا، ولید نے سریادیو
کو اپنے پاس بلایا، تو اس نے کہا کہ ہم خلیفہ کے قابل نہیں ہیں، محمد بن قاسم نے ہم پر دست درازی
کی ہے، یہ سنکر خلیفہ نے فوراً محمد بن قاسم کو حکم بھیجا کہ تم جس حال میں بھی ہو خط پاتے ہی اپنے کو کچی کھال
میں بند کرکے دربار خلافت میں حاضر ہو، ناچار اس حکم کی تعمیل کرنا پڑی اور جب ان کی لاش عراق
پہنچی تو سریادیو نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ اور دوسرے راجوں مہاراجوں کا بدلہ لے لیا، خلیفہ کو
عقل سے کام لینا چاہیے تھا، اور کسی بات کو محض سنکر فوراً فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا، محمد بن قاسم تو عفت
و عصمت میں ہمارے باپ اور بھائی کی طرح تھا، اس کی یہ باتیں سنکر خلیفہ نے ان دونوں کو دیوار
میں چنوا دیا[1]، اس بے بنیاد کہانی کو بعض مستشرقین نے بھی علم و تحقیق کے نام سے بڑے آب و رنگ
کے ساتھ پیش کیا ہے،

محمد بن قاسم کی عمر فارس کی امارت کے وقت ہفدہ سال کی تھی، اگر اس کو ۸۳ھ ہی مان لیا جائے
تو ان کی ولادت ۶۶ھ میں ہوئی ہوگی اور موت ۹۶ھ میں واقع ہوئی، اس حساب سے
ان کی عمر اس وقت کم و بیش تیس سال کی تھی،

نذرانۂ عقیدت | محمد بن قاسم کے محامد و مناقب میں حمزہ بن بیض حنفی اور بعض دوسرے شعرا
کے اشعار اوپر نقل کیے جا چکے ہیں، ایک اور ثقفی شاعر نے ان کی ہندوستان کی فتوحات
اور یہاں پر ان کی اسلامی خدمات کا اعتراف و اظہار ان اشعار میں کیا ہے:-

---

[1] چچ نامہ ص ۲۴۴ تا ۲۴۷

فتحت بلاد السند بعد صعوبة ومهابة لمحمد بن القاسم

بڑے سخت اور خطرناک حالات کے بعد سندھ کے شہر محمد بن قاسم کے ہاتھ پر فتح ہوئے،

ساس الامور سیاسةً ثقفیةً بشهامةٍ منهُ ورای حازم

انھوں نے بڑی جوانمردی، اصابت رائے، دوراندیشی اور ثقفی سیاست سے تمام انتظام درست کئے

اذن الامیر له غداة وداعه کان الامیر مودبا فی العالم

امیر حجاج نے انکو ہندوستان رخصت کرتے وقت جملہ معاملات میں مختار بنادیا تھا، اور امیر دنیا میں بااصول مربی و مودب ہے

ما غاب عنه من الامور رزانةً فیه الیقین له عیان العالم

فہم وفراست کی وجہ سے کوئی ایسی بات اس سے پوشیدہ نہیں رہتی ہے جس پر ارباب بصیرت یقین رکھتے ہیں۔

برمحه نصر الالٰه محمد وبسیفه قامت نساء المأتم

محمد بن قاسم نے اپنے نیزے سے اللہ کے دین کی مدد کی ہے اور اپنی تلوار سے دشمن کی عورتوں میں صف ماتم بچھادی ہے

وبکیده سارت بهامة داهر دُهم البغال الی اغر قماقم[1]

اور انہی کی جنگی تدبیر سے غبار آلود قافلہ والے راجہ داہر کے سر کو خلیفہ کے روشن چہرہ کے سامنے لے گئے۔

مشہور اموی شاعر جریر نے ایک قصیدہ میں خلیفہ کی مدح کی ہے، جس کے دو اشعار میں محمد بن قاسم کی ہندوستانی فتوحات اور ان کے مناقب و محامد کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وارض هرقل قد قهرت وداهر ویسعی لکم من آل کسری النواصف

تونے ہرقل شاہ روم اور راجہ داہر کی سرزمین کو مغلوب کیا اور تیری خدمت کیلئے کسرائی خاندان کے غلام دوڑتے ہیں

ودانت الیك الهند مافی حصونها ومن ارض صینستان جبی الطرا

ہندوستان کے قلعہ جات میں جو کچھ تھا، تجھ کو دیدیا اور سرزمین چین سے تیرے پاس عمدہ عمدہ سامان لائے جاتے ہیں

---

[1] چچ نامہ ص ۵۸، [2] کتاب المعرب جوالیقی، مخطوطہ ص ۳۲

عمرو بن محمد بن قاسم ثقفی

محمد بن قاسم جیسے عظیم فاتح کو اموی دور کی سیاست و رقابت نے اس طرح کھو دیا کہ اسلامی تاریخوں میں ان کا اور ان کے کارناموں کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ ایسی حالت میں ان کے متعلقین اور اولاد کے حالات کہاں سے مل سکتے ہیں، مگر یہ غنیمت ہے کہ ان کے ایک صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم ثقفی کے مختصر حالات تاریخ میں مل جاتے ہیں، ان کی امارت و فتوحات کا سب سے زیادہ تذکرہ یعقوبی نے کیا ہے، بلاذری نے اختصار سے کام لیا ہے، اور طبری نے صرف ان کی گرفتاری اور موت کو بیان کیا ہے، تعجب ہے کہ چچ نامہ میں جو سندھ میں محمد بن قاسم کی فتوحات کی سب سے بڑی تاریخ ہے، ان صاحبزادے کا نام تک نہیں ہے تو دوسرے حالات کا کیا ذکر۔

حکم بن عوانہ کلبی کی نیابت میں سندھ میں فتوحات و خدمات

محمد بن قاسم کی موت کے نو دس سال بعد ۱۰۵ھ میں عمرو بن محمد بن قاسم کی شخصیت سندھ میں ایک کامیاب فاتح و مجاہد کی شکل میں نظر آتی ہے، حالانکہ اس حادثہ کے بعد سندھ میں اموی امراء و عمال برابر آتے رہے، اور جنگی سرگرمی دکھاتے رہے، خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کے زمانہ میں یزید بن ابی کبشہ سکسکی کے بعد حبیب بن مہلب، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور میں عمرو بن مسلم باہلی، یزید بن عبد الملک کے عہد میں ہلال بن احوز مازنی، اور خلیفہ ہشام بن عبد الملک کی خلافت میں جنید بن عبد الرحمٰن مری اور تمیم بن زید قینی سندھ کے والی رہے، مگر ان میں سے کسی دور میں عمرو بن محمد بن قاسم کا نام نہیں ملتا، یہاں تک کہ ہشام نے والی عراق خالد بن عبد اللہ قسری کے مشورہ سے ۱۱۰ھ یا ۱۱۱ھ میں حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کی امارت پر مامور کیا، اس کی جوہر شناس نگاہ نے عمرو بن محمد بن قاسم کو ڈھونڈ کر نکالا اور اپنے دور امارت کو ان کے فاتحانہ کارناموں سے روشن کیا اور عمرو نے اپنی انتظامی قابلیت [سے] باپ کے مفتوحہ علاقوں کو امن و امان کا گہوارہ بنایا، اور حکم کی امارت میں خود اس کے امیر بن گئے

[بلاذ]ری نے لکھا ہے کہ تمیم بن زید قینی کے انتقال کے بعد خلیفہ ہشام نے حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کا

حاکم بنایا، انھوں نے یہاں کے بگڑے ہوئے حالات کو درست کیا اور مسلمانوں کے لئے محفوظ نام کا ایک الگ شہر بسایا، اس کے بعد لکھا ہے کہ

وکان عمرو بن محمد بن القاسم	عمرو بن محمد بن قاسم الحکم بن عوانہ کے ساتھ ساتھ
مع الحکم وکان یفوض الیہ	تھے، وہ عمرو بن محمد بن قاسم کو امارت و فتوحات
ویقلدہ جسیم امورہ واعمالہ	کے اہم امور و معاملات سپرد کرتے تھے، چنانچہ
فاغزاہ من المحفوظة فلما	انکو محفوظہ سے جہاد کے لیے روانہ کیا اور جب
قدم علیہ وظفر امرہ ان یبنی	وہ جہاد سے مظفر و منصور واپس ہوئے تو
دون البحیرة مدینة وسماها	حکم دیا کہ سمندر سے تھوڑے فاصلہ پر ایک شہر
المنصورة فهی التی ینزلها	آباد کریں، حکم نے اسکا نام منصورہ رکھا جو
العمال الیوم[1]	ان دنوں (۲۵۵ھ) امرا و عمال کا دارالامارت

یعقوبی کا بیان ہے کہ حکم بن عوانہ نے ہندوستان کے علاقوں کو متغلبین سے آزاد کرایا اور محفوظ کو آباد کرکے مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ بنایا، اور متعدد خونریز لڑائیوں کے بعد پورے ملک میں سکون و اطمینان کی فضا قائم کی، ان تمام کاموں میں عمرو بن محمد اور اعیان و اشراف کی جماعت حکم کی معاون و مددگار رہی،

وکان مع الحکم عمرو بن محمد	حکم کے ساتھ عمرو بن محمد بن قاسم
بن القاسم الثقفی وجماعة	اور دوسرے معززین کی ایک
من وجوہ الناس[2]	جماعت تھی۔

اس طرح عمرو بن محمد بن قاسم حکم کی امارت میں ۱۰۵ھ یا ۱۰۶ھ سے ۱۲۰ھ تک

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۱ [2] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۸۰

ان کے ساتھ رہے، سنہ ۱۲۰ھ میں خلیفہ ہشام نے خالد قسری اور اس کے ماتحت امرا وحکام کا احتساب اور ان کی تادیب کے لیے یوسف بن عمر ثقفی کو عراق کا حاکم بنا کر بھیجا، اس نے عراق پہنچکر خالد قسری اور اس کے نائب امیر بلال بن بردہ پر اتنی سختی کی کہ دونوں ہلاک ہوگئے۔ حکم بن عوانہ خالد قسری کے منشورہ سے اور اسی کی نیابت میں سندھ کے امیر وحاکم تھے، اس لیے جب اس کو ان واقعات کی خبر ملی تو یہ کہکر دشمن کے دور دراز علاقہ میں جہاد کے لیے نکل گئے کہ یا تو ایسی فتح حاصل کروں گا جس سے یوسف خوش ہوجائے یا شہادت پاؤں گا جو سکون دیدیگی، اور اسی جہاد میں سنہ ۱۲۲ھ میں شہید ہوگئے، حکم کی جنگی سرگرمی سنہ ۱۲۰ھ سے سنہ ۱۲۲ھ تک تقریباً دو سال رہی، اس مدت میں عمرو بن محمد بن قاسم حکم کے نائب کی حیثیت سے سوار فوج کے امیر رہے،

وکان استخلف علی الخیل عمرو بن محمد بن القاسم الثقفی[1]

اس مدت میں حکم نے عمرو کو سوار فوج پر اپنا نائب مقرر کیا تھا،

ان دونوں مورخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۰۵ھ یا سنہ ۱۰۶ھ سے سنہ ۱۲۰ھ تک عمرو بن محمد بن قاسم امیر سندھ حکم بن عوانہ کلبی کے ساتھ جملہ امور و معاملات میں برابر شریک رہے اور ملکی و جنگی مہمات سر کیں، بلاذری کی روایت کے مطابق اسی دور میں عمرو نے منصورہ شہر آباد کیا جو حاکم اعلیٰ حکم کے کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح کم و بیش پندرہ سال تک عمرو نے ایک امیر اعلیٰ کے نائب کی حیثیت سے ہندوستان میں خدمات انجام دیں، پھر سنہ ۱۲۰ھ سے سنہ ۱۲۲ھ تک اپنے امیر کی طرف سے گویا مستقل امیر و حاکم رہے،

سندھ کی مستقل امارت وحکومت اور فتوحات و خدمات

حکم بن عوانہ نے اپنی امارت کی ابتدا سے لیکر شہادت کے دن تک عمرو بن محمد بن قاسم کو سیاہ و سپید کا مالک بنائے رکھا، اور جب

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۸۸ و ۳۸۹

جہاد کے ارادے سے نکلے تو عمرو ہی کو اپنا جانشین اور نائب بنایا، مگر ۱۲۲ھ میں حکم کی شہادت کے بعد عمرو کے مقابلہ میں جانشینی کے لیے یزید بن عرار نامی ایک شخص کھڑا ہو گیا، جس کا پہلے سے کوئی نام و نشان نہیں ملتا، اور عمرو اور یزید میں جانشینی کے لیے سخت کشمکش ہوئی، مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، آخر اس بارے میں یوسف بن عمر ثقفی والی عراق کو لکھا گیا، اس نے معاملہ کی نزاکت دیکھتے ہوئے خلیفہ ہشام کی طرف رجوع کیا، ہشام نے کہا کہ اگر عمرو بن محمد بن قاسم کی عمر میں کہولت (پختگی) کو پہنچ چکی ہو تو ان ہی کو سندھ کا امیر بناؤ، چنانچہ یوسف بن عمر نے ثقیف کی طرفداری میں عمرو کو سندھ کی امارت پر مامور کر دیا، حالانکہ وہ ابھی اس عمر کو نہیں پہنچے تھے، عمرو کو جیسے ہی امارت کا پروانہ ملا، یزید بن عرار کو گرفتار کر کے قید کر دیا،

یعقوبی کے بیان کے مطابق عمرو بن محمد بن قاسم نے اس کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سمندر سے تھوڑے فاصلہ پر شہر منصورہ آباد کر کے اس کو امراء و حکام کا مستقر بنایا، اور یہاں سے غزوات و فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، اور دشمنوں کو شکست دی، مگر شکست خوردہ دشمنوں کی ایک جمعیت نے اپنے ایک آدمی کو راجہ بنا کر اس کی قیادت میں منصورہ کو گھیر لیا، یہ حملہ بہت سخت اور منظم تھا، اس لیے عمرو نے عراق کے گورنر اور اپنے افسر اعلیٰ یوسف بن عمر کو صورت حال سے آگاہ کیا، اس نے عراق سے چار ہزار تازہ دم فوج روانہ کی، دونوں میں سخت مقابلہ ہوا، راجہ شکست کھا کر بھاگ نکلا، عمرو نے معن بن زائدہ شیبانی کو مقدمۃ الجیش کا امیر بنا کر راجہ کا تعاقب کیا، آگے بڑھ کر سامنا ہو گیا، دونوں میں مقابلہ ہوا، راجہ زخمی ہو کر گر گیا، اس کی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ نکلی، اس کے چند آدمی راجہ کو نیم مردہ حالت میں اٹھا لے گئے، اس معرکہ کے بعد سندھ کا پورا علاقہ زیر نگیں ہو گیا اور یہاں کے تمام راجہ مطیع ہو گئے،

جس زمانہ میں اسلامی فوج دشمن سے نبرد آزما تھی اور عمرو بن محمد کی توجہ تمام تر غزوات و فتوحات

پر تھی، یزید بن مہلب کے لڑکے مروان بن یزید نے عمرو کے خلاف صف آرائی کر دی، امرائے فوج کی ایک جماعت بھی اس کے ساتھ ہوگئی، اس نے عمرو کی فوج کا سامان اور جانوروں کو لوٹ لیا، مگر عمرو بن محمد نے معن بن زائدہ شیبانی اور عطیہ بن عبدالرحمٰن کی مدد سے مروان کو شکست دیدی جب مروان اور اسکی فوجیں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگیں تو عمرو بن محمد نے اعلان کر دیا کہ ابن مہلب کے علاوہ تمام فوجیوں کے لیے امن ہے، اس اعلان پر فوج نے مروان کا پتہ بتا دیا اور عمرو نے اسے پکڑ کر قتل کر دیا[1]

عمرو بن محمد بن قاسم نے ۱۲۲ھ سے ۱۲۵ھ تک سندھ میں نہایت کامیاب حکومت کی، یعقوبی کی تصریح کے مطابق منصورہ کو اسی دور میں آباد کیا، سندھ کے راجہ رائے کو شکست دی، اور بہت سی فتوحات حاصل کیں، مروان بن یزید بن مہلب کی بغاوت کو ختم کیا، ۱۲۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کے بعد جب ولید بن یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس نے عمرو بن محمد بن قاسم کو سندھ سے معزول کر کے یزید بن عرار کو جسے عمرو نے قید کر دیا تھا، سندھ کی امارت وحکومت پر مامور کیا، اس طرح یزید بن عرار کی دیرینہ تمنا پوری ہوگئی، مگر انھوں نے بڑی شرافت کا ثبوت دیا اور عمرو بن محمد بن قاسم سے کوئی تعرض نہیں کیا، حالانکہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ ان سے انتقام لے سکتے تھے، یزید بن عرار نے اپنی تمام توجہ ملکی فتوحات اور انتظامات کیجانب رکھی، اور بقول یعقوبی انھوں نے ہندوستان میں آٹھ غزوات کیے اور ان سب میں کامیابی حاصل کی اور وہ بے ضرر آدمی تھے،[2]

موت ۱۲۶ھ | ۱۳-۱۴ مہینے حکومت کرنے کے بعد ولید کا انتقال ہوگیا، اور ۱۲۶ھ میں یزید بن ولید ابن عبدالملک خلیفہ ہوا، اس نے یوسف بن عمر ثقفی کی جگہ منصور بن جمہور کلبی کو عراق کا امیر مقرر کیا، یوسف یہ خبر سنتے ہی شام کی طرف بھاگ گیا، منصور بن جمہور کلبی نے عراق کی گورنری سنبھالتے ہی

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۰۸، ۳۰۹ [2] ایضاً ج ۲ ص ۴۰۰

یزید بن عرار کو سندھ سے معزول کر کے محمد بن غزان کلبی کو سندھ اور سجستان کا امیر مقرر کیا، اس پوری مدت میں عمرو بن محمد بن قاسم معزولی کے بعد سندھ ہی میں رہے، محمد بن غزان کلبی کو عمرو بن محمد بن قاسم نے اپنی ولایت و امارت کے زمانہ میں ایک معاملہ میں بڑی تکلیف دی تھی، اسلیے انتقام کے لیے وہ وقت کا منتظر تھا، چنانچہ اس نے عمرو کو گرفتار کر کے قید کر دیا، اس نے مزید ذلت اور تکلیفوں سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی،

طبری نے ۱۲۶ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ عمرو بن محمد بن قاسم نے سندھ کی امارت کے زمانہ میں محمد بن غزان کلبی کو گرفتار کر کے مارا تھا، اور والیٔ عراق یوسف بن عمر کے پاس بھیجدیا تھا، اس نے محمد بن غزان کو سزا دی اور ایک بھاری رقم بطور جرمانہ کے اس پر عائد کی، اور حکم دیا کہ ہر جمعہ کو وہ اس رقم کی ایک قسط ادا کرتا رہے جس جمعہ کو قسط ادا نہ کر سکے، اسکو پچیس درّے رسید کیے جائیں، محمد بن غزان کلبی قسط وار رقم ادا نہ کر سکا اسلیے اسکو درّے لگائے گئے، جس کے صدمہ سے اس کی انگلیاں اور ہاتھ سوکھ گئے تھے، اس لیے ۱۲۶ھ میں جب محمد بن غزان سندھ اور سجستان کا حاکم مقرر ہوا تو سجستان میں یزید بن ولید کی خلافت کی بیعت لینے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ عمرو بن محمد بن قاسم کو قید کر کے پولیس کا پہرہ لگا دیا، عمرو بن محمد بن قاسم کو اپنی قید کا انجام معلوم تھا، اس سے بچنے کے لیے موقع پاکر ایک سپاہی لیکر اس سے خودکشی کرنے کی کوشش کی، یہ حال دیکھکر لوگوں نے شور مچایا، محمد بن غزان نے باہر آکر یہ صورت دیکھی تو عمرو بن محمد بن قاسم سے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ عمرو نے جواب دیا تمھاری سزا کے خوف سے، محمد بن غزان نے کہا میں تم کو کتنی ہی سزا دیتا مگر وہ کام نہ کرتا جسے تم نے خود کیا ہے، اس حادثہ کے تیسرے دن تلوار کے زخم کے صدمہ سے عمرو بن محمد بن قاسم کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد محمد بن غزان نے سندھ میں بھی یزید بن ولید کی خلافت کی بیعت لی، [1]

---

[1] تاریخ طبری ج ۵ ص ۲۶۲

مراجع :- اس مقالہ میں ذیل کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے :-
(۱) انساب الاشراف، بلاذری، طبع یروشلم (۲) البدایہ والنہایہ، ابن کثیر، طبع مصر (۳) تاریخ الملوک والامم طبری، دار المعارف مصر (۴) تاریخ یعقوبی، طبع لیڈن، (۵) چچ نامہ، حامد بن علی کوفی اوشی، مطبع لطیفی دہلی (۶) جمہرۃ انساب العرب، ابن حزم، دار المعارف مصر، (۷) کتاب الذخائر والتحف، قاضی رشید بن زبیر، طبع کویت (۸) طبقات ابن سعد، طبع بیروت، (۹) العبر فی خبر من غبر، ذہبی، طبع کویت (۱۰) فتوح البلدان، بلاذری، طبع مصر (۱۱) کتاب الفہرست، ابن ندیم، طبع مصر (۱۲) کتاب المحبر محمد بن حبیب بغدادی، طبع حیدرآباد (۱۳) معجم البلدان، یاقوت حموی، طبع مصر (۱۴) کتاب المعارف، ابن قتیبہ، طبع مصر (۱۵) کتاب المغرب، جوالیقی، قلمی،

پاکستان سے اپیل

دار المصنفین کے خدمت گذاروں کو اس کا بڑا دکھ ہے کہ پاکستان کے بعض خود غرض ناشرین اس کی بعض مطبوعات کو اپنے لیے چھاپکر اس کو بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں، ادارہ نے ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور مغربی پاکستان کے گورنر اور پاکستان کے صدر کی توجہ اس طرف دلائی ہے، پاکستان میں دار المصنفین کے ہمدردوں سے بھی اپیل ہے کہ وہ اپنے اخلاقی دباؤ سے ایسے خود غرض ناشرین کو اس ادارہ کو نقصان پہنچانے سے باز رکھیں ورنہ علم و فن کا یہ دیرینہ ادارہ ختم ہو جائیگا اور اس کا خون پاکستان کے سر رہے گا۔

منیجر

ٹونک کے تاریخی مخطوطات

از جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب ایم اے ناظم ادارۂ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک

(۲)

طبقاتِ شاہجہانی۔ مصنفہ محمد صادق، اس میں ۸۷۸ مشاہیر علماء و فضلاء، اکابر شعراء ادباء، مصنفین اور صوفیائے کرام کا بیش بہا تذکرہ ہے جس میں سوانحی اور تاریخی حالات کے علاوہ سلوک، تصوف اور تہذیب و ثقافت کی جلوہ نمائیاں بھی ہیں، یہ گرانمایہ تذکرہ دس طبقات پر مشتمل ہے، ان طبقات میں تیمور اور اس کے جانشینوں کے دور کے تمام مشاہیر ارباب علم و فضل کے حالات اور ان کے کارہائے نمایاں اور خدمات کا تذکرہ ملتا ہے، طبقات مندرجہ ذیل ادوار پر مشتمل ہیں :-

(۱) تیمور ۷۷۱ھ - ۸۰۷ھ مطابق ۱۳۶۹ء - ۱۴۰۵ء (۲) میران شاہ و شاہ رخ ۸۰۷ھ - ۸۵۰ھ مطابق ۱۴۰۵-۴۷ء (۳) میرزا سلطان محمد اور الغ بیگ ۸۵۰ھ - ۸۵۳ھ مطابق ۱۴۴۷-۴۹ء (۴) ابو سعید ۸۵۵-۷۳ھ مطابق ۱۴۵۰-۶۹ء (۵) عمر شیخ ۸۷۳-۹۹ھ مطابق ۱۴۶۹-۹۳ء (۶) بابر ۸۹۹-۹۳۷ھ مطابق ۱۴۹۵-۱۵۳۰ء (۷) ہمایوں ۹۳۷-۶۳ھ مطابق ۱۵۳۱-۵۶ء (۸) اکبر ۹۶۳-۱۰۱۴ھ مطابق ۱۵۵۶-۱۶۰۵ء (۹) جہانگیر ۱۰۱۴-۳۷ھ مطابق ۱۶۰۵-۲۷ء (۱۰) شاہجہاں ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء سے ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء تک سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء مکمل ہوا، کیونکہ اسکے

بعد کے حالات نہیں ہیں، یا اس کے بعد مصنف کا انتقال ہوگیا[۱] ایسے موانع پیش آئے جس سے مصنف آگے نہیں لکھ سکا، ایتھ کے نزدیک ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۷ء کے قریب یہ مخطوطہ ترتیب دیا گیا ہوگا۔[۱] اس کے ۱۲ سال بعد تک شاہجہاں سریر آرائے سلطنت رہا، شاہجہاں کا دور ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک ہے، اور اس مخطوطے میں صرف ابتدائی دس سال کا حال ملتا ہے۔

اگر سنہ تصنیف ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء مان بھی لیا جائے تو سنہ کتابت کا پتہ نہیں ملتا لیکن شان خط، کاغذ کی ساخت اور طلائی تزئین دور شاہجہانی کی نشاندہی کرتی ہیں، میری حقیر رائے میں یہ نسخہ شاہجہانی دور کا نوشتہ ہونا چاہیے، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی ناظم محکمۂ آثار قدیمہ ہند (شعبۂ عربی و فارسی) نے نسخۂ ہذا کو دیکھکر یہ رائے قائم کی ہے کہ "بہت آسانی سے اس نسخہ کی کتابت گیارہویں صدی ہجری میں منسوب کیجا سکتی ہے، حالانکہ یہ شاہجہانی دور کا بھی مکتوبہ کہا جا سکتا ہے"۔

اسٹوری نے اپنی کتاب "تاریخ ادب فارسی" History of Persian Litra Ture میں لکھا ہے کہ طبقات شاہجہانی کا مصنف محمد صادق نے اپنے بھائی ملا محمد یوسف کاشمیری (۱۰۴۳ھ م ۱۶۳۳ء) کو عہد جہانگیری کے شعراء میں شامل کیا ہے، جو محمد صادق ہمدانی مصنف کلمات الصادقین بعینہ مشابہ ہے، محمد صادق ہمدانی کو تاریخ محمدی میں مولانا صادق کاشمیری کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔[۲]

طبقات شاہجہانی سے اخذ کرتے ہوئے ریو نے لکھا ہے کہ محمد صادق تقریباً ۱۰۰۰ھ مطابق ۱۵۹۱-۲ء

---

1. Catalogue of Persian N/85 in The Library of The India office Vol: I by Hermaun Eth M.A. Phil P.P. 705
2. P. 976 a. Kalimatus-Sadikin. one of anthoritias quoted in Tarikhe Muhummadi fol. 46 where it is ascribed to maulana Sadik Kashmiri, probably The author of The Tabate shahjahani. (1039)

ں پیدا ہوئے اور دہلی میں رہے، یہیں وہ ملا کامی (متوفی ۱۰۱۶ھ) اور شیخ حسین کامگار (متوفی ۱۰۱۸ھ) سے ملے اور شاہ عبدالحق دہلوی کے شاگرد ہوئے[1]، مصنف طبقات نے یہ بھی ایا ہے کہ ان کے نانا حاجی محمد ہمدانی ملتان گئے، پھر دہلی میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی اور یہیں ۱۰۰۵ھ مطابق ۱۵۹۷ء میں انتقال کیا۔ اپنے ایک اور تذکرہ سلسلۃ الصادقین کا بھی حوالہ یا ہے اور مآثر جہانگیری لکھنے کا بھی ارادہ ظاہر کیا ہے[2]۔

طبقات شاہجہانی:- یہ نہایت نادر نسخہ ہے جو اب تک معلوم کیا جا سکا ہے اور غیر مطبوعہ ہے، ں کے دوسرے نسخے بہت کمیاب ہیں، میرے علم میں اس نسخہ کی چار نقلیں مختلف کتب خانوں ں محفوظ ہیں، ایک آصفیہ کتب خانہ میں ہے[3]، دوسری انڈیا آفس کتب خانہ میں[4]، تیسری ٹش میوزیم میں[5]، اور چوتھی ٹونک میں[6]، نسخہ زیر بحث بلحاظ قدامت خطاطی اور تاریخی د نہایت اہم اور نادر ہے، اب تک اس پر کام نہیں کیا گیا ہے، اس لیے میں نے اسکو ٹ کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور لندن سے اس کے عکسی نسخے منگوائے ہیں، اہل علم سے د ملتمس ہے کہ ان کو اس نسخہ کے بارے میں جو معلومات ہوں، راقم کو براہ کرم ان سے مطلع فرمائیں۔

خلاصۃ التواریخ:- اس کے مصنف منشی سجان رائے بھنڈاری ہیں، پٹیالہ میں پیدا ہوئے نسخہ کے مختلف ترقیموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زیادہ تر سرکاری عہدیداروں کے منشی رہے اور ایتھے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندی، سنسکرت میں بھی ماہر تھے، اور خطاطی، گری اور انشا پردازی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ریو کے مطابق خلاصۃ التواریخ کے

---

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ مرتبہ ریو ص ۱۰۰۹ [2] اسٹوری ص ۵۰۸ و ۱۱۷۱ [3] کتب خانہ آصفیہ ص ۲۴۶ ۲ نوشتہ ۱۱۵۱ھ سرکار [4] فہرست کتب خانہ انڈیا آفس ص ۳۶۳ نمبر ۵۰۸ [5] برٹش میوزیم نمبر ۱۰۰۱ جلد سوم [6] سعیدیہ کتب خانہ ٹونک فہرست فن تاریخ از محمد عمران خان ٹونکی۔

علاوہ خلاصۃ الانشاء بھی ان ہی کی تصنیف ہے، جو بہت نایاب ہے، اس کے کچھ اجزا برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں[1]۔

خلاصۃ التواریخ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے چالیسویں جلوس مطابق ۱۶۹۵ء میں بڑی کاوش اور محنت سے لکھی گئی، یہ ہندوستان کی مکمل تاریخ ہے، ابتدائے آفرینش سے عالمگیر تک کے حکمرانوں کے مختصر حالات اور تاریخی واقعات کے ساتھ اس عہد کی تمدنی اور معاشرتی جھلکیاں اور معاشی تبصرے بھی دلچسپ انداز میں ملتے ہیں، ادوار کی ترتیب کے ساتھ پورے ہندوستان کی تاریخ بڑے اچھے انداز میں اور بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے اختصار سے ضرور کام لیا گیا ہے لیکن ضروری اور اہم تاریخی اور سیاسی واقعات چھوٹنے نہیں پائے ہیں،

اس کے مختلف نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ایم ظفر حسن نے ۱۹۱۸ء میں اس کو ایڈٹ کیا ہے لیکن سیر المتاخرین کا مقدمہ بھی خلاصۃ التواریخ کے ایڈیشن سے منسوب کر دیا ہے[2]۔ ۱۹۰۱ء میں سر جادو ناتھ سرکار نے اس مخطوطے کے کچھ حصوں کا ترجمہ جو ۱۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، شائع کیا ہے، جو ظفر حسن کے ایڈیشن کے صفحہ ۲۸ سے صفحہ ۸۳ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے، اسی طرح ایلیٹ نے جلد ہشتم میں صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۲ تک اس کتاب کی ہلوگر (تاریخی تبصرہ) لکھی ہے۔ بیوریج نے بھی چند اوراق میں اس مخطوطے پر تبصرہ کیا ہے[3]، جہاں تک میرے علم میں ہے، ان کے علاوہ ابھی تک کسی نے نہ اس پر کام کیا ہے اور نہ انگریزی ترجمہ کیا۔ البتہ میر شیر علی افسوس نے "آرائش محفل" کے نام سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، جو طبع ہو چکا ہے۔ یہ اہم کتاب اپنی نوعیت کی ایک بیش بہا تاریخ ہے، جو گوناگوں دلچسپ معلومات پر مشتمل ہے۔

---

[1] استوری ج ۲ ص ۷۴ [2] ریو جلد اول ص ۲۳۰ Journal of Royal Asiatic Society 1894. PP 733-69 [3] ایضاً

ہمارے ذخیرہ کا نسخہ بارہویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے، کاغذ سفید بادامی کرم خوردہ اور خط شکست ہے، خط شکست کا رواج اکبر کے دور میں زیادہ تھا لیکن جہانگیر سے عالمگیر تک کم ہو گیا تھا، اور اس کی جگہ خط نستعلیق نے لے لی تھی، عالمگیر کے آخری عہد میں پھر خط شکست کا رواج زور پکڑ چلا تھا، اس لیے یہ نسخہ مغلیہ دور کے آخری زمانہ کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے، کاتب نے ترقیمے میں سنہ کتابت اور اپنا نام نہیں لکھا ہے،

تاریخ گزیدہ :- تاریخ گزیدہ مصنفہ حمد اللہ ابی بکر بن احمد بن نصر بن مستوفی قزوینی المتوفی ۷۵۰ھ، تاریخ اسلام پر ایک جامع اور بصیرت افروز کتاب ہے، جس میں ابتدائے آفرینش سے ۷۳۰ھ سال تالیف تک کے حالات و واقعات درج ہیں، کتاب چھ ابواب، ایک ابتدائیہ اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے، ابتدائیہ میں ابتدائے آفرینش سے بحث کی گئی ہے، باب اول میں انبیائے کرام کا تذکرہ ہے، باب دوم میں سلاطین قبل اسلام کے احوال ہیں، باب سوم میں حضور سرور کائنات کی ذات اقدس، خلفاء راشدین اور صحابہ اور تابعین کا تذکرہ اور بنو امیہ اور بنی عباس کے حالات ہیں، باب چہارم میں اسلامی دور کے سلاطین کو بارہ طبقات میں منقسم کرکے ان کے حالات ہیں، باب پنجم میں ائمہ، علماء اور مشائخ کا ذکر ہے، باب ششم قزوین کے حالات پر مشتمل ہے، جو سب سے مختصر ہے، اس کا ترجمہ مسٹر بائیسر ڈی بنارون نے ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں کیا ہے،[1] اس کتاب کے خاتمہ پر بطور تتمہ ایک باب ہے، جس میں اولیائے کرام اور سلاطین کے انساب کا بیان ہے،

تاریخ گزیدہ کا جو نسخہ ہمارے ادارے میں محفوظ ہے وہ باب پنجم کی فصل پنجم تک ہے، گویا اس میں ایک فصل کم ہے، اور باب ششم جو قزوین سے متعلق ہے اور خاتمہ اس میں نہیں ہے

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ، مرتبہ ریو جلد اول نمبر ۸۱

تاریخ کتابت اور کاتب کا نام اس نسخے میں مرقوم نہیں ہے لیکن رسم الخط اور قلم کی روش سے ظاہر ہو رہا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی کا نوشتہ ہے، اس لیے کہ اس کے زیادہ تر نسخے سولھویں صدی کے اواخر اور سترہویں صدی کے اوائل کے لکھے ہوئے ملتے ہیں، چنانچہ برٹش میوزیم میں ایک نسخہ ۱۵۱۸ء کا نوشتہ اور بقیہ تین نسخے سولھویں صدی عیسوی کے مکتوبہ ہیں[1]۔

حبیب السیر: حبیب السیر مصنفہ غیاث الدین بن ہمام الدین المدعو بخواند میر تاریخ کی ایک جامع کتاب ہے جو تین حصوں پر منقسم اور ہر حصہ چار اجزا پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں شیاطین و اجنہ کا، دوسرے میں انبیائے کرام اور متکلمین کا حال ہے، تیسرے میں حضور اکرمؐ کی حیات مقدسہ اور غزوات وغیرہ اور چوتھے جز میں خلفائے راشدین کے حالات ہیں، حبیب السیر تہران اور بمبئی سے شائع ہو چکی ہے، اس کے متعلق مورلے اور ایلیٹ نے بہت کچھ بحث کی ہے[2]، ہمارے ادارے میں [ریسرچ] کا جو نسخہ محفوظ ہے وہ ۱۰۶۴ھ کا نوشتہ ہے۔

خلاصۃ الاخبار: مصنفہ غیاث الدین بن ہمام الدین خواندمیر المتوفی ۹۴۲ھ، مصنف نے یہ کتاب ۹۰۵-۹۰۴ھ میں میر علی شیر وزیر سلطان حسین مرزا کے لیے تصنیف کی تھی، جو ایک مقدمہ، دس مقالات اور ایک تتمہ پر مشتمل ہے، پیش نظر نسخہ اس کا مکمل نسخہ ہے، اس کا ترجمہ میجر ڈیوڈ پرائس نے انگریزی میں کیا ہے، اس نسخہ پر مشہور فہرست نگاروں نے بحث کی ہے[3]۔ اس کے مقدمہ میں تخلیق و تکوین کائنات پر بحث ہے، پہلے مقالہ میں انبیائے کرام کا ذکر ہے، دوسرے میں یونانی حکما

---

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ مرتبہ ریو ج ۱ ص ۸۲۔ معارف: تاریخ گزیدہ کے ایک قدیم نسخہ مکتوبہ ۸۵۷ھ ملوکہ معتمد الدولہ حاجی فرہاد مرزا کا عکس اڈورڈ براؤن نے ۱۹۱۰ء میں گب میموریل سیریز کے سلسلہ میں لندن سے شائع کیا تھا، اور انگریزی میں اسکا مبسوط مقدمہ، کتاب کے مندرجہ اسمار و اماکن و قبائل اور کتابوں کا انڈکس ایک مستقل جلد میں شائع کیا۔ [2] انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ مرتبہ ایتھے ۱ ص ۸۲ [3] Elliot. P. 106 Bodleian cat. No 83 to 86 - History of India Vol IV P. 14 Rieu - i. P 96 Morley. P 38

کا حال ہے، تیسرا مقالہ شاہانِ عرب و عجم پر ہے، چوتھے مقالے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف ہے، پانچویں مقالہ میں خلفائے راشدین اور ائمہ کرام، چھٹے میں خلفاے بنو امیہ، ساتویں میں عباسی خلفاء اور آٹھویں میں ان کے مختلف خاندانوں کے حالات ہیں، نویں میں چنگیز خاں اور اس کی نسل، دسویں میں تیمور اور اس کے اسلاف کا حال ہے۔ اس کا تتمہ ہرات اور اس کے مشاہیر کے حالات پر مشتمل ہے[1]۔

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں ۱۰۲۷ھ کا مخطوطہ ہے۔ ہمارے یہاں کا نسخہ ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء کا مکتوبہ ہے، باقی کئی نسخے بارہویں صدی ہجری کے مکتوبہ ملتے ہیں۔

نگارستان :- مصنفہ ابن محمد احمد المعروف بہ قاضی احمد غفاری، تاریخ ایران پر ایک نایاب کتاب ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود سے دسویں صدی ہجری کے اوائل تک کے حالات پر مشتمل ہے، اس میں ایران کے مختلف حکمراں خاندانوں کے حالات، ان کے عہد کے واقعات اور مشہور داستانوں کو نظم میں لکھا گیا ہے، اور شاہ طہماسپ شاہ ایران کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۹۵۹ھ مطابق ۱۵۵۲ء ہے، تاریخی مادہ "نگارستان واقع" سے نکلتا ہے[2]، دنیا کے جن جن کتب خانوں میں اس کے نسخے محفوظ ہیں، اسٹوری نے ان کا حوالہ دیا ہے[3] اور کرافٹ کے کیٹلاگ میں اس پر تفصیلی بحث ہے[4]۔ مصنف نے اس کتاب کے علاوہ ایک اور کتاب الموسوم بہ جہاں آرا لکھی ہے، حرمین شریفین کی زیارت سے مراجعت میں دیبل سندھ میں ۹۷۵ھ میں انتقال کیا، نگارستان کے متعلق ریو کے کیٹلاگ کے علاوہ مورلے کے کیٹلاگ ایلیٹ کی ہسٹری جلد دوم ص ۵۰۴ اور پٹرس برگ کے کیٹلاگ میں خاصی تفصیل ملتی ہے۔ اسکا ترجمہ ترکی میں ہوا تھا جس کا مسودہ محفوظ اور اب تک طبع نہیں ہو سکا ہے[5]۔

---

[1] فہرست انڈیا آفس لائبریری ایتھے ۲۴ [2] ریو، جلد ۱ ص ۱۰۶ [3] پرشین لٹریچر از سی۔ اے۔ اسٹوری ص ۱۱۴ [4] کرافٹ کیٹلاگ ص ۸۰ تا ۹۰ اورنٹیل کالج میگزین ج ۲ شمارہ ۳ مئی ۱۹۲۶ء [5] برٹش میوزیم کیٹلاگ مرتبہ ریو ج ۱ ص ۱۰۶

بہجۃ العالم (فارسی):۔ مصنفہ حکیم بہارت خاں اصفہانی ہندوستان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے زمانہ تقریباً ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۴ء کی تصنیف ہے، اس میں تمام شہروں کے مختصر جغرافیائی حالات ہیں، کرمان، شوشتر، سیستان، قندھار، غزنی، لاہور، دہلی، آگرہ، اودھ بردشلم وغیرہ کے حالات کسی قدر تفصیلی ہیں، صوبجات ہند کا حال مرأت العالم سے ماخوذ ہے، یہ ایک قسم کی جغرافیہ آمیز تاریخ ہے، اسی میں ایک کتاب روضۃ الافراح مجلد ہے، جو عربی جغرافیہ کی کتابوں تحفۃ الاحباب اور خریدۃ العجائب سے ماخوذ اور اس کا ترجمہ ہے، یہ کتاب کئی حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ ذکر از بلاد متفرقہ، میں رومی ممالک کا حال ہے جو ہشت بہشت سے ماخوذ ہے، اسی کے ساتھ ہندوستان کا ذکر ہے، جو آئین اکبری سے ماخوذ ہے، اسی طرح مختلف صوبجات اور مشہور شہروں کے حالات انیس العارفین سے لیے گئے ہیں، دوسرا حصہ ذکر بعضے از عجائب جزائر جس میں عجائب و غرائب کا ذکر ہے، عجائب المخلوقات سے اخذ کیا گیا ہے، ہمارے ذخیرہ کے بہجۃ العالم اور روضۃ الافراح کے نسخے ایک ہی جلد میں مجلد ہیں، بہجۃ العالم کا نسخہ ۱۲۷۵ھ کا مکتوبہ ہے، کاتب کا نام غلام علی القرشی ہے، ابھی تک اس کے تراجم، طباعت و اشاعت کا پتہ نہیں چل سکا، قارئین کرام سے استدعا ہے کہ اس کے بارہ میں ان کو جو معلومات ہوں اس سے راقم کو آگاہ فرمائیں[1]۔

تحفۃ العالم (فارسی):۔ عبد اللطیف بن ابی طالب بن نور الدین بن نعمت اللہ الحسینی الموسمی الشوستری، مصنفہ ۱۲۱۵-۱۶ھ، اس کتاب میں مصنف نے اپنے ملک شوستر اور اسکے پرگنوں کے حالات کے علاوہ اپنے سوانح بھی بیان کیے ہیں، اور ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی ابتدا، قیام اور توسیع کی بھی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں، اور انگریزی طور و طریق، آداب مجالس

---

[1] انڈیا آفس کیٹلاگ جلد اول مرتبہ ایتھے صفحہ ۵۰۰

امریکہ اور یورپ کے مشہور شہروں کا بھی ذکر ہے، ہندوستان کی تاریخ، یہاں کی معاشرت اور دوسرے دلچسپ حالات نسبتاً زیادہ ہیں، اس طرح یہ کتاب تاریخ جغرافیہ اور معاشرت مختلف قسم کے معلومات پر مشتمل ہے، مصنف نے یہ کتاب اپنے ذی شان دوست میر عالم بہادر وزیر اعظم دولت نظامیہ دکن کے نام معنون کی ہے، آخر میں وہ حیدر آباد سے ایران واپس چلے گئے، تحفۃ العالم بمبئی ۱۲۶۳ھ میں چھپ چکی ہے، ہمارے کتب خانہ کا نسخہ ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء کا نوشتہ اور نہایت دیدہ زیب، مزین، مطلی اور مذہب ہے، کاغذ سفید لوح کتاب مطلی مینا کار آسمانی ہے، کاتب کا نام شیخ عبد اللہ عرف امیر الدین خلف عنایت اللہ ہے، ترقیمہ میں کاتب کا نام، سنہ کتابت اور مقام کتابت (سورت) لکھا ہوا ہے، آخر میں ایک مہر بھی ہے جو محو شدہ ہے،

تاریخ الخمیس فی احوال النفس النفیس (جلد دوم، عربی):۔ قاضی حسین بن محمد الدیار بکری المالکی متوفی ۹۶۶ھ کی مشہور تصنیف ہے، مصنف مکہ معظمہ کے جید عالم تھے، یہ نسخہ ایک مقدمہ تین ارکان اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ اور ارکان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، ہجرت اور دوسرے تاریخی حالات بیان کئے گئے ہیں، خاتمہ میں خلفائے راشدین اور اموی اور عباسی خلفاء کے حالات ہیں[1]، ہمارے [illegible] ان دونوں جلدیں محفوظ ہیں جو الگ الگ سنین کی مرقومہ ہیں، جلد اول ۱۰۹۰ھ ہجری کی نوشتہ ہے، اس کے کاتب کا نام علی بن سلمان بن ابراہیم ہے، اس جلد میں ۸ھ تک کے حالات ملتے ہیں، جلد دوم ۱۰۳۱ھ کی نوشتہ ہے، اس میں ۸ھ سے سلطان مراد ثالث تک کے حالات ہیں، اس جلد کے ترقیمہ میں کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا ہے، لیکن طرز کتابت، روشنائی قلم اور نشان خط سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دوسری جلد بھی

---

[1] انڈیا آفس کیٹلاگ جلد اول مرتبہ ایتھے صفحہ ۵۰۰

علی بن سلمان کے قلم کی ہے، یہ کتاب متعدد بار مصر وغیرہ سے چھپ چکی ہے۔

تاریخ چین (اردو) کا رکن مصنف جوہر اخلاق و مترجم عدالت دیوانی صدر کلکتہ کی مصنفہ ہے، مولانا محمد عمران خاں اس کتاب کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "یہ ممالک چین کی مکمل تاریخ ہے، جس میں طوفان نوح سے لیکر ۱۸۴۲ء تک کے حالات و واقعات قلمبند کیے گئے ہیں، یہ نسخہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں حدود مملکت چین، اس کے صوبہ جات اور انکے معاشرتی، تاریخی اور سیاسی حالات و واقعات ہیں، دوسری جلد میں حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر تمام شاہان خطا کا ذکر ہے اور ان ممالک و جزائر کا حال بھی ہے جو سلطنت خطا میں شامل یا اس کے خراج گذار رہتے، نسخہ ہذا کے ترقیمہ میں سنہ کتابت ۱۲۷۱ھ دیا ہوا ہے، لیکن کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا ہے، کاغذ سفید کرم خوردہ شکستہ۔ یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں کلکتہ میں اور ۱۸۶۵ء میں دار العلوم میرٹھ سے طبع ہو چکی ہے۔

تاریخ ہندوستان (فارسی): یہ تاریخ حقی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ سلطان معز الدین محمد بن سام سے لیکر اکبر اعظم تک کے حالات پر مشتمل ہے، مصنف مولوی عبد الحق نے مقدمہ میں اپنا تخلص حقی بتایا ہے، اس نسبت سے اس کتاب کا نام تاریخ حقی ہے، عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اور بختاور خاں نے مراۃ العالم میں حقی کے حالات لکھے ہیں، فاضل مورخ نے اس کتاب کی تصنیف میں اپنے ذاتی مشاہدات اور زبانی روایات دونوں سے کام لیا ہے آخر میں لکھا ہے کہ خاطر خواہ ماخذ اور ذرائع نہ ملنے کی وجہ سے دکن کی تاریخ ۱۹۳ء سے آگے نہیں لکھ سکے لیکن سندھ اور کشمیر کے رؤسا کے حالات تحریر کیے ہیں، اس شعر سے اسکا سنہ تالیف نکلتا ہے:

ناقص چو افتاد سال تاریخش را   از ذکر ملوک از دو ناقص کن

ذکر ملوک کے کل اعداد ۱۰۱۶ ہوتے ہیں، اس میں سے گیارہ نکالنے کے بعد ۱۰۰۵ باقی رہتے ہیں، یہی سنہ تالیف ہے[۱]، ہمارے یہاں کا نسخہ اخوند قائم الدین بن اخوند غلام حیدر مشہور خطاط کا نوشتہ ہے، ترقیمہ میں کاتب نے تاریخ کتابت نہیں لکھی ہے،

تاریخ مدینہ (فارسی): مصنف نامعلوم الاسم، اول اور آخر سے ناقص ہے، اور آخر کے کئی باب کم ہیں، اس میں سترہ باب ہیں، اور ہمارے یہاں کے نسخہ میں کل پانچ باب ہیں[۲]،

تبییض الصحیفہ فی مناقب الامام ابی حنیفہ } جلال الدین سیوطیؒ، کاتب نے تاریخ کتابت اور اپنا نام نہیں لکھا،

تاریخ صوبجات ہند (فارسی): اس کے مصنف کا پتہ نہیں چل سکا، معلوم ہوتا ہے مصنف اصل کتاب کا مسودہ صاف نہیں کر سکے، خط شکست ہے، راقم نے جستہ جستہ اس کو دیکھا ہے، مکمل مطالعہ نہیں کر سکا، کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے اقالیم عالم کی تقسیم پھر صوبہ جات ہند کی تفصیل ہے، اور شاہان مغلیہ کی مشہور عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے معارف کی تفصیل دی گئی ہے، تاج محل سے متعلق حصہ تاریخ تاج گنج (جس کا ذکر مضمون کی پہلی قسط میں آچکا ہے) کے متن سے ملتا جلتا ہے، دونوں میں تاج محل کی تاریخ، اسکے معارف و نوادر کا ذکر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ تاریخ تاج گنج سے یا تاریخ گنج اس سے ماخوذ ہے، کتاب کے اول و آخر صفحہ پر ایک مہر ثبت ہے، جس میں ظہور علی ۱۲۳۴ھ کندہ ہے، آخر میں اکبر کی وفات اور سکندرہ کی تعمیر کا بیان ہے[۳]،

---

۱ ذریعہ ج ۱ ص ۲۲۳ ۲ فہرست نمبر ۱۱ ادارہ تحقیقات علوم مشرقیہ ٹونک ۳ اس مخطوطہ کے بارے میں پہلی قسط میں لکھا جا چکا ہے اسوقت تاریخ تاج گنج سے اس کا مقابلہ نہیں کیا گیا تھا، دونوں نسخوں میں نسخہ ہذا قدیم معلوم ہوتا ہے، یہ پہلی قسط میں سہواً عہد اکبری کا نوشتہ لکھا گیا ہے، اصل میں یہ دور شاہجہانی کے اواخر یا عہد عالمگیری کے اوائل کے نوشتہ نسخے کی نقل معلوم دیتا ہے، براہ کرم اس کی صحت کر لی جائے،

چہار گلشن (فارسی) : یہ رائے چتر من کایستھ کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے، یہ ایک ضخیم تاریخ ہے جو ابتدا سے لیکر سنہ ۱۱۷۳ھ م سنہ ۱۷۵۹-۶۰ء تک ہندوستان کے تاریخی واقعات پر مشتمل ہے اس کا سنہ تالیف "چتر من نیک گلشن" سے نکلتا ہے، مصنف نے وزیر غیاث الدین خاں کی فرمائش پر احمد شاہ ابدالی کے دوسرے حملے کے دوران میں یہ کتاب لکھی تھی، اس کی تدوین کے بعد ہی مورخ کا انتقال ہو گیا، اس لیے ان کے پوتے رائے زادہ چندر بھان منشی کایستھ نے سنہ ۱۲۰۴ھ م سنہ ۹ [illegible] ء میں اس کو مرتب کر کے ایک مقدمہ کا اضافہ کیا، چہار گلشن کے نام کی مناسبت سے یہ چار گلشنوں میں تقسیم ہے[1]، گلشن اول میں صوبجات ہند کا اور گلشن دوم دکن کے صوبوں کا بیان ہے، گلشن سوم میں دلی سے ہندوستان کے دوسرے مقامات تک جو سڑکیں، راہیں اور شاہراہیں جاتی ہیں، ان کا ذکر ہے، اور گلشن چہارم میں مسلم اور ہندو فقرا کا تذکرہ ہے، سر جادو ناتھ سرکار نے چہار گلشن کے کچھ حصوں کا ترجمہ انگریزی میں اپنی کتاب "اورنگزیب کا ہندوستان *The India of Aurangzeb*" میں کیا ہے[2] ایلیٹ نے بھی اپنی کتاب میں اس کے بارے میں مختصراً لکھا ہے[3]،

چہار گلشن کے خطی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، برٹش میوزیم میں انیسویں صدی عیسوی کا نوشتہ نسخہ ہے اور انڈیا آفس لائبریری میں اٹھارہویں صدی عیسوی کا مکتوبہ ہے، بالڈون میں سنہ ۱۲۰۳ھ م سنہ ۱۷۸۹ء کا لکھا ہوا، بانکی پور میں انیسویں صدی عیسوی کا اور کتب خانہ آصفیہ میں تیرہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، ہمارے ادارہ میں نسخہ ہذا کی کتابت درج نہیں ہے لیکن یہ تیرہویں صدی ہجری کا مرقومہ معلوم پڑتا ہے، اس لیے کہ اس نسخہ پر نواب

---

[1] ریو نے اپنی کیٹلاگ میں گلشن کے بجائے چمن لکھا ہے، ریو جلد ۳ ص ۹۰۹ [2] *The India of Aurangzeb* از سرجادوناتھ سرکار، ص ۸۷-۱۲۳ [3] ہسٹری آف انڈیا (انگریزی) ایلیٹ VIII ۲۰۴- ۲

وزیر الدولہ بہادر خلد مکانی دویم فرمانروائے ٹونک (۱۸۳۴ء سے ۱۸۶۴ء) کی مہر ثبت ہے[1]،

حدیقۃ الاقالیم (فارسی):- یہ ایک جغرافیائی کتاب ہے، لیکن کہیں کہیں اس میں تاریخی حالات ووا قعات دیئے گئے ہیں، اسلیے یہ جغرافیہ اور تاریخ دونوں پر محیط ہے، مرتضیٰ حسین مخاطب باللہ یار عثمانی بلگرامی نے شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں اسکی تصنیف کی، اس میں ساتوں اقالیم کا مفصل ذکر ملتا ہے، اور ہر اقلیم کے مشاہیر علماء اور حکماء کے حالات بھی قلمبند کیے گئے ہیں[2]، ہمارے یہاں کا نسخہ ۱۲۲۵ھ کا نوشتہ ہے، اول صفحہ پر نواب وزیر الدولہ بہادر خلد مکانی اور نواب یمین الدولہ محمد علی خاں بہادر خلد آشیانی کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں، یہ ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ سے چھپ چکی ہے۔

ترجمہ تاریخ فتوح لاحمد بن اعثم کوفی (فارسی):- یہ مخطوطہ فتوح لاحمد کا فارسی میں ترجمہ ہے۔ نگارستان میں انکا نام احمد بن محمد مستوفی مرقوم ہے، جو امیر قوام الدین کے حکم سے ترجمہ کرنے پر مامور کیے گئے، اس کتاب میں خلفائے راشدین اور انکے دور کے جو مسلم غزوات ہوئے اسکا ذکر کیا گیا، امیر قوام الدین کا انتقال ساتویں صدی ہجری کے عشرہ اول میں ہوا، گویا ساتویں صدی ہجری میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ عربی مورخین کی نظر سے شاید یہ نسخہ نہیں گذرا، اس کے اصلی عربی نسخہ کا پتہ نہیں چل سکا ہے، نگارستان اور روضۃ الاحباب میں حوالہ ملتا ہے، مصنف کا نام (ابومحمد) احمد بن اعثم کوفی دیا ہوا ہے، برخلاف اس کے میرخواند بمبئی ایڈیشن کے مطابق ان کا نام محمد بن علی بن اعثم بتایا گیا ہے، فتوح ابن اعثم کا مورسے کیٹلاگ میں بھی ذکر کیا گیا ہے، مترجم نے مقدمے میں اپنے حالات زندگی دیے ہیں، اور خوارزم اور خراسان کے اکابر کا طرۂ امتیاز وشان امارت بتائی گئی ہے[3]، ہمارے یہاں کا مخطوطہ ۱۰۱۴ھ کا نوشتہ ہے، حاجی سہراب اس کے کاتب ہیں، قدرے کرم خوردہ اور درست شدہ ہے

(باقی)

---

[1] مزید دیکھئے ریو (Rieu) جلد سوم صفحہ ۱۰-۹۰۹ اور اسٹوری صفحہ ۲، ۱۴ [2] مزید دیکھئے Rieu جلد سوم ص ۹۹۲ [3] Rieu جلد اول ص ۱۵۱

وفیات

ذاکر صاحب

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

گورنری کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو وہ ۱۹۶۲ء میں جمہوریۂ ہند کے نائب صدر منتخب کر لیے گئے، اُن کے اس اعزاز پر ہم دار المصنفین والوں کو بڑی خوشی ہوئی، ان کی نائب صدارت کے زمانہ میں مجھکو باربار ملنے کا اتفاق ہوا، ہر موقع پر انکی ملنساری، وضعداری، خاکساری اور محبت کو پہلے سے زیادہ پایا، وہ دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن ۱۹۴۷ء سے تھے، اس حیثیت سے بھی دار المصنفین کے تمام لوگوں سے محبت کرتے، اور اس کے کاموں سے دلچسپی رکھتے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رحلت کے بعد خود ہم لوگ مشکوک تھے کہ معلوم نہیں اسکا علمی و تحقیقی معیار باقی رہ بھی سکے گا کہ نہیں، ڈاکٹر ذاکر صاحب سے جب ملتا اور دار المصنفین کا ذکر آتا تو اسکے معیار کے برقرار رہنے کی تعریف کرکے حوصلہ افزائی فرماتے، ایک بار میں نے انکی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس کے شروع میں میرے قلم سے یہ نکل گیا تھا کہ "امید ہو کہ آپ مجھکو بھولے نہ ہونگے"، اسکا جواب اپنے ایک سرفرازنامہ مورخہ ۳ اگست ۱۹۶۳ء میں دیا، تو تحریر فرمایا کہ "یہ بدگمانی آپ کو کیوں ہو کہ میں آپ کو بھول گیا ہوں، حافظہ تو میرا کچھ اچھا نہیں رہا ہے، لیکن آپ کو بھلانا تو میرے حافظہ کے لیے بھی مشکل ہو"۔ ان فقروں میں خود ان کے بلند رتبہ کاتب کی شرافت طبع کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، دار المصنفین میں تاریخ ہند پر جو کام ہو رہا تھا، اسکی پندرہ جلدیں انکی خدمت میں مذکورۂ بالا خط کے ساتھ بھیجی تھیں، انکے متعلق لکھا "تاریخ ہند سے متعلق دار المصنفین کی مطبوعات کا پورا سٹ مجھے مل گیا ہو کن لفظوں میں آپکے اس کرم کا شکریہ ادا کروں بعض کتابیں تو پہلے نظر سے گذر چکی ہیں لیکن اس پورے سٹ

سے کام کی وسعت اور نوعیت کا وہ اندازہ ہوتا ہے جو مجھے پہلے نہ تھا، آپ نے ایک بڑا کام اٹھایا ہے، دعا ہے کہ آپ کے ہی ہاتھوں تکمیل کو پہنچے، آپ کی یکسوئی، مستعدی اور خلوص سے یقین ہو کہ اس دعا کو قبولیت نصیب ہو جائے گی"

اسی سال میں نے تاریخ ہند کی دو نئی جلدیں ان کی خدمت میں بھیجیں تو اپنے ایک مکتوب مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۹۳ء میں تحریر فرمایا "مطبوعات دارالمصنفین کی دو جلدیں "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے" اور "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے" مجھے ملیں جستہ جستہ دیکھ رہا ہوں، بہت خوب کام ہے، اس عہد کی تمدنی تاریخ پر بہت دلچسپ اور تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے، یہ دونوں کتابیں، آپ جس مستعدی اور یکسوئی سے اپنے استاد مرحوم کے تفویض کردہ کام کی تکمیل کر رہے ہیں، اس پر بے ساختہ دل سے صدائے آفریں نکلتی ہے، مبارک ہو"

ڈاکٹر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کام کرنے والوں کو اپنی پیاری پیاری باتوں سے ان کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارتے، بلکہ اکسا کر ان کو اور بھی زیادہ مستعدی سے کام کرنے کی ہمت دلاتے، یہ تحریریں ان کی ان ہی خوبیوں کے نمونے ہیں، وہ اپنے خطوط میں مجھکو محبی، محب گرامی، محب گرامی سید صباح الدین عبدالرحمن زاد لطفہ سے مخاطب کرتے، میں نے ان کو توجہ دلائی کہ میری حیثیت تو آپ کے ایک ادنی شاگرد کی ہے، محبی پڑھکر شرمندہ رہا ہوں تو اس کے جواب میں دو تین خطوط میں مکرم بندہ سے مخاطب فرمایا، اس سے اور بھی ندامت ہوئی، اور پھر محبی لکھنے لگے، یہ ان کی بلندی اخلاق اور خاکساری کی دلیل تھی میں جب جب دہلی جاتا تو اعظم گڈھ سے روانہ ہوتے وقت خوش رہتا کہ دہلی میں ان سے مل کر ان کے لطف و کرم سے سیراب ہونے کا موقع ملے گا، اور ان ہی کی محبت بھری باتوں کی سوغات اعظم گڈھ لاتا،

ایک بار جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی بھی ہمسفر ہوئے، ہم دونوں ذاکر صاحب سے ملے، تو دیر تک بڑی بے تکلف مجلس رہی، ہم دونوں رخصت ہونے لگے تو ذاکر صاحب اپنی برساتی تک پہنچانے آئے، رات کا وقت تھا، شاہ صاحب نے رخصتی مصافحہ کیا تو ذاکر صاحب کچھ دیر تک روبرو کھڑے ہو کر ان کا ہاتھ پکڑے رہے، اوپر دونوں کے چہروں پر ایک بہت تیز بجلی کا بلب جل رہا تھا، ذاکر صاحب شاہ صاحب کے وجیہہ چہرے کو دیکھکر بولے ماشاءاللہ چہرہ پر نور برس رہا ہے"

شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "جی نہیں، یہ جمال ہمنشیں کا عکس ہے"، ذاکر صاحب بے ساختہ ہنس پڑے، میں نے فوراً ہی کہا اگر اجازت ہو تو عرض کروں کہ کابل کے مشہور شاعر سرور خاں گویا ۱۹۳۶ء میں ہندوستان آئے تھے، وہ آپ سے بھی جامعہ ملیہ میں ملے تھے، پھر دہلی سے لکھنؤ ہوتے ہوئے اعظم گڈھ بھی پہنچے تھے، انھوں نے ایک گفتگو کے سلسلہ میں حضرت سید صاحب یعنی مولانا سید سلیمان ندوی) سے کہا کہ میں نے ہندوستان میں حسین ترین آدمی ڈاکٹر ذاکر حسین کو پایا"۔ یہ سنکر ذاکر صاحب نے فرمایا "اخاہ! آپ نے یہ بات بہت دیر میں بتائی اگر پہلے بتائی ہوتی تو میں اسکو سند کے طور پر استعمال کرتا رہتا"۔

اس پرلطف ملاقات کے بعد ہم دونوں ذاکر صاحب کی کوٹھی سے براہ راست ایک دعوت میں پہنچے جہاں ہم لوگوں کی خاطر کچھ اور معززین بھی بلا لیے گئے تھے، ان میں کچھ سرکاری عہدیدار اور کچھ اخبار کے اڈیٹر بھی تھے، میری شامت آئی تو اثنائے گفتگو میں ذاکر صاحب کے یہاں جو دلچسپ باتیں ہوئی تھیں، انکو دہرا دیا، سامعین سنکر خاموش ہو گئے، انھوں نے ان باتوں سے نہ لطف لیا اور نہ ان پر تبصرہ کیا، بلکہ محض سن لیا، پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد ان لوگوں نے خود ذاکر صاحب کو موضوع بنایا جن کو سنکر ہم دونوں کو اندازہ ہوا کہ یہ سب اُن کے ناقدین میں سے ہیں، پھر ان کے منہ میں جو کچھ آیا سب کہہ گئے، "وہ ہندو نواز ہیں"، "ہندوؤں کو صرف خوش رکھنا چاہتے ہیں"، "بلوے فساد ہوتے رہتے ہیں مگر مسلمانوں کی حمایت میں کچھ نہیں کہتے" وغیرہ مجھکو افسوس ہوا کہ میں نے اس مجمع میں ذاکر صاحب کا نام ہی کیوں آنے دیا،

جنوری ۱۹۶۴ء میں انٹرنیشنل اورینٹل کانفرنس کا ۲۶ واں اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، مجھکو بھی ایک مقالہ اس کے اسلامک اسٹڈیز سکیشن میں پڑھنا تھا، دنیا بھر کے مستشرقین کا بڑا اچھا اجتماع تھا، میں نے دہلی جانے سے پہلے حسب معمول ذاکر صاحب کو ایک خط لکھکر ان سے ملاقات کا وقت مانگا، اورینٹل کانفرنس کے شرکا راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ ہند جناب رادھا کرشنن کی طرف سے ایٹ ہوم میں مدعو تھے، میں نے بھی اس میں شرکت کی لیکن رادھا کرشنن اپنی علالت کی وجہ سے وہاں نہ پہنچ سکے، انکی نیابت ذاکر صاحب نے کی،

جائے کے بعد وہ سب سے بے تکلف ملے، مجھ سے بھی ملاقات ہوئی تو فرمایا "گھر پر آکر ضرور ملئے"، جب رخصت ہونے لگے تو ایک اونچے تخت پر کھڑے ہوگئے، دونوں ہاتھ جوڑ کر رخصتانہ سلام کیا، اُس وقت میرے پاس ایک کٹر اہل علم نیشنلسٹ مسلمان کھڑے تھے، جو آگے چل کر راجیہ سبھا کے رکن بھی ہوئے، انھوں نے ذاکر صاحب کو اس طرح ڈنڈوت کرتے دیکھا تو بولے "ہمارے تم لوگوں نے ذاکر صاحب کو یہی سوغات دی ہے، پہلے تو اس طرح سلام نہیں کرتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد نے تو کبھی بھی اس طرح سلام نہیں کیا، یہ محض ہندوؤں کو خوش کرنا ہے" میں اس وقت یہ سننے کو تیار نہ تھا، دل میں ایک چوٹ لگی، مگر ہنسکر انکو یہ جواب دیا

غمزۂ خاص بہر گبر و مسلمان دارد

اور میں زبان حال سے کہہ رہا تھا

ذاکر کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اور جب راشٹرپتی بھون سے رخصت ہو رہا تھا، تو ذہن پر یہ خیال چھایا ہوا تھا کہ لوگ اپنی محبت میں ان کو جامعہ ملیہ ہی کا مرد مومن ہر حال میں دیکھنا چاہتے ہیں، کاش ان سے کوئی بات ایسی سرزد نہ ہوتی کہ جس سے ان کی محبوبیت اور عظمت میں فرق آتا، میں پھر انکی کوٹھی پر جاکر ملا، ان سے عرض کیا کہ اسی سال دارالمصنفین کی طلائی جوبلی منانے کا خیال ہے، آپ سے بڑھ کر اس جشن کے افتتاح کے لیے کوئی اور آدمی موزوں نہیں ہے، انھوں نے بڑی خوشی سے میری دعوت قبول فرمالی، ان سے یہی توقع تھی، کیونکہ ان کو دارالمصنفین سے بڑا لگاؤ رہا، پھر اس کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف قسم کے مشورے دیر تک دیتے رہے، میں ان سے ایک بار پھر شاداں و فرحاں ہو کر رخصت ہوا۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی اور میں دونوں بمبئی گئے ہوئے تھے، وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے کہ ذاکر صاحب سے گفتگو کرکے جشن کی تاریخ مقرر کرلی جائے، وہ حسب معمول بہت ہی محبت سے ملے اور تاریخ ۲۰، ۲۱ فروری ۱۹۶۵ء مقرر کی، اسی اثنا میں آزاد بھون کے ایک ڈنر میں جناب عبدالکریم

چھاگلا سے میری ملاقات ہوئی جو اس زمانہ میں وزیر تعلیم تھے، میں نے ان کو شبلی اکیڈمی کی جوبلی میں مدعو کیا، وہ مولانا شبلی اور شبلی اکیڈمی سے بالکل واقف نہ تھے، انگریزی میں پوچھنے لگے، مولانا شبلی کون تھے اور کیا یہ اکیڈمی آرٹ کی اکیڈمی ہے ؟ میں نے اس کا ذکر ذاکر صاحب سے کیا تو ہنس کر فرمایا کہ کہہ دیا ہوتا کہ یہ رقص و سرود کی اکیڈمی ہے، چلتے وقت تین ہزار کی رقم بھی دار المصنفین کو عطیہ کے طور پر دی، اس موقع پر اپنے پھولوں کا چمن بہت شوق سے دکھایا، جس میں گلابوں اور بوگن ویلیا کی بڑی بہار تھی، ان کے چمن میں گلابوں کی چار سو قسمیں تھیں جو انھوں نے نہ صرف ہندستان کے مختلف گوشوں بلکہ انگلستان، فرانس اور جرمنی سے بھی منگائی تھیں، ان کے اس ذوق کو دیکھ کر گلاب کے ماہرین بھی ان کے پاس تحفے بھیجا کرتے تھے، صوبہ بہار میں دیوگھر میں گلابوں کی بہت سی قسمیں تیار ہوتی ہیں، وہاں اسکے ماہر ایک مسٹر بھٹنا جارجی تھے، وہ ذاکر صاحب سے بہار کی گورنری کے زمانے میں ملے، تو ان کے اس شوق کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اور انھوں نے گلاب کی ایک قسم کا نام ذاکر حسین ہی رکھ دیا، جو اب اسی نام سے مشہور ہے، ذاکر صاحب نے اپنی کوٹھی میں ہم لوگوں کو ایک ایسا بوگن ویلیا بھی دکھایا جس میں کئی رنگ کے پھول تھے، میں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ اس کی تحقیق نہ کیجئے، آپ اپنی علمی و ادبی تحقیقات ہی میں رنگ برنگ کے پھول پیدا کرنے میں لگے رہیں"۔

دار المصنفین واپس آکر طلائی جوبلی کے جشن کی تیاری شروع کر دی، جناب شاہ معین الدین اور میرے دونوں کے دل دھڑکتے رہے کہ اس دور افتادہ مقام میں مدعوین کا آنا مشکل ہے، اس لیے جشن کامیاب نہ ہو سکے گا، میری صحت اچھی نہیں رہتی ہے، لیکن میں نے جشن کو کامیاب بنانے میں جان کی بازی لگا دی، یہاں اس شہر میں کوئی اچھا ہوٹل نہیں ہے، جہاں معزز بیرونی مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام کیا جا سکتا تھا، نائب صدر جمہوریہ کے لیے بھی کوئی موزوں جگہ نہ تھی، لیکن کافی خرچ کر کے بہتر سے بہتر خیمہ و خرگاہ شبلی کالج کے میدان میں نصب کئے گئے، پنڈال بھی خوبصورت تیار کیا گیا، ایک روز پہلے

دار المصنفین کو آراستہ و پیراستہ کرکے دلہن بنا دیا گیا، جو طرح طرح کی روشنی سے جگمگانے لگا، پھر بھی ڈر تھا کہ مدعوئین نہ پہنچے تو خفت اور مالی زیر باری دونوں ہوگی، لیکن ذاکر صاحب کا اقبال روز افزوں عروج پر تھا، اس لیے ان کی آمد میں دار المصنفین پر بھی اقبال طاری ہوا، بیگم صاحبہ بھوپال کا تار پہنچا کہ وہ بھی تشریف لائیں گی، اتر پردیش کی چیف منسٹر مسز سچیتا کرپلانی کا ٹیلیفون آیا کہ وہ بھی آرہی ہیں، جناب ہمایوں کبیر وزیر حکومت ہند، سفیر شام، سفیر سعودی عرب الشیخ احمد الشبیلی، جناب افضل اقبال صاحب ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کی طرف سے بھی اطلاع ملی کہ وہ بھی شرکت کرینگے، پھر جناب علی ظہیر صاحب وزیر قانون و انصاف حکومت اتر پردیش، جناب مظفر حسن وزیر حکومت اتر پردیش، پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ، ڈاکٹر عابد حسین دہلی، کرنل بشیر حسین زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، مولانا طیب مہتمم دار العلوم دیوبند، ڈاکٹر یوسف حسین پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی، مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی، مفتی عتیق الرحمٰن دہلی، مولانا اسعد میاں ناظم جمعیۃ العلمائے ہند، مولانا منت اللہ امیر شریعت بہار، مولانا شاہ عون احمد صاحب خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، مولانا قاضی محمد سجاد صاحب صدر مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی، جناب مالک رام دہلی، جناب حیات اللہ انصاری صاحب اڈیٹر قومی آواز لکھنؤ، جناب رضا انصاری صاحب فرنگی محل لکھنؤ، پروفیسر حسن عسکری صاحب پٹنہ یونیورسٹی، مولانا عرشی صاحب رامپوری، ڈاکٹر امیر حسن عابدی صاحب دہلی یونیورسٹی، جگن ناتھ آزاد دہلی، پروفیسر رام کمار چوبے بنارس، ضیاء الحسن فاروقی صاحب دہلی، [illegible] صدیقی صاحب، جناب عدیل عباسی صاحب بستی، جناب نیاز احمد صدیقی سابق پرنسپل محمد حسین انٹر کالج جونپور، محمد یٰسین خاں صاحب جونپور، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی بمبئی، مولوی ریاست علی ندوی پٹنہ، پروفیسر عبد القوی دسنوی بھوپال، وغیرہ شریک ہو کر رونق مجلس ہوئے، دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بیرونی ارکین میں ڈاکٹر سید محمود، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی، ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی، سید شہاب الدین دسنوی بمبئی، مسعود الحسن صاحب آئی، اے، ایس سابق سکریٹری یو، پی حکومت، مولانا اویس نگرامی ندوی اور جناب سعید انصاری جامعہ ملیہ دہلی بھی آگئے تھے، ۱۴ فروری کو دار المصنفین اس کے کارکنوں کی آرزوؤں کی جنت بن گئی، اس میں

معزز مہمان فرشتوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آئے، جب ڈاکٹر صاحب دار المصنفین کے احاطہ میں داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ خداوند تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کو ساتھ لیکر جلوہ افروز ہوئے ہیں، انکا شاندار استقبال کیا گیا، شبلی کالج کے ان، سی، سی نے گارڈ آف آنر دیا، دار المصنفین کے احاطہ میں سب ان کے لیے فرش راہ ہوگئے، میں اس منظر کو دیکھ کر بے قابو ہوگیا، اور اس تقریب کی شوکت سے میری آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہنے لگے، ڈاکٹر صاحب نے تھپکی دی اور بولے "آپ نے تو ایک شہر آباد کردیا ہے، اتنی تیاری کی ضرورت نہیں تھی، جوبلی منانے کا مقصد روپیہ کمانا بھی ہوتا ہے، کہیں مالی خسارہ نہ ہو" پھر حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا "خسارہ میں نہیں رہئیے گا، کچھ تحفے لایا ہوں" میں نے عرض کیا کہ "آپ کا آجانا ہی سب سے بڑی دولت ہے" بولے "میری فکر نہ کیجئے، میں دار المصنفین کو اپنا گھر سمجھکر آیا ہوں، مسز سچتا کرپلانی اور بیگم صاحبہ بھوپال کی ہر ممکن خاطر تواضع کیجئے"

لنچ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی دیر تک آرام کیا، پھر تین بجے سہ پہر کو جشن کا جلسہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کی صدارت میں شروع ہوا، ڈاکٹر صاحب جب ڈائس پر آکر بیٹھے تو مجھکو وہ بہت ہی دل آویز اور پرشکوہ معلوم ہوئے، خیال ہوا کہ یونان میں افلاطون شاید اسی طرح لوگوں کی نگاہوں میں دکھائی دیتا ہو، جناب شاہ معین الدین صاحب نے جب انکی خدمت میں سپاسنامہ پڑھا تو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بھی انکی نذر کررہے ہیں، انھوں نے سپاسنامہ کی ابتدا اس طرح کی:

جناب والا!

آپ نے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے بڑے بڑے تعلیمی و علمی ادارے دیکھے ہیں، خود انکے مہمان ہوئے ہیں، اور ان کے فضلا کو اپنا مہمان بنایا ہے، بڑے بڑے سلاطین اور حکومتوں کو آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ کی آنکھوں نے شاہانہ استقبال و میزبانی کے پرشکوہ مظاہر دیکھے ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی ہم بوریانشینوں کے پاس نہیں ہے لیکن آپ کی بڑائی ان ظواہر سے بے نیاز ہے اور آپ کا دل بھی

ان سے سیر ہے، ہمارے پاس صرف اخلاص کا ہدیہ، سادگی کی پونجی ہے جس کے آپ خود بڑے قدر شناس ہیں، اسلیے ہم کو یقین ہے کہ ہمارا ہدیۂ اخلاص آپ کی نگاہ میں شان و شکوہ کے مظاہرے سے زیادہ قابل قبول ہوگا، ہمارے لیے آپ کی حیثیت تنہا ہندوستان کے وائس پریسیڈنٹ ہی کی نہیں، بلکہ ایک مفکر، ایک ماہر تعلیم اور معمار قوم کی بھی ہے، آپنے اس زمانہ میں نوجوانوں کو ملک و ملت کے لیے ایثار و قربانی کا عملی سبق دیا جب ان کا منتہائے نظر سرکاری عہدے اور دنیاوی دولت و وجاہت تھی، آپنے ان کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھا اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کرکے قومی تعلیم کا ایک عظیم الشان ادارہ قائم کر دیا جس نے انگریزوں کی غلامی کے دور میں ملک کے نوجوانوں کو درد دیا اور ان کو قوم و ملت کی راہ پر لگا دیا، آپنے مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے مسلم یونیورسٹی کو بڑے نازک دور میں تباہی سے بچاکر دوبارہ زندگی بخشی، اب آپ کی ذاتی عظمت دنیاوی اعزاز سے بے نیاز ہے، آپ کے جمال و کمال کو ظاہری زینت و آرائش کی ضرورت نہیں ہے، ع

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

لیکن اللہ تعالیٰ ایثار و قربانی کا صلہ ضرور دیتا ہے، اس لیے اب آپ کو ان دنیاوی انعامات سے بھی نوازا جن کی ایک بڑے سے بڑا ہندوستانی تمنا کر سکتا ہے، اگرچہ جوہر و تلوار کے لیے طلائی قبضہ کی ضرورت نہیں لیکن طلائی قبضہ اس پر زیب دیتا ہے، اسی طرح آپ کی کلاہ عظمت پر آپکے جلیل القدر عہدے کا طرہ بھی زیب دیتا ہے"۔

"دارالمصنفین سے جنابکے جو گوناگوں تعلقات ہیں، ان کے اظہار کی ضرورت نہیں، ہم دونوں ایک ہی منزل کے مسافر تھے، گو راہیں جدا جدا تھیں، اس وحدت مذاق نے جو رشتہ ہمارے درمیان پیدا کر دیا تھا، وہ بحمداللہ ہر زمانہ میں قائم رہا، دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کو آج بھی آپ کی رکنیت کا شرف حاصل ہے، اس رشتہ کی کشش تھی جو آپ کو اعظم گڈھ کھینچ لائی، ورنہ اس ویرانہ میں ہندوستان

کے نائب صدر جمہوریہ کا ورود کون تصور کر سکتا تھا،

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں'

یہ سپاسنامہ رسمی طور پر نہیں بلکہ بہت ہی عقیدت و اخلاص سے پیش کیا گیا تھا، اس لیے ذاکر صاحب نے بھی لطف و لذت کے ساتھ سنا اور خود بھی بہت محبت و اخلاص سے اپنا خطبہ پڑھ کر سنایا۔ جس میں انھوں نے فرمایا:۔

جناب صدر، بزرگو اور دوستو!

زبان اور اس کا ذخیرۂ الفاظ یوں بھی قلب انسانی کی صحیح اور مکمل ترجمانی سے قاصر تھا، اور پھر زبان کے سرمایہ داروں نے اپنا سارا خزانہ سطحی جذبات کی نمود و نمائش میں اس بے دردی سے لٹا دیا کہ گہرے محسوسات کے لیے اچھوتے الفاظ باقی نہیں رہے، مجبوراً ہمیں گہرے اور نازک سے نازک واردات قلب کو بیان کرنے کے لیے ان ہی گھسے پٹے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے جن میں اب بظاہر نہ آب و رنگ رہا ہے نہ معنویت، اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ دارالمصنفین کے جشن طلائی میں شرکت کرنا میرے لیے فخر و مسرت کا باعث ہے، تو آپ (ان) کی فرسودگی اور بے رنگی پر نہ جائیے، بلکہ اس کی تہ میں قائل کے جوش و خلوص کی تازگی و آب و تاب کو دیکھئے، اور محسوس کیجئے، جی ہاں، مجھے آج فخر ہے اس پر کہ پچھلی نصف صدی میں ہمارے ملک میں سیاست کی تند و تیز آندھیوں کے درمیان میں تحقیق و تخلیق کے چراغ جلتے رہے، اور علم و ادب کی جوت جگاتے رہے اور مسرت ہے اس کی کہ ان میں سے ایک سراج منیر دارالمصنفین اعظم گڈھ ہے، جس کے ساتھ مجھے کئی رشتوں سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہے، اس لیے کہ یہ یادگار ہے، میرے محترم بزرگ مولانا شبلی نعمانی اور ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالسلام ندوی مرحومین کی، اور کارنامہ ہے میرے محترم اور شفیق بھائی مولوی مسعود علی ندوی اور عزیز دوست شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولوی سید صباح الدین عبدالرحمن

اور ان کے رفقائے کار کا، اور اس لیے کہ اس سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جس کی خدمت میں میں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گذارا ہے، ہم خیالی اور ہم مشربی کا تعلق رہا ہے، ان ذاتی تعلقات سے قطع نظر ایک مسلمان اور ہندوستانی کی حیثیت سے مجھے یہ ادارہ جو قوم کی بیش بہا دولت ہے، دل سے عزیز ہے، اور اسکے جشن میں شرکت کرکے سچی خوشی محسوس ہوتی ہے"

ذاکر صاحب بڑے اچھے خطیب بھی تھے، ان کا شمار ملک کے بہترین خطیبوں میں ہوتا ہے، اپنی خطابت میں فوج در فوج الفاظ یا جملوں کا سہارا نہیں لیتے، بلکہ جو کچھ کہتے ایسے سادہ، مخلصانہ مگر دل آویز انداز میں کہتے کہ معلوم ہوتا کہ اس سے بہتر طریقہ پر وہ چیز ادا نہیں کیجا سکتی ہے، ان کی تحریروں میں بھی اسی سادگی کی دل آویزی جو تھی، لیکن وہ اپنی اثر پذیری کی وجہ سے ایک خاص اسلوب بنجاتا، جو انشا پردازی کے کرشمے بھی بنجاتے، ان کا مذکورہ بالا خطبہ ان کی اسی سادہ خطابت اور انشا پردازی کا ایک نمونہ ہے، وہ دار المصنفین کے جشن جوبلی میں اپنی شرکت کی خوشی کا اظہار کر چکے تو نہ صرف اپنے سامعین بلکہ پورے ہندوستان کو دار المصنفین کی طرف ہمدردانہ توجہ کرنے کی ضرورت پر زور یہ کہکر دیا

"آج اس مبارک موقع پر جب دار المصنفین اعظم گڈھ اپنی زندگی کی پہلی نصف صدی پوری کرکے نصف دوم میں قدم رکھ رہا ہے، سب علم دوست اور محب وطن ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کا فرض ہے اور ہم آپ جو ملک کے مختلف حصوں سے آکر یہاں جمع ہوئے ہیں، اسے ساری قوم کی طرف سے فرض کفایہ کے طور پر ادا کر رہے ہیں کہ دار المصنفین اور اس کے مؤسس روحانی مولانا شبلی نعمانی کی گرانقدر علمی اور ادبی خدمات کا جس سے انھوں نے بالواسطہ ہندوستان کے اور بالواسطہ ساری دنیا کے تمدنی سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا اور ان کی ان ملی خدمات کا جن سے انھوں نے حب وطن آزادی اور قومی یکجہتی کی تحریکوں کو سہارا دیا، کم سے کم ایک سرسری جائزہ لیں، ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کریں اور سوچیں کہ اس چشمۂ فیض کو جاری رکھنے اور اسکے دامن کو وسیع کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے"

اس کے بعد انھوں نے دار المصنفین کے کارناموں پر مختصر لیکن پر مغز طریقہ پر مداحانہ تبصرہ کیا:

"علامہ شبلی اور دار المصنفین کا علمی اور ادبی عطیہ زیادہ تر اسلامی تاریخ و سیر، تاریخ ہند اور تاریخ و تنقید اور کچھ میدانوں سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کی خصوصیات میں نفس مضمون کی متوسط لہجے کے اعتدال، زبان و بیان کی سلاست کے علاوہ اور ان سے بھی زیادہ نمایاں قلب و نظر کی وسعت ہے، اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے، اور "قصۂ سکندر و دارا" اسنانے کے بجائے حکایت مہر و وفا بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔"

اس خطبہ کے لکھنے تک ہندوستان کے قرون وسطیٰ پر دار المصنفین سے سولہ[۱۶] جلدیں نکل چکی تھیں جو ذاکر صاحب کی نظروں سے گذری تھیں، ان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ہندوستان میں تاریخ نگاری کے اس تاریک دور میں جب ہمارے اکثر مورخ اپنے مجازی استاد ازل کے کہے ہوئے کو طوطی صفت دہرایا کرتے تھے اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان کو ایک بحر طوفان خیز بنا کر پیش کرتے تھے، جس میں اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کے دھارے ایک دوسرے سے الجھتے اور ٹکراتے رہتے تھے، دار المصنفین کے مورخوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کا ملنا تصادم نہیں بلکہ امتزاج، سنگھرش نہیں بلکہ سنگم تھا، اور کیوں نہ ہو عالمی تاریخ کی تہ کو پہنچیے تو ہر تہذیب ایک عظیم الشان منصوبہ کی تکمیل میں اپنا اپنا حصہ پورا کرتی دکھائی دیتی ہے۔"

ذاکر صاحب کا خاص موضوع تو معاشیات تھا، لیکن مختلف علوم و فنون کا مطالعہ بھی برابر کرتے رہے، جس سے ان کی فکر و نظر میں ہمہ گیریت تھی، اس لیے وہ ہر موضوع پر گہری نظر ڈال کر اس میں خاص آب و تاب پیدا کر دیتے تھے، چنانچہ اپنے اس خطبہ میں بھی یہ کہکر فاضلانہ اور مفکرانہ رنگ پیدا کر دیا:

"لین دین، تاثیر و تاثر کا ایک لا متناہی سلسلہ ہے جو ایک صالح انسانیت کی تعمیر کے لیے برابر جاری ہے، علوم و فنون کا خزانہ ہندوستان سے بغداد پہنچا، وہاں عربوں نے اس پر اپنی زبان اور تہذیب کا رنگ چڑھایا، چند صدیوں بعد یہی علوم و فنون ترکوں کے ذریعہ پھر ہندوستان واپس آئے اور اس ملک کی تہذیبی زندگی کو مالا مال کیا، اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ ایک وسیع تر تاریخ کا جز بن گئی، اس کا احساس وضاحت کے ساتھ امیر خسرو کے یہاں خصوصاً ان کی مثنوی نہ سپہر میں ملتا ہے صرف یہی نہیں کہ حضرت امیر خسرو نے ہندوستانی اشیاء سے متعلق اپنی گہری پسند کا اظہار فرمایا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ سارے ہندوستانی تاریخی ورثے کو اپنا ورثہ سمجھتے ہیں، اس پرانے عہد کی تمام زندگی میں یہ احساس موجود تھا، خسرو نے شاعر کی حیثیت سے اس احساس کو آب و تاب کے ساتھ پیش کر کے جامع زندگی اور احساس کی سچی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔"

ذاکر صاحب اپنی قابلیت اور ذہانت سے اپنی تحریروں کو موم کے سانچے کی طرح اپنی خواہش کے مطابق موڑ کر ان میں پیچ و خم پیدا کر دیتے تھے جس میں بڑی نکتہ رسی بھی ہوتی اور گہری بصیرت بھی۔ امیر خسرو کے احساس وطنیت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

"اسلام کا نقطۂ نظر چونکہ عالمی نقطۂ نظر ہے، اس کا خطاب چونکہ ساری نوعِ انسانی سے ہے، اس لیے اس کی تعلیمات سے متاثر مورخوں سے امید کی جا سکتی ہے کہ تاریخ نگاری کو تنگ تعصبات کے بھلانے کا ذریعہ بنائیں گے بلکہ انسان کو اس تقدیر سے آگاہ کرنے میں مدد دیں گے، شاید امام شافعی کا قول ہے کہ اگر صرف سورۂ والعصر نازل کر دی جاتی تو بندوں کو ہدایت کے لیے کافی تھا، اس قول میں بڑی بصیرت پوشیدہ دکھائی دیتی ہے، اس لیے کہ اس مختصر سی سورت کے چند بولوں میں تاریخ عالم کی نہایت بلیغ توجیہ و تعبیر موجود ہے، ذکر وہی عموم کے ساتھ انسان کا ہے اور زمانہ کی قسم سے منشا یہ ظاہر کرنا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ انسان کے لیے جبری لزوم کی زنجیریں نہیں بناتا بلکہ عمل کے لیے بے شمار امکانات

دروازہ کھول دیتا ہے یہ تاریخ کی اخلاقی توجیہ ہے، اس سے تاریخ انسانی اعمال کے نتائج سے عبارت ہو جاتی ہے، جو انسانی یقین اور ارادہ سے ظہور میں آتے ہیں، اور کیسا بلیغ اشارہ ہے کہ اگر فوری طور پہ نیک عمل کرنے والی جماعت گھاٹے میں نظر آئے تو صبر کے ساتھ انتظار کرے، زمانہ اس گھاٹے اور نامرادی کو کامیابی میں بدل دیگا، بے یقینی اور بے عملی کے لیے تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے"۔

ذاکر صاحب نے سورہ والعصر کی دل آویز تشریح کر کے جس پوشیدہ مذہبی، تاریخی اور انسانی بصیرت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ نہ صرف ہندوستان کے مورخوں بلکہ انسانی معرفت کے اقدار کے قدر دانوں کے لیے ایک مستقل پیام ہے۔

ذاکر صاحب نے اپنے خطبہ کا رخ موڑ کر پھر دارالمصنفین کی گوناگوں خدمات کا ذکر چھیڑ دیا اور فرمایا:

"دارالمصنفین نے تاریخی تحقیق پر خاص توجہ کر کے اسلامی اور ہندوستانی تہذیبی زندگی اور اُن کی معرفت انسانی اقدار کی بڑی خدمت انجام دی ہے، ملکی سیاست کے میدان سے دارالمصنفین کو بہ حیثیت ایک علمی اور ادبی ادارے کے کوئی تعلق نہیں رہا، لیکن شخصی حیثیت سے اس کے مرادو مرشد مولانا شبلی سچے اور پکے قوم پرور مسلمان تھے، اور اس کے کارساز و کارپرداز مولوی مسعود علی ندوی بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے رہے اور دونوں نے اتحاد اور آزادی کا ساتھ دیا، اور تفریق اور غلامی کے رجحانات کی شدید مخالفت کی، اس لیے دارالمصنفین کے گوشہ نشین کارکنوں میں قومی آزادی اور قومی یکجہتی کے جذبات روح رواں کی طرح سما گئے، اور ان کی تائید، ہمدردی، اتحاد اور آزادی کے سب علمبرداروں خصوصاً قوم پرور مسلمانوں کے لیے قوت اور فیضان کے سرچشمے کا کام دیتی رہی"۔

اور پھر بڑی دل سوزی سے اپنی اور ملک کی طرف سے دارالمصنفین کے لیے دعائیں کرتے ہوئے ان سطروں میں خراج تحسین پیش کیا جس میں دارالمصنفین کو ایک سربلند سایہ دار برومند درخت اور شجر طیبہ کہا

"اگر میں یہ سمجھوں تو بیجا نہ ہوگا کہ علم و ادب کے قدر شناس اور ملک و قوم کے خیرخواہ وہ بھی جو آج

یہاں موجود اور اس مجلس میں شریک ہیں اور وہ بھی جو اپنی مجبوریوں کی بنا پر شرکت سے محروم رہے میری طرح یہ احساس رکھتے ہیں کہ دار المصنفین اعظم گڈھ کا ہندوستان کی تہذیب و تاریخ تدوین اور آزادی وطن کی تحریک میں قابل قدر اور قابل ذکر حصہ ہے، اور میرے ہم زبان ہو کر اس کے گذشتہ اور موجودہ اراکین کا ان کی بیش بہا خدمات کے لیے پر جوش شکریہ ادا کرتے ہیں، اور انھیں پر خلوص مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ پودا جو انھوں نے اب سے پچاس برس پہلے لگا کر اسے اپنے خون سے سینچا تھا، آج ایک سربلند اور برومند درخت بن گیا ہے، اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اس شجر طیبہ کی جڑیں اور زیادہ مضبوط ہوں اور اس کی شاخیں اور پھیلیں، اس کے پھولوں کی شادابی اور نکہت اور اس کے پھلوں کے رس اور لذت میں اور اضافہ ہو۔"

ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم تھا کہ اس سایہ دار برومند درخت اور شجر طیبہ کے سینچنے میں اس کے باغبان کٹھن منزلوں سے اب تک گذر رہے ہیں، اور وہ ابھی تک اسی قناعت و توکل کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو خود انھوں نے جامعہ ملیہ میں گذاری تھی، اسی لیے اس کی طرف بہت ہی حسین پیرایۂ بیان میں قوم و ملک کی توجہ دلائی،

"مگر دار المصنفین کے قدر دانوں، معترفوں اور شکر گذاروں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے کہ قدر دانی، تعریف اور شکر گذاری اپنی جگہ بہت اچھی چیزیں ہیں لیکن ان سے نہ چکی کی بھٹی گرم ہوتی ہے، نہ بھاپ بنتی ہے، نہ گاڑی چلتی ہے، اس عالم مادی میں ذہنی اور روحانی کاموں کے لیے بھی مادی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ہم آپ واقعی دار المصنفین کے قیام کو علم و ادب اور ملک و قوم کے لیے مفید اور اہم سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے اور یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض ذاتی ہے کہ قدمے اور سخنے سے آگے بڑھ کر درمے اس کی مدد دل کھول کر کریں، مجھے امید ہے کہ ارباب علم و دانش زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی مطبوعات کے مستقل خریدار بنیں گے، اور ارباب حکومت واقتدار گرواس پر آمادہ کریں گے

کہ انھیں مدرسوں کے کتب خانوں اور عام کتب خانوں کے لیے خریدیں، یہ کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ ایک اچھا سودا جس میں چاندی کے چند ٹکڑوں بلکہ کاغذ کے چند پرزوں کے بدلے علم و حکمت کی دولت ہاتھ آتی ہے، جو بے بہا اور لازوال ہے۔"

ذاکر صاحب نے دارالمصنفین کے حقوق کی وکالت کرنے کے بعد ایک مخلص بزرگ، ایک وطن پرست اور ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے اس ادارہ کو اس کے فرائض سے بھی آگاہ کیا، ناظرین کو حسب ذیل اقتباسات میں فلسفیانہ فکر، مورخانہ نظر، ثقافتی بصیرت اور ایک مخلص رہنما کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ادب و انشا کی چاشنی اور لذت بھی محسوس ہوگی۔

"آخر میں چند الفاظ دارالمصنفین کے ارکین اور رفیقوں سے کہنا چاہتا ہوں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے آپ کی تصنیف و تالیف کا ایک خاص میدان ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ اور اسکی ایک امتیازی خصوصیت قلب و نظر کی وسعت ہے یعنی مختلف تہذیبوں اور معاشروں کی مثبت اور موثر اقدار کا اعتراف کرنا، ان کے اختلافات میں اشتراک اور اتحاد کے نقطے تلاش کرکے انھیں نمایاں کرنا، آپ کی یہ خصوصیت ہمارے دور محکومی میں جب تاریخ سیاسی مصلحتوں کے ماتحت مسخ کی جارہی تھی، بہت کام آئی لیکن آپ یہ نہ سمجھئے کہ اس دور آزادی میں تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلۂ کار بنانا ختم ہوچکا ہے، آج یہ رجحان باقی ہے اور خاصا قوی ہے، آج بھی دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا، ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی اور آیندہ بھی ہوتی رہے گی، جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہوجائے، اس لیے آپ کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ آپ کی سعی ابھی ناتمام اور آپ کا کام ابھی ادھورا ہے۔ آپ کو اور زیادہ محنت، ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ جد و جہد کرنی ہے تاریخ نگاری کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرون وسطیٰ میں ہند و مسلم تہذیبوں کے اپنے اپنے دائرے تھے لیکن ان میں ایک مشترک خطہ بھی تھا جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا تھا ابھرا

لب ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ زبردستی تاریخ سے کام لیں، یہ نہ تو دیانتدار مورخوں کی
یت سے آپ کے لیے جائز ہوا اور نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اسکے ثبوت تاریخ
غوں پر بکھرے ہوئے ہیں، صرف انھیں جمع کرلے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے، میرا یہ پختہ خیال ہے جسے
نظریہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا، لیکن ذہنی عقیدہ کہہ سکتا ہوں کہ صرف ہندوستان میں ہندو مسلم
ں ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا، تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں، بلکہ
ں ٹکرایا کرتی ہیں، انسان کا وجود اس دنیا میں اربوں سال سے ہے، اس میں سے تہذیب کے چند ہزار
نکال دیجئے تو باقی سارا زمانہ وحشت کا زمانہ تھا، اس لیے آج اُن افراد اور قوموں میں جنھیں ہم
ب کہتے ہیں، تہذیب کی ایک ہلکی سی پرت کے نیچے نہ جانے کتنی پرتیں وحشت کی دبی ہوئی ہیں جو موقع
ابھر آتی ہیں، دو قوموں کی تہذیبیں جب تک اپنی اپنی وحشتوں کو دبائے ہوئے ہیں، آپس میں لڑتی نہیں
ملتی ہیں اور تہذیبی قدروں کا لین دین کرتی ہیں، مگر جب انکی وحشتیں انکی تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں
تہذیب دوسری تہذیب سے بھڑ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو نوچنے، کاٹنے اور بھنبھوڑنے لگتی ہیں۔
ن کے خطبہ کے آخری ٹکڑے میں بڑی مخلصانہ اور ہمدردانہ اپیل تھی، جو نہ صرف دار المصنفین کے
رے ہندوستان کے اہل علم کے لیے ہے:

"آپ سے میری یہ التجا ہے کہ وحشتوں کی روداد دوسروں کے لیے چھوڑ دیجئے، آپ تہذیبوں
نا لکھئے اور نئے ہندوستان کے ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے
رح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے
ا وہ ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کرے جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لیے درکار ہے اور
ب وطن کو ایسی مہذب انسانی برادری کا گھر بنانے میں ہاتھ بٹائیے جس کے صدر دروازہ
کی یہ رباعی رقم ہو:

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
دنیا کو جو کہتے ہیں جہنم ہے یہ وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ان چند لفظوں کے بعد جنھیں کسی مہمان خصوصی کا رسمی خطبہ نہیں بلکہ ایک محب مخلص کے دل کی آواز سمجھئے، میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کے جشن طلائی کا افتتاح کرتا ہوں"۔

یہ خطبہ بار بار تالیوں کی گونج سے سراہا گیا، اور جب یہ ختم ہوا تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ یہ تمام خطبات کا تاج محل ہے، اس کا یہ فقرہ ہر شخص کی زبان پر تھا

"تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتی ہیں، وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں"۔

ذاکر صاحب نے اس افتتاحیہ اجلاس میں دارالمصنفین کے لیے اپنی حکومت کی طرف سے پچاس ہزار کے عطیہ کا بھی اعلان کیا، اسی کے ساتھ ان کے عزیز دوست کرنل بشیر حسین زیدی سیدنا سیف الدین طاہر کی طرف سے بارہ ہزار جناب مصطفیٰ رشید شروانی کی طرف سے تین ہزار، اور حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی کی جانب سے ایک ہزار کے چک پیش کئے جو ذاکر صاحب کی خواہش ہی پر حاصل کئے گئے تھے، پھر ان ہی کی موجودگی میں مسز سچیتا کرپلانی نے حکومت اتر پردیش کی طرف سے دس ہزار کی گرانٹ کا اعلان کیا، بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی دس ہزار روپئے کا عطیہ دیا، سعودی عرب کے سفیر محترم نے رابطۂ اسلامیہ کی طرف سے پانچ ہزار کی رقم کا اعلان کیا، دس ہزار کی گرانٹ حکومت کشمیر کی طرف سے بھی ملی، اس سے پہلے طلائی جوبلی کے سلسلہ میں بھوپال میں مولانا عمران خاں صاحب ندوی نے ایک ایک ہزار کے بارہ لائف ممبر بنائے تھے، جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری اور سید شہاب الدین دیسنوی صاحب نے اپنی مساعی جمیلہ سے بمبئی میں ایک ایک ہزار کے چالیس ممبر بنا کر اس ادارہ کو غیر معمولی امداد پہنچائی، اسی موقع پر پاکستان کی طرف سے پچیس ہزار کی کتابوں کی خریداری کا اعلان ہوا، دو ہزار روپئے کویت سے جناب ڈاکٹر عبداللطیف نے اس جشن کے لیے بھیجے، پھر ڈاکٹر

حمید اللہ نے فرانس سے ایک ہزار روپے کا عطیہ بھیجا، اس طرح ذاکر صاحب کے قدموں کی برکت سے دارالمصنفین کو تقریباً ایک لاکھ اکاسی ہزار کی امداد پہنچ گئی۔

جوبلی کے افتتاحیہ اجلاس کے بعد مسز سچیتا کرپلانی کو اس، راقم نے ایک سپاسنامہ پیش کیا جس میں ذاکر صاحب بھی سامعین کی حیثیت سے شریک رہے، پھر شبلی منزل کے لان پر ایٹ ہوم ہوا، ذاکر صاحب مسز سچیتا کرپلانی، بیگم صاحبہ بھوپال، سفرا اور وزراء کو دیکھنے کے لیے اتنا ہجوم ہو گیا تھا کہ ان کو قابو میں رکھنا مشکل تھا، لیکن ضلع کے کلکٹر شری ماڈول اور ایس، پی شری بھلا نے بڑی خوش اسلوبی سے مجمع کو قابو میں رکھا، ذاکر صاحب ان تقریبوں میں سب سے بہت ہی بے تکلفی سے ملے، کہیں سے ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ نائب صدر ہیں، اعظم گڈھ کے ان لوگوں سے بھی ملے جنھوں نے تقریباً چالیس برس پہلے جامعہ ملیہ کو ان کے یہاں آنے پر چندہ دیا تھا، ایٹ ہوم کے بعد وہ اپنے خیمہ میں چلے گئے، لیکن مغرب کی اذان ہوئی تو شبلی منزل کی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کو آئے، وہ وہاں اس وقت پہنچے جب مسجد بھر چکی تھی، ان کو تقریباً نعلین کے پاس جگہ ملی اور اس جشن کا محمود ایاز کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز ادا کر رہا تھا،

رات کو ایک سمپوزیم تھا جس میں سعودی عرب کے سفیر، مولانا طیب مہتمم دیوبند، ڈاکٹر یوسف حسین پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کی تقریریں تھیں، ان تقریروں میں رات کافی گذرتی جارہی تھی، ذاکر صاحب کے آرام کی خاطر میں بار بار ان سے کہتا تھا کہ وہ اٹھ کر تشریف لے جائیں، لیکن وہ فرماتے کہ میں ان تقریروں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں، اور وہ آخر تک بیٹھے رہے، بہت رات گئے اپنے خیمہ میں سونے گئے، رات کے تین بجے ہوں گے کہ سخت آندھی آئی، میری آنکھ کھلی تو خیال آیا کہ ذاکر صاحب کا خیمہ گر گیا ہوگا ایک صاحب دوڑے آئے اور بولے کہ ذاکر صاحب کا خیمہ گر گیا، اور وہ غسل خانہ میں پناہ لیے ہوئے ہیں،

میں شدید مضطرب ہوا کہ ساری محنت ضائع گئی، دوڑ کر خیمہ کے پاس پہنچا، اس کا ایک ستون تو ضرور جھک گیا تھا لیکن خیمہ محفوظ تھا، اندر سے ذاکر صاحب کی کوئی آواز نہیں آئی، تو میں نے اندر جانا پسند نہیں کیا، صبح ہوئی تو مضطربانہ طور پر ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا، بولے کہ مجھکو آندھی کی تو خبر بھی نہیں ہوئی اور میں بالکل غافل سویا، یہ محض ان کے اقبال کی کرامت تھی۔

صبح کو بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں جناب شاہ معین الدین صاحب نے ایک سپاسنامہ پیش کیا، ذاکر صاحب نے اس میں بھی شرکت فرمائی، اسی کے بعد ایک ادبی نشست تھی جس میں مولانا عبد الماجد دریابادی، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، ضیاء الحسن فاروقی پروفیسر جامعہ ملیہ کالج نے اپنے اپنے مقالے پڑھے مولانا عبد الماجد دریابادی کا مقالہ مولانا شبلی پر تھا جس کو نہ صرف عام حاضرین بلکہ خود ذاکر صاحب نے بہت پسند کیا، اور مولانا عبد الماجد دریابادی کو اس کی داد دی، ان کی روانگی اسی دن کے سہ پہر کو تھی، اسلیے میں اس نشست کے آخر میں شکریہ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا، اس جشن کی کامیابی پر اتنا خوش تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور ان ہی آنسوؤں کی لڑیوں میں مشکل سے یہ کہہ پایا کہ میری زندگی کی تمنائیں یہ تھیں کہ مصنف بنوں، مولانا سید سلیمان ندوی کا شاگرد بن کر دار المصنفین کا ادنیٰ خدمتگذار بنا رہوں اور دار المصنفین کی طلائی جوبلی کا جشن اپنے محترم بزرگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں انجام دوں، یہ ساری تمنائیں پوری ہوگئیں، اگر ذاکر صاحب اپنے ہوائی اڈے پر پہنچ کر میری وفات کی خبر سنیں تو وہ میرے لیے کوئی غم نہ کریں۔

ذاکر صاحب کے جانے کے بعد رات کو ایک مشاعرہ بھی آنند نرائن ملا کی صدارت میں ہوا جس میں روش صدیقی، جگناتھ آزاد، حبیب احمد صدیقی، عارف عباسی اور کوثر فاروقی وغیرہ جیسے منتخب شعراء شریک ہوئے، دوسرے دن صبح کو تمام مہمان رخصت ہوگئے، اس جشن میں کچھ مہمانوں کو ضرور تکلیف ہوئی ہوگی لیکن جتنے آئے، وہ سب دار المصنفین کے مخلص اور قدردان تھے، اس لیے کسی نے

کوئی شکایت نہیں کی، شاہ معین الدین اور ہم دونوں بے انتہا خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی آبرو رکھ لی، اس جشن کو ہر طرح کامیاب کیا، یہ ذاکر صاحب کے محبت و اخلاص کا بھی نتیجہ تھا جو ان کو دار المصنفین سے برابر رہا، جشن کے دوسرے دن کے لنچ میں ایک بیرونی مہمان نے ذاکر صاحب کی موجودگی میں کہا کہ یہ جوبلی جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی ہی کے مقابلہ کی ہے، کرنل بشیر حسین زیدی نے سنکر فرمایا، جی نہیں، اس سے بہت بڑھی ہوئی، جامعہ کی سلور جوبلی جب ہوئی تھی تو میں رامپور کا وزیر اعلیٰ تھا، میں نے ریاست کا سارا سامان وہاں بھجوا دیا تھا، حتیٰ کہ وہاں کے بہشتی اور بھنگی بھی گئے تھے لیکن دار المصنفین کے قناعت پسند بوریانشینوں کی طرف سے جوبلی کی اس آرائش و زیبائش کو دیکھ کر میں خود متحیر ہوں، وہ ہر طرح کی تعریف کے مستحق ہیں،

ذاکر صاحب گلابوں کے بڑے عاشق زار تھے، اس لیے جوبلی کے جشن کے موقع پر گلابوں کے پھولوں کی بھی ایک نمائش کا انتظام کیا گیا تھا، یہ اہتمام محبی خلیل الرب صاحب (انسپکٹر آف اسکولز) نے کیا، ذاکر صاحب نے ان میں سے بعض گلابوں کو بہت پسند کیا، اور اپنے چمن کے لیے انکے پودے مانگے جو اکتوبر ۱۹۶۵ء ہی میں تیار ہوگئے، میں نے یہ پودے ان کے پاس بھیجے تو ایک مکتوب مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں تحریر فرمایا: "نوازش نامہ ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، گلاب کے ۱۲ پودے بھی پہنچے کس طرح شکریہ ادا کروں، کسی اور تحفہ سے جی اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا اس سے ہوا خلیل الرب صاحب کا بھی میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجئے۔"

ان کو گلابوں سے جو عشق رہا تو غیر شعوری طور پر وہ گلاب کی دل آویزی، رعنائی اور خوشبو زندگی کے ہر پہلو میں چاہتے تھے، اور وہ جہاں کہیں پاجاتے اس سے ایسے ہی خوش ہوتے جیسے اپنے چمن میں گلاب کی رنگینی اور خوبصورتی کو دیکھکر ہوتے،

جوبلی کے جشن منانے کے چھ مہینے کے بعد یعنی ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان کی جنگ چھڑ گئی، اس وقت سے ابتک ہند و پاکستان کا تجارتی لین دین بند ہے، اسلیے دار المصنفین کی کتابوں کی تجارت کا توازن بالکل بگڑ گیا ہے، پاکستان کے بعض خود غرض ناشروں نے تجارتی لین دین بند ہونے کی وجہ سے اس کی

بہت سی کتابیں چھاپ لی ہیں جس سے اس پر مزید مالی ضرب کاری لگ رہی ہے، اگر اس کی جوبلی نہ ہوئی ہوتی اور ذاکر صاحب کے حسن وساطت سے اس کو عطیات نہ ملے ہوتے تو اس وقت تک معلوم نہیں یہ کن کن پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہوتا، اس لحاظ سے بھی ذاکر صاحب اس کے بڑے محسن ہیں، ان سے جب ملاقات ہوئی تو اس کے مالی استحکام کی تدبیریں بتاتے رہتے، ان کا سہارا لے کر حکومت ہند سے اس کے لیے مستقل سالانہ امداد حاصل کرنا ممکن تھا، مولانا ابو الکلام آزاد کی خواہش تھی کہ یہ سالانہ گرانٹ منظور کرلے کیونکہ انگریزوں کی طرح اب غیر ملکی حکومت نہیں ہے بلکہ قومی حکومت ہے، لیکن انکی خواہش کے باوجود سالانہ امداد لینا منظور نہیں کیا گیا، کیونکہ اسکے بعد ادارہ کے علمی مزاج کے بدل جانے کا خطرہ رہا،

فروری ۱۹۶۶ء میں ذاکر صاحب کے بھتیجے امتیاز حسین کا اچانک حیدرآباد میں انتقال ہو گیا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ جامعہ ملیہ کے قیام کے زمانہ میں میری ان سے گہری ملاقات ہو گئی تھی، ان کی وفات سے مجھکو بھی صدمہ ہوا، اور میں نے ایک تعزیتی خط ذاکر صاحب کو لکھا، جس کا جواب انھوں نے ۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو بہت ہی غمناک انداز میں اسی طرح دیا جس طرح ایک سچے اور خداترس مسلمان کو دینا چاہئے،

"آپ کا تعزیت نامہ ملا، آپ کی ہمدردی کا دل سے شکر گذار ہوں، خدا کی مرضی یوں ہی تھی، اس پر صابر و شاکر ہونا چاہیے، یوں صدمہ میرے لیے سخت ہے، اس لیے کہ اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد مرحوم کی پرورش میرے ہی ذمہ تھی، اور وہ مجھے بیٹے سے زیادہ عزیز تھے، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا، راضی برضا ہوں۔"

ذاکر صاحب مئی ۱۹۶۷ء میں جمہوریۂ ہند کے صدر منتخب ہوئے تو دارالمصنفین میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی، ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ہم لوگوں ہی میں سے صدر بنا ہے، اور ان کو اپنوں میں شمار کرنا صحیح تھا کیونکہ وہ نہ صرف دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بہت ہی قدیم رکن تھے، بلکہ ہم لوگوں سے بزرگانہ تعلقات بھی رکھتے تھے، میں نے دارالمصنفین کی طرف سے مبارکباد کے خط اور تار بھیجے اور

اس کے بعد دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں بھی بھیجیں، اسکا جواب اپنے ایک عنایت نامہ مورخہ ۶ جون ۱۹۶۷ء میں یہ دیا۔

محب مکرم! السلام علیکم

نوازش نامہ ملا، یاد فرمائی اور دعاؤں کا شکریہ، دارالمصنفین کے اراکین اور ملازمین کا بھی انکی دعاؤں کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں، خدا آپ سب کو خوش اور اچھا رکھے

آپ نے ازراہ نوازش جو تین کتابیں مجھے بھیجی ہیں وہ مجھے مل گئی ہیں، ان تصانیف کو میں دارالمصنفین کے بیش بہا تحائف ہی سمجھتا ہوں، ان کتابوں کے لیے بھی شکریہ قبول فرمائیں، خدا کرے مزاج بخیر ہو۔ والسلام

میں نے اپنی طرف سے بھی ایک ذاتی خط لکھا تھا، اس کا جواب اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ جون ۶۷ء میں اس طرح دیا:

مجی صباح الدین صاحب۔ السلام علیکم

"آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۱۰ مئی ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، میرے صدر منتخب ہونے پر آپ نے جس خلوص اور محبت کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے دل سے شکرگذار ہوں، دعا فرمائیں کہ میں اپنے اس منصب کے فرائض کو پوری طرح انجام دے سکوں، اس سلسلہ میں مبارکباد کے خطوط اور تار اس کثرت سے آئے کہ ان سب کا جواب دینا جلد ممکن نہ ہو سکا، اس تاخیر کو معاف فرمائیے گا، شاہ معین الدین صاحب کو میرا سلام مسنون پہنچا دیں"۔

میں اگست ۱۹۶۷ء میں ایک خاص کام کے لیے دہلی پہنچا، میری لڑکی عشرت افروز بھی ساتھ تھی، میں نے ذاکر صاحب سے وقت مانگا، تو مجھکو لڑکی کے ساتھ ملنے کو بلایا، جب میں راشٹرپتی بھون پہنچا تو ملاقات کے کمرہ کے دروازہ تک لینے کو آئے، اپنی شرافت طبع اور پاکیزگی اخلاق سے میری لڑکی سے اس طرح ملے جیسے اپنی خاص عزیزہ سے مل رہے ہوں، اس کو اپنی گفتگو میں برابر بیٹی کہکر مخاطب فرمایا، چائے آئی تو

اس سے مٹھائی اور پیسٹری کھانے کے لیے اصرار کیا، ان میں راشٹرپتی بھون کی فضا کی تمکنت اور وقار کے بجائے جامعہ ملیہ ہی کا عجز اور انکسار تھا، وہ کھدر کی شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، بعض لوگ کپڑے پہنکر خوبصورت اور بارونق معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذاکر صاحب کے جسم پر خود لباس خوبصورت اور بارونق بن جاتا، اعلیٰ قسم کے مغربی وضع کے ڈرائنگ روم میں ان کا مشرقی مزاج چھایا ہوا تھا، وہ خود ہی ڈرائنگ روم کی زینت بنے ہوئے تھے، ان سے باتیں کرنے میں راشٹرپتی بھون کے ماحول کو ان کے قدیم رنگ کی حسین وضعداری سے دبا پایا، صدر کی حیثیت سے ان سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی، میں نے کئی بار جلد اٹھنے کی کوشش کی لیکن اصرار سے روکے رکھا، دارالمصنفین کی مالی حالت پوچھی، وہ جانتے تھے کہ میری صحت اچھی نہیں رہتی ہے، اس لیے صحت کو برقرار رکھنے کی نصیحت فرمائی، پھر کہا کہ شاہ معین الدین صاحب اور آپ دونوں نے مل کر دارالمصنفین کے معیار اور حیثیت کو برقرار رکھا ہے لیکن آپ دونوں اپنے پیچھے کوئی جماعت نہیں چھوڑ رہے ہیں، میں نے عرض کیا، اب پہلے کی طرح ایثار پسند اور خدمت گذار نوجوان نہیں ملتے، فرمایا کہ ہندوستان سے ایثار اور خدمت کا جذبہ ختم ہو چکا ہے، پہلے ایثار و خدمت بڑا وصف سمجھا جاتا تھا لیکن وہ دور جاتا رہا، اس لیے ایثار پسند نوجوانوں کی تلاش فضول ہے، ان کو وہی تنخواہیں دے کر رکھئے جو ہر جگہ ملتی ہیں، اور پھر ہنستے ہوئے فرمایا کہ ادارہ چلانے میں یہ ضرور ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جائیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ پاؤں دیکھ کر چادر بنائی جائے، آپ لوگوں کو اب ایسی ہی چادر بنانی ہے، اسی سلسلہ میں فرمایا کہ اس زمانہ میں صرف جماعت اسلامی والے ہی ایثار اور قربانی سے کام لے رہے ہیں، میں نے ان کی مطبوعات میں سے محسن انسانیت پڑھی ہے، یہ مجھکو بہت پسند آئی، جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو عرض کیا، آپ کی بدولت راشٹرپتی بھون کے اندر تک پہنچ گیا، اس کا جواب بڑی محبت سے یہ دیا، مگر آپ لوگوں کی دعاؤں کی بدولت میں بھی راشٹرپتی بھون میں پہنچ گیا،

وہاں سے آنے کے بعد میں ایک مرض میں مبتلا ہو گیا، جس کے اعظم گڈھ اور پٹنہ میں دو آپریشن ہوئے میں شفا پاکر پٹنہ سے اعظم گڈھ آیا تو کسی سلسلہ میں ان کو خط لکھا تو اپنی علالت کا بھی ذکر کر دیا، اسکے جواب میں اپنے ایک مکتوب مورخہ ۴ جنوری ۱۹۶۱ء میں تحریر فرمایا "مجھکو آپنے اپنی علالت کی خبر نہیں دی، میں آپکے لیے کم ازکم دعائیں تو کر سکتا تھا، خدا کرے آپ عرصۂ دراز تک توانا اور تندرست رہ کر دار المصنفین کی مفید خدمات انجام دیتے رہیں، آمین"۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں دہلی گیا تو کچھ ایسی عجلت میں تھا کہ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، اور ان سے ملے بغیر اعظم گڈھ واپس چلا آیا، تو ایسا معلوم ہوا کہ دہلی گیا ہی نہ تھا، یہاں آنے کے بعد دار المصنفین کی پانچ مطبوعات کی جلدیں ان کی خدمت میں ارسال کیں اور دہلی جانے اور خدمت میں حاضر نہ ہونے کا افسوس بھی ظاہر کیا تو اس کا جواب ایک مکتوب مورخہ ۲۵ اپریل ۶۸ء میں اس طرح دیا:۔

مجی صباح الدین صاحب! السلام علیکم

نوازش نامہ مورخہ ۱۸ اپریل بھی ملا اور دار المصنفین کی پانچ مطبوعات بھی جو آپ نے ازراہ ذاکر نوازی بھیجی ہیں، بڑی خوشی ہوئی کہ اشاعت کتب کا کام قابل اطمینان طور پر بڑھ رہا ہے، انشاء اللہ آئندہ سال بھی ۵۔ ۶ کتابیں نکل جائیں گی، آپ لوگوں کی محنت اور آپ کا انہماک قابل رشک ہے،

یہ آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے، کہیں میرے دفتر سے تو وقت دینے میں کوتاہی نہیں ہوئی یا اس کوتاہی کے خیالی اندیشہ سے آپ نے وقت ہی نہیں چاہا، آپ دہلی آئیں اور ملاقات نہ ہو، یہ تو اچھا نہیں لگتا، سب ساتھیوں کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ والسلام۔ مخلص ذاکر حسین۔

اس مکتوب کے بعض فقروں میں دل نوازی کی کیسی شمیم انگیزی ہے، جس سے معلوم نہیں میری طرح کتنے مکتوب الیہ معطر ہوتے رہے۔

مئی ۱۹۶۸ء میں راشٹرپتی بھون میں نذر ذاکر کے نام سے دو جلدیں پیش کی گئیں، اس میں میرا بھی ایک مقالہ تھا، خلاف توقع ذاکر صاحب کا ایک مکتوب مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۹ء ملا، میرا خیال ہے کہ یہ ایک مشترکہ مکتوب ہے جو انھوں نے نذر ذاکر کے ہر مقالہ نگار کو لکھا تھا، یہ دلچسپ ہے، اور میرے نام ان کا آخری مکتوب ہے، اس لیے ذیل میں درج ہے:

کرم بندہ! تسلیم

یہ شکریہ کا ناچیز ہدیہ آپ کی خدمت میں بہت دیر سے پہنچ رہا ہے، جس کے لیے دل سے معذرت خواہ ہوں، آپ نے ازراہ ذاکر نوازی "نذر ذاکر" میں اپنا گراں قدر مضمون شامل فرماکر جو کرم فرمایا تھا اس کا دلی شکریہ تقریباً ایک سال بعد پیش خدمت کر رہا ہوں، یہ کتاب سال بھر پہلے میری سالگرہ کی تقریب میں دوستوں نے مجھے عنایت فرمائی تھی، عمر بھر اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی لیکن اب دوستوں نے ایک صحیح یا غلط تاریخ کا تعین فرماکر اس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، کتاب جب ملی تو اسے پڑھنا شروع کیا، ایک دوست میری میز سے وہ نسخہ اٹھالے گئے اور حسب معمول واپس کرنا بھول گئے، اور میں بھول گیا کہ وہ کون دوست تھے۔ اس لیے انگریزی میں مضامین دینے والے دوستوں کا شکریہ تو پہلے ادا کر چکا اور اردو کا ایک دوسرا نسخہ جب مالک رام صاحب نے عطا فرمایا تو یہ معذرت نامہ لکھنے کا موقع نکلا، میں اس تاخیر کی معذرت چاہتا ہوں، اور دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

دار المصنفین کی طرف سے میں انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کے رکن کی حیثیت سے اس کے سالانہ جلسہ میں دہلی بارہ برس سے جایا کرتا ہوں، اس سال اسکا جلسہ ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو طے پایا، میں نے حسب معمول اس میں شرکت کا ارادہ کیا تو خیال ہوا کہ اس مرتبہ ذاکر صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا، ۲۱ اپریل ۱۹۶۹ء کے ایک خط میں ان کو ملنے کی تاریخ کا طالب گار ہوا، وہ ان ہی دنوں آسام کے دورہ پر جانے والے تھے، اسلیے اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ ٹیلیفون سے دریافت کر لوں گا کہ کون سی تاریخ اور وقت میں حاضر خدمت ہونا ہے، ۲ مئی کو دہلی پہنچا، اس

بھی پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے یہاں ٹھہرا، ۳ مئی کو دس بجے خانۂ ایران میں ایران کے کلچرل کونسلر جناب ہاشم کرہ دوش سے ایک ملاقات طے تھی، ان سے ملنے کے بعد تقریباً پونے گیارہ بجے وہیں سے راشٹرپتی بھون ٹیلیفون کیا کہ مجھ کو کس تاریخ اور کس وقت طلب کیا گیا ہے، سکریٹری نے بتایا کہ میرا خط فائل میں دکھا دیا گیا ہے، اب وہ راشٹرپتی سے پوچھ کر مجھ کو تھوڑی دیر میں تاریخ اور وقت بتا دیں گے، میں نے ان سے کہا کہ وہ وقت اور تاریخ دریافت کرلیں، میں چار بجے ٹیلیفون سے دریافت کرلونگا، اس کے بعد میں اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔

انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے جلسہ کے لیے آزاد بھون روانہ ہو رہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے اچانک یہ خبر سنائی کہ حرکت قلب کے بند ہو جانے سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا انتقال ہو گیا، ایسا معلوم ہوا کہ مجھ پر بجلی گر گئی، دل و دماغ پر تاریکی چھا گئی، کسی طرح آزاد بھون پہنچ گیا، جہاں اور بھی نمائندے آئے ہوئے تھے، سب ہی سوگوار تھے، جلسہ جناب صدر بی۔ ان کھوسلا اور جناب ہرشے ناتھ کنزرو کی تعزیتی تقریروں کے بعد ملتوی کر دیا گیا، دونوں نے ان کو سیکولرزم کا اعلیٰ نمائندہ بتایا، حیدرآباد سے اس جلسہ کے لیے ڈاکٹر عبدالمعید خاں صدر شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی بھی آئے تھے، ان کو بھی ذاکر صاحب سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، ہم دونوں ساڑھے پانچ بجے تک راشٹرپتی بھون پہنچ گئے، کسی نے خبر دی تھی کہ میت پانچ بجے اس کے دربار ہال میں لاکر رکھ دی جائے گی، وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سات بجے رکھی جائیگی، اندر باہر بڑا ہجوم تھا، وزراء اور سفراء، اور معززین تعزیت کے لیے برابر آرہے تھے، پھر اتنی بھیڑ ہوئی کہ ڈاکٹر عبدالمعید خاں نے کہا کہ اب میت کو دیکھنا ممکن نہ ہو سکے گا، اس لیے ہم دونوں آخری دیدار سے محروم ہو کر واپس ہو گئے۔

۴ مئی ۱۹۶۹ء کو میں جماعت اسلامی کے دفتر پہنچا، تو مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی کو بھی سوگوار پایا، وہ ذاکر صاحب کی بعض خوبیوں کے بڑے معترف تھے، وہاں سے راشٹرپتی بھون عبدالعظیم صاحب ٹونکی کے ساتھ چلا گیا، میت کی زیارت کرنے والوں کا بڑا ہجوم تھا، تقریباً ایک میل کی قطار لگی ہوئی تھی، بڑی مشکل سے دربار ہال پہنچا، میت گلاب کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی، دیکھ کر آنکھیں نمناک ہو گئیں کہ ہندوستان کا گل سرسبد، سکولرزم کا گل لالہ، راشٹرپتی بھون کا سرو رعنا نہیں بلکہ مغل گارڈن کا گل رعنا آج ان پھولوں کے نیچے بے جان پڑا ہے، چہرہ کھلا تھا،

اسکی طرف نظر اٹھی لیکن جھک گئی جس شکیل اور وجیہہ چہرہ پر شروع میں مقصد حیات کی بلندی، قلندری کا بانکپن، محبت کی قوس قزح، اخلاص کی شفق، علم کی گہرائی اور آخر میں شاہانہ ماحول میں پُر از عظمت انکسار دیکھا تھا، اسکو بے حس و حرکت دیکھا نہیں گیا، انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز کانٹوں کے سیج پر لیٹ کر کیا تھا۔ دنیا ان کو پھولوں کے سیج پر سلا کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے لیکن اس وقت رونے والوں کی کمی نہ تھی، جو میرے آنسوؤں کی کوئی قیمت ہوتی، میت کے پاس قرآن خوانی ہو رہی تھی، میں بھی شریک ہو گیا، عصر کا وقت آیا تو ہال میں اذان دی گئی، نماز باجماعت ادا کی گئی، اس دربار ہال میں کبھی تکبیر کی آواز بلند نہیں ہوئی ہوگی، کلام پاک بھی نہ پڑھا گیا ہوگا، نماز کی برکت سے بھی متبرک نہ ہوا ہوگا لیکن ذاکر صاحب کی بدولت یہ ہال کئی روز تک کلام الٰہی سے گونجتا رہا، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں نے بھی اپنے اپنے مذہبی گیت گائے، لاش کی نگرانی ذاکر صاحب کے بڑے داماد خورشید احمد صاحب کر رہے تھے، بے انتہا مغموم تھے، میں نے ان سے اظہار تعزیت کرنا چاہا لیکن میری تعزیت کی کیا قدر ہو سکتی تھی، جب دنیا کے مشاہیر کے تعزیتی پیام انکے پاس پہنچ رہے تھے، پھر بھی بے اختیار ہو کر ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، مشکل سے ایک دو جملے کہہ پایا، وہاں سے لوٹا تو جماعت اسلامی کے اخبار دعوت کے اڈیٹوریل پر نظر پڑی، جس کے کچھ ٹکڑے یہ تھے:۔

> "ڈاکٹر صاحب کے انکار سے بہت لوگوں کو اختلاف رہا ہوگا، یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں لیکن انکی مرنجاں مرنج طبیعت، انکی ملنساری اور تواضع، انکا علمی وقار اور تہذیبی انکسار، تعمیری کاموں سے انکی لگن جس چیز کو صحیح سمجھا اس کے لیے ایثار اور قربانی کی راہ اپنا لی مرحوم کی یہ خوبیاں تھیں جنہیں انکے بعد بھی یاد رکھا جائیگا............"

ابھی آپ ناگالینڈ اور آسام ہو گئے ہوئے تھے، اس موقع پر گوہاٹی میں اپنے ایک شاگرد حسنین سید سے ملاقات کے موقع پر جو بات چیت کی وہ آپ کی دین پسندی کے رجحان کی شاہد ہے حسنین سید صاحب نے ملاقات کے موقع پر آپ سے شکایتاً کہا کہ آج جمعہ کا دن ہے، یہ صحیح ہو کہ مسافر پر جمعہ واجب نہیں ہو، پھر بھی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کا پروگرام آپ بنا لیتے تو لوگوں کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع مل جاتا، اپنے شاگرد کی یہ شکایت سنکر جواب دیا، افسوس کیا بتاؤں

میرے دونوں گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے، تحیات و درود پڑھنے کے لیے جس طرح بیٹھا جاتا ہے میں نہیں بیٹھ سکتا، اپنی قیامگاہ پر چوکی پر بیٹھ کر پاؤں لٹکا کر نماز پڑھ لیتا ہوں، مسجد میں یہ صورت نہیں ہو سکتی، سال میں عید کے موقع پر جب عیدگاہ میں نماز پڑھنے جاتا ہوں تو بڑی تکلیف سے نماز ادا کرتا ہوں"۔ (روزنامہ دعوت مورخہ ۸ مئی ۱۹۶۹ء)

ذاکر صاحب کے بہار کی گورنری کے زمانہ کے ایک سکریٹری کا بھی ایک تعزیتی بیان شائع ہوا کہ وہ جب تک وہاں گورنر کے عہدہ پر فائز رہے، پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کرنے کے عادی رہے،

انکی وفات پر بے شمار بیانات نکلے، تمام اخباروں نے اڈیٹوریل لکھے، مضامین شائع کیے، بڑے بڑے جلسے ہوئے، مؤثر اور دلگداز تقریریں ہوئیں لیکن اوپر صرف ایک اداریہ اور ایک بیان کا ذکر اسلیے کیا گیا ہے کہ دنیا میں تو ان کو ہر قسم کا اعزاز ملا، سفر آخرت کے لیے بھی اگر کوئی زاد راہ چاہیئے تھا جس سے وہ خالی نہیں گئے۔

۵ مئی کو پانچ بجے سہ پہر کو راشٹرپتی بھون میں جنازہ کی نماز کا اعلان ہوا، بڑا ہجوم تھا، فوجوں کا زبردست پہرہ تھا، میں بھی مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی اور ان کے ہمراہیوں کے ساتھ بڑی مشکل سے راشٹرپتی بھون پہنچا جہاں میدان سواروں، فوجیوں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے نمایندوں اور حکومت کے وزیروں اور عہدیداروں سے بھرا پڑا تھا، اس سرکاری تقریب میں کلمہ طیبہ کی آواز بھی فضا میں گونج رہی تھی، دربار ہال سے جنازہ باہر آیا، سرکاری قاعدہ کے مطابق اکیس توپوں کی گونج میں سواروں نے سلامی دی، جنازہ کی نماز دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب نے پڑھائی، اور جب جنازہ سرکاری اعزاز کے ساتھ بحری، بری اور ہوائی فوج کے جلو میں روانہ ہوا تو فضا یہ کہہ رہی تھی کہ یہ صرف صدر جمہوریہ ہند کا جنازہ نہیں بلکہ صحیح معنوں میں انسانی قدروں کی معرفت حاصل کرنے والے، مشرق و مغرب کی خوبیوں کو اپنے میں سمونے والے، اسلامیت اور قومیت کے حسین امتزاج کا خواب دیکھنے والے، ہندو مسلم کا اتحاد دل سے چاہنے والے، رواداری، فراخدلی اور یکجہتی کے لیے قلب و جگر میں تڑپ رکھنے والے، شرافت، اخلاق کو اپنی وضعداری اور شائستگی سے جلا دینے والے، لینت، محبت اور اخلاص میں نکھار پیدا کرنے والے کا بھی جنازہ ہے،

۸ مئی ۱۹۶۹ء کی شام کو مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی کے ساتھ جامعہ نگر جا کر انکی مرقد پر حاضری دی،

وہاں جامعہ ملیہ کے بہت سے لوگ موجود تھے، ان میں سب سے زیادہ مغموم ڈاکٹر عابد حسین صاحب تھے، جو ذاکر صاحب کے بہت ہی قدیم دوست اور ساتھی ہیں، انھوں نے جامعہ ملیہ کے پرانے دور کی تنگی اور عسرت کے کچھ واقعات سنائے، اور جب میں قبر کے پاس کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھنے لگا تو دل کہہ رہا تھا کہ وہ جب تک زندہ رہے ان میں درخشاں ہوا کی آب و تاب رہی، بلکہ وہ کوہ نور بنکر چمکے، وہ تہذیب و ثقافت کے ایک شاندار باب بھی تھے، بہت سی حسین اداؤں کے ایک گلدستہ بھی، زندگی کی رعنائیوں کے ایک چمن بھی لیکن آہ! اب مٹی کے تودوں کے نیچے ابدی نیند سو رہے ہیں، انکی زندگی کی الف لیلیٰ تو ختم ہو گئی لیکن وہ اپنے پیچھے اپنی یادوں کی ایک انجمن چھوڑ گئے ہیں جس میں معلوم نہیں انکی کتنی نیکیوں اور خوبیوں کی شمع برابر فروزاں رہیگی، انھوں نے اپنی زندگی میں جامعہ ملیہ میں اسلامی اور قومی قدروں کے نور کے جوت جگائے تھے، امید ہے کہ ان کی زندگی کے بعد بھی ان کا مرقد جامعہ ملیہ کے لیے روشنی کا مینارہ بنا رہے گا، اسی کے پاس ان کے ایک اور پرانے ساتھی ارشاد حسین صاحب سابق رجسٹرار جامعہ ملیہ نے بتایا کہ انھوں نے آخر زمانہ میں کلام پاک بھی حفظ کرنا شروع کر دیا تھا، یہ سنکر خوشی ہوئی کہ ان کے سفر آخرت کے زاد راہ کا بھی شاید پورا انتظام ہے،

۸ مئی کی صبح کو جناب سید حسن صاحب ایم اے علیگ کے ساتھ ذاکر صاحب کے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین صاحب سے ملا، جو اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین کی تیمارداری کے لیے ولنگڈن اسپتال میں تھے، موخر الذکر کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اپنے محبوب بھائی اور فخر خاندان کے جنازہ میں شرکت کے لیے دہلی آئے تو میت دیکھکر ایسے بے قرار ہوئے کہ ان پر قلب کا شدید دورہ پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے، یہ تحریر لکھتے وقت خدا کے فضل و کرم سے بہتر ہیں، ڈاکٹر یوسف حسین کے دل میں اپنے مرحوم بھائی کی جو عزت و محبت تھی، اس کا اندازہ انکی حسب ذیل تحریروں سے ہوگا جو ذاکر صاحب کی زندگی ہی میں ان کی دلچسپ تصنیف "یادوں کی دنیا" میں لکھی گئیں:

"جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنا یا دیکھا ہے وہ انکے خشوع و خضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں، اپنے قریب ترین عزیز سے بھی، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی انھیں عبادت کرتے ہوئے دیکھے، میں سمجھتا ہوں یہ ان کے اخلاص و عقیدت اور بے تصنع زندگی کا اقتضا ہے،"

...... ذاکر میاں کی نجی زندگی ہمیشہ آئینہ کی طرح پاک صاف رہی ہے، اس میں ہر بات ظاہری، کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں، جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، انکی سیرت کے اوصاف پبلک زندگی اور نجی زندگی دونوں ہی میں یکساں ہیں، وہی سادگی، وہی بے ساختگی، وہی نمائش سے گریز، وہی ملنساری، وہی محبت کا نبھاؤ، وہی وضعداری اپنوں سے بھی اور پرایوں سے بھی، وہ ایک شفیق باپ، ایک دردمند بھائی، ایک مخلص دوست ہیں، ہر حالت میں آدمی ان پر بھروسہ کرسکتا ہے .... انھوں نے جس طرح فقر میں شاہی کی، بلند نگاہی نہیں چھوڑی، اسی طرح شاہی میں فقر کے آداب کا احترام کرتے ہیں، جہاں بھی رہے مقبول اور محبوب رہے، جو ان سے ایک مرتبہ مل گیا، انکی دلنواز شخصیت سے مسحور ہوگیا ...... بلاشبہہ ذاکر میاں فخرِ خاندان تو ہیں ہی، لیکن اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہیں، ان کی شخصیت کی حدود خاندان کے باہر بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں، ان کی روح کی روشنی سے بہت سارے دل اور بہت سی محفلیں منور ہیں، اگر انھیں فخرِ قوم کہا جائے تو یہ زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا، وہ اپنی ذات سے انجمن ہیں، اور بہت سی انجمنیں ان کی ذات سے فیضان حاصل کر رہی ہیں، ہمیں اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ یہ چراغ جس سے بہت سی انجمنیں روشن ہیں، ہمارے گھر کا چراغ ہے، بقول شاعر

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند"

۶ مئی کو دار المصنفین واپس آیا تو جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے ساتھ یہاں کے ہر فرد کو سوگوار اور مغموم پایا، اس لیے کہ وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے نہ صرف بہت ہی قدیم رکن تھے، بلکہ اس کے بہت بڑے محسن بھی تھے، یہ تحریر ختم کرتے وقت دل سے دعائیں نکل رہی ہیں کہ بار الٰہا! ان کو اپنی آغوش رحمت میں لینا، تیری بنائی ہوئی دنیا میں عاجز بندوں ہی سے نہیں بلکہ بڑے بڑے حکمرانوں، رہنماؤں اور عظیموں سے بھی خطائیں ہوتی رہی ہیں، لیکن تیری ستاری اور غفاری میں کمی نہیں ہوتی، تجھ کو بعض

اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں پسند ہو جاتی ہیں، ان ہی سے تیری رحیمی اور کریمی حرکت میں آجاتی ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ بزرگوں نے سلطان محمود غزنوی کو اس کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا، پوچھا اللہ تعالی نے تمھارے ساتھ کیا معاملہ کیا، جواب دیا، ایک رات میں کسی قصبہ میں مہمان تھا جس مکان میں ٹھہرا تھا وہاں طاق میں قرآن شریف کا ایک ورق رکھا ہوا تھا، میں نے خیال کیا، یہاں ورق مصحف رکھا ہوا ہے، سونا نہ چاہیے، پھر دل میں خیال آیا کہ ورق مصحف کو کہیں اور رکھوا دوں، اور خود یہاں آرام کروں، پھر سوچا کہ بڑی بے ادبی ہوگی اگر اپنے آرام کی خاطر ورق مقدس کی جگہ تبدیل کروں، اس ورق کو دوسری جگہ نہ بھیجا، تمام رات جاگتا رہا، میں نے کلام پاک کے ساتھ جو ادب کیا، اسی کے بدلے حق تعالی نے مجھکو بخش دیا۔ (دلیل العارفین مجلس پنجم)۔ ہندوستان کے غلام خاندان کا حکمران شمس الدین التمش بڑا دیندار بادشاہ گذرا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے روایت ہے کہ لوگوں نے اس کی وفات کے بعد اس کو خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ خداوند تعالی نے تمھارے ساتھ کیا کیا، تو اس نے جواب دیا کہ میری بخشائش اس حوض کی بدولت ہوئی جو میں نے دہلی میں لوگوں کو شیریں پانی فراہم کرنے کے لیے کھدوایا۔ (فوائد الفواد، ص ۱۱۹)۔ بارالہا! ذاکر صاحب سے ضرور بشری لغزشیں ہوئیں، ممکن ہے کہ ان سے تیرے احکام کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہو، لیکن تیرے بندوں کی نگاہوں میں ان میں بہت سی نیکیاں، خوبیاں اور اچھائیاں تھیں، اے بندوں کی خطاؤں اور لغزشوں کو درگذر کرنے والے آقا! تو بڑا ہی غفور الرحیم ہے دعا ہے کہ ان کی بھی کوئی ادا، اور کوئی بات تیری بارگاہ میں قبول ہوگئی ہو، اور وہ تیری رحمتوں کی کوثر، برکتوں کی تسنیم اور شان کریمی کی سلسبیل سے سیراب ہو رہے ہوں۔ آمین ثم آمین۔

مطبوعات جدیدہ

صحیفہ غالب نمبر:- مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی و کلب علی خاں فائق صاحبان، متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ صفحات ۵۰۰ مع عمدہ سرورق، قیمت ع۵، پتہ مجلس ترقی ادب ۲ کلب روڈ، لاہور۔

غالب کی صد سالہ یادگار میں پاکستان کے رسالوں نے بھی خاص نمبر نکالے ہیں، ان میں "مجلس ترقی ادب لاہور" کے مشہور علمی و ادبی رسالے "صحیفہ" کا غالب نمبر بہت ممتاز اور غالب کے عہد، ان کی شخصیت و سوانح اور فنی کمالات کے متعلق محققانہ اور معلومات افزا مضامین کا اچھا مجموعہ ہے، "آبحیات" کے اصل مسودہ میں ملا محمد حسین آزاد نے جو اضافہ و ترمیم اور اصلاح کی تھی اور جو ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا، ان کے نبیرہ آغا محمد باقر نے اس کا وہ حصہ جو غالب کے متعلق ہے۔ اس نمبر میں مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، غالب کے مخصوص ادبی نظریات کے سلسلہ میں "مختصات نثر غالب" (نجم الاسلام) اور "غالب اور ذال معجم" (سید قدرت نقوی) محققانہ مضامین ہیں، آخر الذکر میں ذال معجم کے متعلق غالب اور ان کے مخالفین کے نقطۂ نظر کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس کا منصفانہ محاکمہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر عندلیب شادانی نے دکھایا ہے کہ غالب "آئین اکبری" کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، لیکن خود ان کی تصنیف "پنج آہنگ" میں اس کے اثرات موجود ہیں۔ غالب کی فارسی اور اردو شاعری کے متعلق محمد منور، ڈاکٹر وزیر آغا اور نظیر صدیقی کے مضامین قابل ذکر ہیں، اکبر خاں کے مضمون "بسلسلۂ غالب" سے بعض مفید اور

نئے معلومات حاصل ہوتے ہیں، چند مضامین میں غالب کے عہد، خطوط نگاری کی خصوصیات، تاریخ گوئی میں ان کے مرتبہ اور اس زمانہ کی صحافت کا ذکر ہے، مرتضیٰ حسین نے منشی نولکشور سے غالب کی ملاقات اور تعلقات کی سرگذشت بیان کی ہے، اور اردو اخبار کی تحریروں کی روشنی میں ان کی بعض غزلوں، خطوط اور کتابوں کی تاریخ اشاعت کی تعیین کی ہے، گو اس نمبر کے بعض مضامین فروغ اردو کے نمبر میں جو پہلے شائع ہوا تھا، آچکے ہیں، تاہم اس سے اس کی قدر و قیمت میں فرق نہیں آتا، اور غالب کے متعلق یہ مفید مواد و معلومات کا اچھا مجموعہ ہے اور بیشتر مضامین محققانہ، پُرمغز اور سنجیدہ ہیں۔ ان سطروں کے لکھے جانے کے بعد دوسرا حصہ بھی جو سوا سو صفحات پر مشتمل ہے، موصول ہوگیا، اس میں بھی غالب کی شاعری اور شخصیت کے بعض پہلوؤں پر کئی مفید اور دلکش مضامین ہیں، ابن فرید، افتخار جالب، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے مضامین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس حصہ کی قیمت دو روپئے ۲۵ پیسہ ہے، اس کا تیسرا حصہ جولائی میں شائع ہوگا۔

اردو غالب نمبر:- مرتبہ جمیل الدین عالی و شفق خواجہ صاحبان، متوسط تقطیع، کاغذ معیاری، طباعت ٹائپ، صفحات ۲۴۵، قیمت ۔۔، پتہ: انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی۔

غالب نمبروں کے انبار میں جو دو چار ممتاز اور اہم نمبر شائع ہوئے ہیں، ان میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی مجلہ "اردو" کا یہ خاص نمبر بھی ہے، اس میں غالب کی شخصیت، ماحول، فکر و فن، شاعری، خطوط، تصنیفات اور تلامذہ وغیرہ کے متعلق محققانہ اور بلند پایہ مضامین ہیں، جن سے غالب کے بارہ میں بعض اہم اور نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک مضمون میں غالب کی صحیح تاریخ پیدائش کی تعیین کی گئی ہے، ایک مضمون میں غالب کے چند ایسے تلامذہ کا ذکر ہے جو صاحب تلامذۂ غالب لک رام کی نظر سے رہ گئے ہیں، یا جن کو انھوں نے غلطی سے تلامذہ کے زمرہ میں شامل کرلیا ہے، اور وہ واقعی

ان کے تلامذہ نہیں ہیں، نادم سیتا پوری نے غالب کی جانب منسوب آبحیات وغیرہ کی بعض روایتوں کی تحقیق کی ہے اور ان کو غلط ثابت کیا ہے، جلیل قدوائی نے اسی کے مرتبہ غالب کے کلام میں الحاق کی دلچسپ داستان بیان کی ہے، امتیاز علی خاں عرشی نے سبد باغ دودر کو اس نمبر میں شائع کیا ہے، اور اس کو غالب کی آخری تصنیف قرار دیا ہے، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی وغیرہ نے بعض غیر مطبوعہ تذکروں سے غالب اور ان کے تلامذہ کے متعلق معلومات فراہم کئے ہیں، ڈاکٹر عبدالغنی نے غالب کی ایک غیر معروف شرح "بوستان خرد" کا تعارف کرایا ہے، غلام رسول مہر صاحب نے ان کے بعض ہم معنی اردو، فارسی اشعار کی نشاندہی کی ہے، ان کے علاوہ غالب کے احوال، اجتماعی شعور، فارسی نظم و نثر اور شاعرانہ عظمت کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اہل قلم کے مضامین ہیں، غرض اس نمبر کے اکثر مضامین پُر از معلومات ہیں، اور یہ غالبیات کے ذخیرہ میں بیش قیمت اضافہ ہے،

غالب اور ابوالکلام:۔ مرتبہ جناب محمد عتیق صدیقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۴، مجلد مع گردپوش، قیمت ع‍ ۱ رپتہ: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو غالب اور ان کی شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، انھوں نے ان کے بعض غیر مطبوعہ قصائد و غزلیات کو ایک قلمی دیوان کی مدد سے الہلال و البلاغ کی کئی قسطوں میں شائع کیا تھا، اور اسکی تمہید میں ان کی زندگی اور شاعری کے بارہ میں ایک مقالہ بھی لکھا تھا، یہ مقالہ اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ اس وقت غالب پر بہت کم لکھا گیا تھا، اسکے باوجود ابھی تک دوبارہ شائع نہیں ہوا تھا، اب جشن غالب کے سلسلہ میں یافتہ مکرر کو پہلی بار شائع کرنے کی سعادت مولانا کے ایک عقیدت کیش اور اردو کے شگفتہ نگار اہل قلم عتیق صدیقی صاحب کے حصہ میں آئی ہے، زیر نظر کتاب کے پہلے حصہ میں مولانا کا مقالہ اور الہلال و البلاغ میں شائع شدہ غیر مطبوعہ کلام ہے، دوسرا حصہ ان حواشی پر مشتمل ہے جو غلام رسول صاحب مہر کی کتاب "غالب" میں اضافہ

کے پیش لفظ مولانا نے تحریر فرمائے تھے، اور اسکے دوسرے اڈیشن میں چھپ بھی چکے ہیں، آخر میں غالب کے ان اردو و فارسی اشعار کو جمع کیا گیا ہے جو مولانا نے اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں، دونوں حصے فاضل مرتب کے مفید تعارفی و توضیحی حواشی سے مزین ہیں، مولانا نے مہر صاحب کی کتاب پر بے اطمینانی کے زمانہ میں نوٹ لکھے تھے، اس لیے وہ بلا ترتیب تھے اور ان میں بعض فروگذاشتیں بھی رہ گئی تھیں، فاضل مرتب نے ان کو مرتب کرکے انکی تصحیح بھی کردی ہے، کتاب کے مقدمہ میں مولانا کی غالب سے دلچسپی اور دونوں کی مشترک خصوصیات کا دلچسپ انداز میں ذکر ہے، کتاب بڑی خوش مذاقی اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے، اس کی اشاعت سے ایک اہم یادگار تحریر محفوظ ہوگئی اور غالبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا،

پیام تعلیم ذاکر نمبر:۔ مرتبہ مولوی محمد حسین حسان صاحب ندوی، اوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۸۰، قیمت ۷۰ پیسے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کا جامعہ میں ہمیشہ سے خاص اہتمام رہا ہے، اس مقصد کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی تحریک سے "پیام تعلیم" جاری کیا گیا تھا، اس میں وہ خود بھی کبھی کبھی لکھتے رہتے تھے، اس لیے یہ رسالہ درحقیقت ان ہی کی یادگار ہے، ان کی وفات کے بعد اس نے خاص نمبر نکالا ہے، یہ نمبر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے متعلق مختلف النوع آسان اور عام فہم مضامین اور نظموں کا بہت مفید مجموعہ ہے، اور اس سے بچوں سے دلچسپی، ان کے قومی و ملی خدمات، انکے تعلیمی کارناموں ان کی زندگی اور دلآویز شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں، بیشتر مضمون نگار ڈاکٹر صاحب سے قریبی تعلق رکھنے والے ہیں، اس لیے ان کے مضامین میں ڈاکٹر صاحب کی صحیح تصویر بھی ہے اور تاثیر بھی، ان کی زندگی ہر عمر کے لوگوں کے لیے سبق آموز تھی، اس لیے یہ نمبر بھی سب کے لیے سبق آموز ہے۔

'ض'

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: للعہ/

۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) " للعہ/

۳۔ اسوۂ صحابیات: " عا/

۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: غلعہ/

۵۔ حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: غلعہ/

۶۔ حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: عمر/

۷۔ شعر الہند (حصہ اول) " غلعہ/

۸۔ شعر الہند (حصہ دوم) " للعہ/

۹۔ انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ/

۱۰۔ سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیر طبع)

۱۱۔ امام رازی: امام فخرالدین رازی کی سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت للعہ/

۱۲۔ ابنِ خلدون: ابنِ خلدون کی سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت للعہ/

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی، فقہی، تاریخی، تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۲۴۶ قیمت: عہ/ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ ملک و قوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دین اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۲۳۰ صفحے، قیمت :- ۵ر

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)
اگست سنہ ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

جلد ۱۰۴ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۹ء عدد ۲

مضامین

شذرات

مغربی تہذیب، اسکی صنعتی ترقی اور سائنس کی فتوحات محض مادیات تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے عقائد وافکار کی دنیا میں بھی انقلاب پیدا کردیا ہے جس کے اثرات سے مذہب بھی محفوظ نہیں، اس نے مذہب کے متعلق بھی بہت سے نئے مسائل پیدا کردیے ہیں اور مختلف اسباب وعوامل کی بنا پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اسلام خاص طور سے اسکا نشانہ ہے، اور علم وفن کی ساری قوت اسکے مقابلہ میں لگادی ہے، اس لیے اس کا اصل مقابلہ اسلام ہی سے ہے، اس تہذیب کا ظاہری لباس اتنا دلفریب ہے اور اسکی ایجادات اور بے قید آزادی نے نفس کے مطالبات کی آسودگی اور عیش وتنعم کے اتنے سامان مہیا کردیے ہیں کہ اسکی ترغیبات سے بچنا بہت مشکل ہے، اور اسکی پشت پناہی کیلئے علوم وفنون کی پوری فوج اور سائنس کی پوری قوت موجود ہے جسکے کارناموں سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے مذہب ومعاشرت کے متعلق بھی اسکے خیالات معیار بن گئے ہیں، اور دنیا کی تمام قومیں انکو قبول کرتی اور اپنے مذہب کو انکے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھالتی جاتی ہیں جن سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں، لیکن ان دونوں میں بڑا فرق ہے، مغربی قوموں نے تو مذہب سے اپنا پیچھا چھڑالیا ہے، انکے یہاں صرف نام کے لیے مذہب رہ گیا ہے، انکی تقلید میں مشرقی قوموں نے بھی دین ودنیا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کردیا ہے، مذہب صرف عبادت گاہوں کے اندر محض رسوم تک محدود ہوگیا ہے، اسکے باہر دنیاوی امور ومعاملات میں اسکا کوئی دخل باقی نہیں ہے لیکن اسلام ایک مکمل طور پر ضابطۂ حیات ہے جس سے مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی باہر نہیں ہے۔

لیکن مغربی تہذیب اور اسکے اثرات اسقدر دنیا پر چھا گئے ہیں کہ مذہب خصوصاً اسلام کے بارہ میں جو مسائل اور شکوک وشبہات اس نے پیدا کردیے ہیں اگر انکا حل نہ نکالا گیا تو مسلمان بھی اس سیلاب میں بہ جائیں گے، بلکہ اسلامی ملک بہ چلے جارہے ہیں، مسلمان علماء ومفکرین کو اس خطرہ کا احساس اسلامی ملکوں پر مغربی تہذیب کی یلغار کے ساتھ ہی ہوگیا تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنے اپنے ذوق ونظر کے مطابق اس خطرہ کو روکنے کی کوشش کی،

لیکن ان میں بہت کم لوگ اعتدال پر قائم رہ سکے، عموماً ان کا انداز تاویل اور معذرت خواہی کا رہا، تاہم اس سے بھی کسی نہ کسی حد تک فائدہ پہنچا، اب زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، منئے نئے مادی نظریوں اور انکے نظاموں نے جو عقل و دانش اور علم و فن کے اسلحہ سے پوری طرح مسلح ہیں، بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں، اس لیے اس زمانہ میں یہ ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اس ضرورت کے پیش نظر جامعہ ملیہ کے چند اہل علم اور اصحاب فکر نے "اسلام اور عصر جدید" کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی ہے، اور اسی نام سے اردو میں ایک رسالہ بھی نکالا ہے، اس کا انگریزی اڈیشن بھی نکالنے کا ارادہ ہے، اس سوسائٹی کے روح رواں ڈاکٹر عابد حسین صاحب ہیں، انھوں نے اس مقصد کے لیے دنیائے اسلام کا سفر کر کے یہاں کے اہل علم و مفکرین سے تبادلۂ خیالات بھی کیا ہے،

اس مقصد کی ضرورت و اہمیت مسلم ہے، ہندوستان کے نئے حالات میں اس کی اور بھی ضرورت ہے، لیکن یہ راہ بڑی نازک اور خطرناک ہے، اس میں ادنیٰ لغزش سے ایک خطرہ سے بچنے میں دوسرے خطرہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور اس کام کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو جدید نظریات و رجحانات اور نئے مذاہب فکر اور ان کے فلسفوں سے واقفیت کے ساتھ دین میں بھی بصیرت رکھتے ہوں، اور ان کا مقصد اسلام کو مغربی افکار کے سانچے میں ڈھالنا نہیں بلکہ اس کو آمیزش سے الگ کر کے اس کی اصلی شکل میں پیش کرنا، اور اس کی روح اور بنیادوں کو قائم رکھتے ہوئے ان کی روشنی میں اس کی عقلی تعبیر اور جدید ذہن کے لیے قابل قبول بنانا ہو، یہ کوئی نیا کام نہیں ہے، ہر زمانہ کے متکلمین اس کو کرتے چلے آئے ہیں، لیکن اس کام میں اس کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہو کہ مذہب و معاشرت کے متعلق مغربی تہذیب کا ہر نظریہ اور ہر معیار قابل قبول نہیں، جو چیزیں اسلام کے مزاج سے متصادم ہوں، ان پر کھل کر تنقید کی جائے، اور مدلل طریقہ سے اسکی خرابیاں واضح کی جائیں۔

مغربی تہذیب کی صنعتی ترقی، سائنس کی ایجادات و انکشافات اور ان کے فوائد سے کسی کو بھی انکار نہیں، یہ بھی تسلیم ہے کہ اسکی بعض خوبیاں قابل تقلید ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے مادی تصور حیات اور شخصی آزادی کے تصور نے اس کو اخلاق و روحانیت اور شرافت انسانی سے عاری کر کے محض بندۂ نفس اور مشینی حیوان بنا دیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مغرب کا انسان قلبی سکون کی دولت سے محروم ہو گیا ہے، اور اس کی زندگی سراپا اضطراب بن گئی ہے، اور اس کی ایجادات ٹکنالوجی اور صنعتی ترقیاں دنیا کے لیے رحمت سے زیادہ زحمت بنتی جا رہی ہیں، جس کے انجام سے خود مغربی مفکرین مضطرب ہیں اور اس کا حل ڈھونڈھ رہے ہیں، اس لیے اسکی بڑی ضرورت ہے کہ اس مادی تصور حیات کی خرابیاں پوری طرح ظاہر کی جائیں، اور یہ دکھایا جائے کہ انکو صرف اخلاق و روحانیت کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے جس کا سب سے متوازن سرچشمہ اسلام ہے، مدافعت کے ساتھ حملہ کی بھی ضرورت ہے، جس کا نمونہ اقبال کا کلام ہے۔

اس مسئلہ پر ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے زبانی مختصر گفتگو ہوئی تھی، اس مختصر نوٹ میں بھی تفصیلی اظہار کی گنجائش نہیں ہے انشاء اللہ آیندہ مستقل مضمون میں تفصیل سے ہم اپنے خیالات پیش کریں گے، ڈاکٹر صاحب مذہبی جذبہ رکھتے ہیں، اور اخلاص کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے حملہ سے بچانا چاہتے ہیں، اور اس بارہ میں انکے خیالات بہت متوازن ہیں جس پر "اسلام اور عصر جدید" کے پہلے نمبر کا افتتاحیہ شاہد ہے، سوسائٹی کے بعض اور ارکان سے بھی اسی کی توقع ہے ابھی اس رسالہ کے دو نمبر نکلے ہیں، اور دونوں مفید علمی مضامین پر مشتمل ہیں، محترم بزرگ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کا مضمون بہت خوب ہے، انھوں نے اسلام کی اساسی تعلیمات کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے، مذہبی مضامین کا یہی انداز ہونا چاہیے، سوسائٹی کے کاموں کا پورا اندازہ آگے چل کر ہوگا، آیندہ توقعات کی امید پر ہم سوسائٹی اور اس کے رسالہ کا خیر مقدم کرتے ہیں، اور ہم کو اس پر مسرت ہے کہ جامعہ کے حلقہ سے ایک آواز تو اسلام کی حمایت کے لیے بلند ہوئی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سوسائٹی کو صراط مستقیم پر قائم رکھے اور اس کے مقاصد میں کامیاب فرمائے۔

مقالات

مجازاتِ قرآن بہ شریف رضی

از

جناب مولانا مقتدیٰ حسن صاحب اعظمی فاضل جامعہ ازہر مصر

مجازاتِ قرآن مجازاتِ قرآن کے عنوان پر سب سے پہلے ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ متوفی ۲۰۹ھ نے ایک کتاب تصنیف کی تھی، جو اس موضوع کی سب سے قدیم کتاب مانی جاتی ہے، اس سے پہلے ائمہ اور رواۃ فن صرف زبانی درس و تدریس پر اکتفا کرتے تھے، ابو عبیدہ کے زمانہ سے جب تصنیف کا باقاعدہ رواج ہوا تو ائمہ فن نے اس کی طرف توجہ کی، چنانچہ ابن ندیم نے ابو عبیدہ کی سو سے زیادہ تصنیفات کا نام لیا ہے[1]، ابو عبیدہ کی مذکورہ کتاب ۱۹۵۴ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے،

اس موقع پر یہ بات ملحوظ رہے کہ ابو عبیدہ نے اپنی کتاب "مجازات القرآن" میں لفظ مجاز کے اصطلاحی مفہوم کو جو لفظ "حقیقت" کا مقابل ہے، پیش نظر نہیں رکھا ہے، بلکہ اس لفظ سے ان کا مقصد ہے "الفاظ قرآنی کے مفہوم تک پہنچنے کا راستہ یا طریقہ"، یعنی انھوں نے قرآن کے غریب اور مشکل الفاظ کی شرح و توضیح کو پیش نظر رکھا ہے، اور علماے بلاغت کے یہاں اس لفظ کا جو اصطلاحی مفہوم ہے وہ ابو عبیدہ کے دائرۂ بحث سے خارج ہے، اس کا ثبوت خود کتاب کے

---

[1] ڈاکٹر احمد امین: فجر الاسلام ص ۱۹۸ و مابعد

مقدمہ کی اس عبارت سے ملتا ہے:

فلم یحتج السلف ولا الذین ادرکوا وحیه الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یسألوا عن معانیه لانهم کانوا عرب الالسن، فاستغنوا بعلمهم عن المسألة عن معانیه وعما فیه مما فی کلام العرب مثله من الوجوه والتلخیص، وفی القرآن مثل ما فی الکلام العربی من وجوه الاعراب، ومن الغریب والمعانی[1]

یعنی اسلاف خصوصاً نزول وحی کے زمانہ میں موجود لوگوں کو قرآن کے معانی کے بارے میں سوال کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ انکی زبان عربی تھی، اور اپنی زبان دانی کی وجہ سے وہ قرآن کے مفہوم اور اس کے مختلف طرز بیان کے بارے میں کسی قسم کے سوال سے بے نیاز تھے، پھر اعراب کی مختلف صورتوں، مشکل الفاظ اور معانی کے اعتبار سے قرآن کلام عرب ہی کے مثل تھا۔

اس عبارت سے قطع نظر کتاب پر نظر ڈالنے سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ "مجاز" سے ابو عبیدہ کا مقصود اس کا اصطلاحی معنی نہیں، بلکہ قرآن کے الفاظ کی تفسیر و تشریح ہے ابو عبیدہ نے سورہ فاتحہ سے لیکر آخر قرآن تک ایک ایک سورہ پر گفتگو کی ہے، اور الفاظ کی تشریح، غریب الفاظ کی توضیح، ترکیب کی توجیہ اور فصیح اشعار سے اس کے مفہوم پر استشہاد کیا ہے، چنانچہ عذاب الیم کی تفسیر میں لکھا ہے:۔ ای موجع، من الالم وهو فی موضع مفعل قال ذو الرمة:

ویرفع فی صدور شمردلات   یصک وجوهها وهج الیم[2]

اسی طرح آیت کریمہ: وان خفتم عیلة کے بارے میں لکھتے ہیں: وهی مصدر عال

---

[1] ابو عبیدہ: مجازات القرآن ص ۸ [2] ایضاً ص ۳۲

ای افتقر، فھو یعیل، وقال:-

ومایدری الفقیر متی غناہ ومایدری الغنی متی یعیل[1]

"لاحتنکن ذریتہ الا قلیلا" پر لکھتے ہیں: مجازہ: لاستمیلنھم ولاستأصلنھم

یقال: احتنکت فلان ما عند فلان اجمع من مال او علم او حدیث او غیرہ اکلہ واستقصاہ[2]

یعنی میں انھیں اپنی طرف مائل کروں گا اور انھیں ختم کر دوں گا، احتنکت فلان ما عند فلان من مال کا معنی یہ ہوتا ہے کہ "فلاں شخص فلاں کے مال پر قابض ہو گیا"۔

"مجازات القرآن" سے جو مثالیں نقل کی گئی ہیں ان سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ابو عبیدہ نے "مجاز" کے لفظ کو "تفسیر" کے معنی میں استعمال کیا ہے، اور اس لفظ کا جو اصطلاحی مفہوم علماء بلاغت کے یہاں متعین ہے، اس سے انھیں کوئی بحث نہیں ہے،

ابن ندیم نے الفہرست میں "غریب القرآن" نامی ایک کتاب بھی ابو عبیدہ کی طرف منسوب کی ہے، ممکن ہے کہ غریب القرآن اور مجازات القرآن دونوں ناموں کا اطلاق ابو عبیدہ کی اسی ایک کتاب پر کیا گیا ہو، اور ابن ندیم نے تسامح سے یہ سمجھا ہو کہ غریب القرآن ابو عبیدہ کی کسی دوسری تصنیف کا نام ہے۔ اس مسئلہ میں مزید الجھاؤ اس طرح پیدا ہو گیا ہے کہ ابن ندیم نے معانی و مجازات قرآن کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مجازات القرآن لابی عبیدہ کا نام نہیں لیا ہے[3]

جاحظ اور مجازاتِ قرآن عرب مصنفین میں جاحظ نے سب سے پہلے مجاز و استعارہ کے اصطلاحی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے، اور ان الفاظ سے تقریباً وہی مفہوم مراد لیا ہے جو بعد میں علمائے بلاغت کے یہاں متعین ہوا، جاحظ کے یہاں مجاز کا وہ مفہوم نہیں ہے جو ابو عبیدہ کے یہاں ہے، بلکہ اس لفظ سے انکی مراد کلام کی وہ قسم ہے جو حقیقت کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے، چنانچہ اپنی کتاب الحیوان اور البیان والتبیین

---

[1] مجازات القرآن ص ۲۵۵ [2] ایضاً ص ۳۸۲ [3] الفہرست لابن الندیم طبع قاہرہ ص ۵۱

میں متعدد مقامات پر مجاز و استعارے کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے پہلے کی تصانیف میں اس اصطلاحی مفہوم کا کوئی سراغ نہیں ملتا، اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بلاغت کے اصطلاحی مفہوم کی باقاعدہ ابتدا جاحظ کے ہاتھوں ہوئی، اور آگے چل کر سکاکی و قزوینی وغیرہ نے اس فن کو عروج پر پہنچایا،

جاحظ کی کتاب الحیوان میں علم بیان کی بعض اصطلاحات کی طرف یہ اشارہ ملتا ہے :۔

باب آخر فی المجاز والتشبیہ بالاکل، وھو قول اللّٰہ عزوجل : ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلما، وقولہ تعالیٰ عزاسمہ : اکالون للسحت، وقد یقال لھم ذلک ولن شربوا بتلک الاموال الانبذۃ ولبسوا الحلل ورکبوا الدواب، ولم ینفقوا منھا درھما واحدا فی سبیل الاکل[1]۔ مطلب یہ کہ ان آیات میں مال کے استعمال کو مجازاً اکل سے تعبیر کیا گیا ہے، اگرچہ اس کو پینے، پہننے اور سواری کرنے میں خرچ کیا گیا ہو،

جاحظ کے نزدیک مجاز کی تعریف یہ ہے کہ "سامع کے ذہن پر اعتماد کرتے ہوئے لفظ کو اس کے متعین معنی کے بجائے کسی دوسرے معنی میں استعمال کیا جائے، انھوں نے یہ نظریہ متعین کرکے قدیم تعبیرات کی بہت سی الجھنوں کو رفع کر دیا، اس کی نظر کلام عرب کی ان مثالوں پر تھی جن میں اس طرح کے مجازی مفہوم مراد لیے گئے ہیں، مثلاً جاءت السماء الیوم بامر عظیم۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے :۔

اذا سقط السماء بارض قوم رعیناہ وان کانوا غضابا

اس شعر میں "سماء" کے لفظ سے بارش اور اس کی ضمیر سے روئیدگی مراد ہے، جو ظاہر ہے کہ مجازی مفہوم ہے،

اس زمانہ میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اس طرح کے مجاز کا منکر تھا، اس کا خیال تھا کہ دینی نقطۂ نظر

---

[1] الحیوان بتحقیق عبدالسلام ہارون طبع قاہرہ ج ۵ ص ۲۵

سے تمام افعال کی سند اور نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف کیجائے گی، کیونکہ وہی نظام کائنات کو چلانے والا اور سارے عالم کا مدبر و نگہبان ہے، مخلوقات میں سے کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ کائنات میں کسی طرح کا تصرف کر سکے، جاحظ نے ان لوگوں کے جواب میں ایسی مثالیں پیش کیں جن میں الفاظ کے مجازی معنی میں استعمال ہونے کی وضاحت موجود تھی، اسی طرح جاحظ نے استعارہ کو بھی اصطلاحی معنی میں استعمال کیا (یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے نام سے یاد کرنا کیونکہ پہلی چیز دوسری چیز کے قائم مقام ہو) اور بعد کے لوگوں کے لیے راستہ ہموار کیا،

ایک جگہ لکھا ہے :-

قال عز وجل: هذا نزلهم يوم الدين. والعذاب لا يكون نزلا ولكن لما قام العذاب لهم في موضع النعيم لغيرهم سمي باسمه	یعنی عذاب مہمانی کا سامان نہیں بن سکتا لیکن چونکہ مجرموں کو نیک لوگوں کی نعمت کے مقابلہ میں عذاب ہی دیا جائیگا اس لیے عذاب کو "نزل" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا،

جاحظ کی تصنیفات میں اس قسم کے جو اشارے موجود ہیں، ان سے گو فن بلاغت کی عمارت نہیں کھڑی کیجا سکتی، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اشارے بعد کے لوگوں کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوئے اور انھوں نے ان اصطلاحات میں اور زیادہ نکھار پیدا کیا، چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مشکل القرآن میں جاحظ کی رایوں سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔

ابن قتیبہ اور مجاز جاحظ کے بعد ابن قتیبہ نے مجاز و استعارہ کی اصطلاحات کو زیادہ رواج دیا، اور ان کے مفہوم میں وسعت پیدا کی، یہی چیز آگے چل کر علوم بلاغت کی ترقی کا سبب بنی، ابن قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مشکل القرآن میں استعارہ، تمثیل، قلب، تقدیم، تاخیر، حذف تکرار، اخفاء، اظہار، تعریض، کنایہ اور ایضاح وغیرہ جیسی بیانی اصطلاحات کا نام لیا ہے۔[۱]

---

[۱] تاویل مشکل القرآن طبع الحلبی، قاہرہ ص ۱۵، ۱۶

اس کتاب میں مصنف نے مجاز و استعارہ کے لیے مستقل باب قائم کیے ہیں، جن میں دونوں اصطلاحوں کا مفہوم بیان کیا ہے، اور آیاتِ قرآنی کی مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے، ابن قتیبہ کے دور میں قرآن کی تفسیر اور اس کے مطالعہ پر علما سے فن کی توجہ پوری طرح مرکوز ہو چکی تھی، اس لیے اس طرح کی اصطلاحات پر بھی کافی توجہ کی گئی، اسی دور میں متکلمین میں ابن الہذیل العلاف متوفی ۲۳۵ھ ابو علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی متوفی ۳۰۳ھ وغیرہ علما پیدا ہوئے جنھیں جدل و مناظرہ میں کمال حاصل تھا، چنانچہ ذات باری تعالیٰ، اس کی صفات، افعال، عدل اور جبر و اختیار وغیرہ مسائل میں ان علما نے جن رایوں کا اظہار کیا ہے اور ان کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ان سے بھی فن بلاغت کو بڑی ترقی ہوئی اور ان آرا کو اس فن کی اصطلاحات کی روشنی میں سمجھا گیا،

قرآن کی آیت وکلم اللّٰہ موسیٰ تکلیما کی توجیہ کے سلسلہ میں اس دور کے علما و مفسرین میں اختلاف تھا، بعض مفسرین کلام کے مجازی معنی مراد لیتے تھے اور بعض حقیقی، ابن قتیبہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

ان افعال المجاز لا تخرج منها المصادر ولا تؤکد بالتکرار فتقول : اراد الحائط ان یسقط ولا تقول : اراد الحائط ان یسقط ارادۃ شدیدۃ ۔ واللّٰہ تعالیٰ یقول : وکلم اللّٰہ موسیٰ تکلیما ، فوکد بالمصادر معنی الکلام ونفی عنہ المجاز (تاویل مشکل القرآن ص ۸۲)

یعنی آیت میں کلام کا حقیقی معنی مراد ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مجازی معنی مراد لینے کی صورت میں فعل کی تاکید مصدر سے نہیں کی جاتی، چنانچہ اراد الحائط ان یسقط کہنا صحیح ہے لیکن مصدر کے ذریعہ تاکید کرتے ہوئے اراد الحائط ان یسقط ارادۃ شدیدۃ کہنا غلط ہے، اللہ تعالیٰ نے آیت میں کلّم فعل کا مفعول مطلق تکلیما ذکر کرکے مجازی معنی مراد لینے کی گنجائش ختم کر دی ہے۔

قرآن کریم میں مجاز کے استعمال کا وجود ثابت کرنے کے بعد مخالفین کا جواب دیتے ہوئے ابن قتیبہ نے لکھا ہے:

واما الطاعنون على القرآن بالمجاز فانهم زعموا انه كذب، لان الجدار لا يريد، والقرية لا تسأل وهذا من اشنع جهالاتهم وادلها على سوء نظرهم وقلة افهامهم، ولو كان المجاز كذبا وكل فعل ينسب الى غير الحيوان باطلا، كان اكثر كلامنا فاسدا لانا نقول: نبت البقل وطالت الشجرة

(تاویل مشکل القرآن ص ۹۹)

یعنی قرآن میں مجاز کے وجود پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجاز جھوٹ ہے کیونکہ آیت میں دیوار کے چاہنے اور بستی سے پوچھنے کا ذکر ہے لیکن دیوار ارادہ نہیں کرتی اور بستی سے پوچھا جاتا ہے، مخالفین کا یہ خیال ان کی نادانی، کوتاہ بینی اور قلت فہم کی دلیل ہے، اگر مجاز کو کذب اور غیر جاندار کی طرف منسوب ہونے والے فعل کو باطل قرار دیا جائے تو ہماری بات چیت کا بیشتر حصہ جھوٹ اور فاسد ہو جائے گا کیونکہ ہم برابر یہ بولتے ہیں کہ نبت البقل (سبزہ اگا) اور طالت الشجرة (درخت بڑھا)

ایک جگہ بڑے پرزور انداز میں لکھا ہے:

ولو قلنا للمنكر لقوله: جدارا يريد ان ينقض: كيف كنت انت قائلا في جدار رايته على شفا الانهيار، رايت جدارا ماذا؟ لم يجد بدا من ان يقول: جدارا يهم

یعنی جدارا یرید والی آیت میں مجازی معنی کے منکر سے اگر ہم سوال کریں کہ جو دیوار گرنے کے قریب ہو اس کو دیکھ کر تم کن الفاظ سے اس معنی کو ادا کرو گے؟ تو وہ مجبوراً یہی یکاد یا یقارب کا لفظ استعمال کرے گا

ان ينقض او يكاد ان ينقض او	اوران تمام صورتوں میں فعل کا فاعل جدار ہی
يقارب ان ينقض، واياما فقد	کو بنانا پڑے گا، اور اس مفہوم کو کسی بھی زبان
جعله فاعلا ولا احسبه يصل	میں ان ہی الفاظ کے ذریعہ ادا کیا جا سکتا ہے،
الى هذا المعنى فى شئ من لغات	سجستانی نے ابو عبیدہ سے ایک
العجم الا بمثل هذه الالفاظ	شعر نقل کیا ہے جس سے ارادہ کے
وانشد فى السجستانى عن ابى عبيدة	مجازی معنی کی تائید ہوتی ہے،
فى مثل قول الله يريد ان ينقض:	شاعر کہتا ہے:
يريد الرمح صدر ابى براء	نیزہ ابو براء کا سینہ چاہتا ہے اور
ويرغب دماء بنى عقيل[1]	بنی عقیل کے خون سے اعراض کرتا ہے،

مجازاتِ قرآن کے سلسلہ میں ابن قتیبہ کے اسی مسلک کی بنا پر ابن المعتز متوفی ۲۹۶ھ کے ہاتھوں فنِ بلاغت کو ترقی ہوئی اور بعد میں علماء نے اس فن پر مستقل کتابیں تصنیف کیں، جن میں شریف رضی، عبد القاہر جرجانی متوفی ۴۷۱ھ، سکاکی متوفی ۶۲۶ھ اور ابن الاثیر متوفی ۶۳۷ھ کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں،

ابن قتیبہ نے تاویل مشکل القرآن میں استعارہ کا جو باب قائم کیا ہے وہ بھی مجاز کے باب کی طرح بہت مفید ہے۔ علمائے معانی و بیان نے بعد میں جو اصطلاحی الفاظ وضع کیے تقریباً وہی الفاظ ان سے پہلے ابن قتیبہ نے بھی استعمال کیے ہیں، ایک جگہ لکھا ہے:

فالعرب تستعير الكلمة فتضعها	یعنی عرب ایک لفظ کو دوسرے کی جگہ بسببیت،
مكان الكلمة اذا كان المسمى بها بسبب	مجاورت یا مشاکلت کی وجہ سے استعارۃً استعمال

---

[1] تاویل مشکل القرآن ص ۱۰۰

من الاخرى او مجاز لها او	کرتے ہیں، چنانچہ نبات کو نوء سے تعبیر کرتے ہیں
مشاكلا، فيقولون للنبات:	کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہی نوء نبات
نوء، لانه يكون عن النوء عندهم	کا سبب ہے، اسی طرح بارش کو سماء سے
ويقولون للمطر: سماء، لانه	تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ بارش آسمان ہی
من السماء ينزل[1]	سے برستی ہے۔

اسی طرح مندرجۂ ذیل آیتوں کے استعارے پر روشنی ڈالی ہے:۔ اليوم يكشف عن ساق، ولا يظلمون فتيلا، وقدمنا الى ما عملوا من عمل فجعلناه هباء منثورا، وافئدتهم هواء، او من كان ميتا فاحييناه۔ اور بھی بہت سی آیتوں کے استعارہ پر بحث کی ہے، اس کتاب کے تقریباً چالیس صفحات میں یہ بحث پھیلی ہوئی ہے۔

اس طرح ابن قتیبہ نے مجاز و استعارہ جیسے بیانی الفاظ پر فن بلاغت کی باقاعدہ تدوین سے بہت پہلے روشنی ڈالی، ۲۷۶ھ میں ابن قتیبہ کی وفات ہوئی، تیسری صدی ہجری میں ادب، لغت، نحو اور علم کلام کے مباحث کا چرچا تھا، علماء میں ابوعثمان المازنی، ثعلب، زجاج، ابن الانباری، سجستانی اور مبرد وغیرہ موجود تھے، اسی طرح چوتھی صدی ہجری میں بھی ابن خالویہ، ابوبکر الزبیدی، ابن جنی، السیرافی، ابوعلی الفارسی، ابوحسن الرمانی وغیرہ ایسی شخصیتیں موجود تھیں، لیکن ان میں سے کسی نے بھی مجازات قرآن پر کوئی کتاب نہیں لکھی، جب شریف رضی کا زمانہ آیا تو انھوں نے اس مسئلہ پر خصوصی توجہ کی اور اپنی کتاب "تلخیص البیان" کو علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔

تلخیص البیان فی مجازات القرآن شریف رضی کا یہ علمی شاہکار ایک عرصہ تک پردۂ خفا میں تھا، بعد میں جب اس کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا تو اس میں ابتدائی صفحات نہیں تھے، اس لیے

---

[1] تاویل مشکل القرآن ص ۱۰۲

یہ تعین کرنا مشکل تھا، کہ اس کتاب کا نام کیا ہے اور اس مصنف کون ہے؟ انداز بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ کتاب کا مصنف کوئی شیعہ عالم ہے، اور یہ بات بھی معلوم تھی کہ صاحب کتاب کی ایک دوسری تصنیف حقائق التاویل بھی ہے جس کا حوالہ مصنف نے اس کتاب میں دیا ہے، اس حوالہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ کتاب شریف رضی کی ہے جو تقریباً دس صدی تک دنیا کی نظروں سے اوجھل رہی اور اصحاب تراجم شریف رضی کی تصنیفات کے ضمن میں صرف اس کے نام کا ذکر کرتے رہے۔

شریف رضی کی طرف اس کے انتساب کی صحت کا دوسرا ثبوت یہ فراہم ہوا کہ مصنف نے بعض مقامات پر اپنی کتاب مجازات الآثار النبویہ کا حوالہ بھی دیا ہے اور اس کتاب کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ شریف رضی کی تصنیف ہے، بغداد اور مصر سے اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، مصری اڈیشن الازہر یونیورسٹی میں عربی ادب کے استاد محمود مصطفیٰ کی تحقیق و حاشیہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اس کتاب میں اور بھی ایسے شواہد موجود ہیں جن کی روشنی میں قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب شریف رضی ہی کی تصنیف ہے، مثلاً سورہ رحمٰن کے مجازات پر بحث کے دوران میں مصنف نے لکھا ہے:

وقد کان والدی الطاهر الاوحد	یعنی میرے والد ابو احمد حسین بن موسیٰ موسوی
ذوالمناقب ابو احمد الحسین بن موسیٰ	رضی اللہ عنہ نے مجھ سے سورہ رحمٰن کی آیت
الموسوی رضی اللہ عنه وارضاه	سنفرغ لکم ایها الثقلان کے بارے میں
سألنی عن هذه الآیة (سنفرغ	سوال کیا تو میں نے آیت کے مفہوم کی توضیح کے
لکم ایها الثقلان) فی جملة کلام	سلسلہ میں سب سے معروف و مشہور قول ان کے

جزءٍ ذکرھا، فاجبته فی الحال باعوف سامنے پیش کیا،

الاجوبتہ المقولۃ فیھا

کتاب کا یہ اقتباس بھی اس کا ثبوت ہے کہ اس کے مصنف شریف رضی ہیں، کیونکہ ان ہی کے والد کا نام حسین بن موسیٰ اور لقب الطاہر الاوحد ہے، یہ لقب انھیں ۳۷۹ھ میں عراق کے حاکم ابو نصر بہاء الدولۃ بن عضد الدولۃ بن بویہ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے،

ایک دوسرے مقام پر مصنف لکھتے ہیں: وقال لی الشیخ ابو بکر محمد بن موسیٰ الخوارزمی ادام اللہ توفیقہ۔ عند بلوغی علیہ فی القراءۃ من مختصر ابی جعفر الطحاوی الی ھذہ المسألۃ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابو بکر محمد بن موسیٰ سے انھوں نے تحصیل علم کی اور یہ مشہور و مسلم ہے کہ ابو بکر محمد بن موسیٰ شریف رضی کے اساتذہ میں تھے، ان سے انھوں نے علم حدیث حاصل کیا تھا، اور اپنی کتاب المجازات النبویۃ میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح اس کتاب میں دوسرے اساتذۂ فن سے بھی استفادہ کا تذکرہ ہے جنکا شمار شریف رضی کے اساتذہ میں ہوتا ہے،

ان دلائل سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ زیر بحث کتاب کے مولف شریف رضی ہیں، اور خود کتاب کی زبان، اس کے اسلوب، انداز بیان کی شگفتگی اور قوت استدلال سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریر شریف رضی کی ہے، جو اپنی ادبی حیثیت اور اسلوب زبان کی خوبی کے لیے معروف تھے،

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود کتاب کے نام کے تعین کا کیا ثبوت ہے؟ ہوسکتا ہے کہ یہ مخطوط شریف کا ہو لیکن اس کا نام کچھ اور ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ شریف رضی کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تمام کتابیں تراجم کی کتابوں میں معروف ہیں، اصحاب تراجم نے مطالعۂ قرآن کے موضوع پر ان کی مندرجۂ ذیل کتابوں کا نام گنایا ہے: حقائق التاویل فی متشابہ التنزیل، معانی القرآن اور تلخیص البیان فی مجازات القرآن۔ ان میں سے حقائق التاویل نجف میں طبع ہوچکی ہے، اور معانی القرآن

ابتک طبع نہیں ہوئی، قیاس یہ ہے کہ یہ حقائق التاویل ہی کا دوسرا نام ہے، اصحاب تراجم اور تذکرہ نویسوں کو دھوکہ ہوا کہ انھوں نے اسے الگ تصنیف قرار دیدیا، اس کے بعد قرآن کے موضوع پر صرف تلخیص البیان باقی رہ جاتی ہے جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ یہ نام اسی قلمی نسخہ کا ہے کسی دوسری کتاب کا نہیں،

کتاب کا علمی و ادبی مقام | شریف رضی نے اپنی کتاب المجازات النبویہ کے مقدمہ میں تلخیص البیان فی مجازات القرآن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

انی سلکت من ذلک محجۃ لم تسلک — یعنی کتاب تلخیص البیان کی تصنیف میں جو راستہ

وطرقت بابا لم یطرق — میں نے اختیار کیا ہے وہ بالکل نیا ہے اس میں کسی

(مجازات نبویہ ص۲)

رضی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے، کیونکہ ان کی کتاب سے پہلے اس موضوع پر مستقل طور سے کسی مصنف نے قلم نہیں اٹھایا تھا، ابوعبیدہ کی کتاب مجازات القرآن کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مجاز سے ان کی مراد علم بلاغت کا وہ اصطلاحی مجاز نہیں ہے جسے حقیقت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے، بلکہ اس کو انھوں نے تفسیر و تاویل کے مفہوم میں استعمال کیا ہے،

البتہ جاحظ اور ابن قتیبہ نے مجازات و استعارات قرآنی پر ان کے اصطلاحی مفہوم میں بحث کی ہے لیکن یہ مباحث کسی ایک جگہ مرتب شکل میں نہیں ہیں، جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین کتاب الحیوان میں اور ابن قتیبہ نے تاویل مشکل القرآن میں مختلف مقامات پر اس کے متعلق لکھا ہے، لیکن شریف رضی کی طرح انھوں نے اس عنوان کو مرتب اور مستقل حیثیت سے نہیں پیش کیا، اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مجازاتِ قرآن پر سب سے پہلی منظم و مرتب کتاب تلخیص البیان فی مجازات القرآن ہی ہے،

اب ہم اس کی علمی و ادبی حیثیت پر بحث کرتے ہیں،

الفاظ و معانی اور اسلوب و بیان کے لحاظ سے قرآن کریم کا اعجاز ایک مسلمہ حقیقت ہے، جس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں، قرآن نے تعبیر و بیان کا وہی طریقہ اختیار کیا تھا، جس سے عرب کے ادباء و فصحاء مانوس تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے آیات قرآنی جیسی کوئی آیت پیش کرنے کی جرأت نہیں کی، ان کے قلم کا سارا زور اور ان کی ساری ذہنی و فکری صلاحیتیں اعجاز قرآنی کے سامنے عاجز و درماندہ ہوگئیں، علمائے بلاغت اور مفسرین نے قرآن کے لفظی و معنوی جمال و جلال اور اس کی آیتوں میں پوشیدہ اسرار بلاغت کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے، ان تمام آیتوں کا صحیح مفہوم متعین کیا جن کے حقیقی معنی مراد نہیں تھے، بلکہ ان میں مجاز یا استعارہ کا مفہوم مراد لیا گیا تھا، مثلاً یوم یکشف عن ساق، وثیابك فطهر، هن لباس لکم وانتم لباس لهن، ولا تلمزوا انفسکم اور سنسمه على الخرطوم وغیرہ، ان آیتوں کی تفسیر و توضیح میں مفسرین نے بڑی جانفشانی سے کام لیا، اور کلام عرب سے اس طرح کی ترکیبوں پر استدلال کیا، اور ان کے شواہد پیش کیے لیکن ان کی یہ توجیہات و تاویلات سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب نہیں تھیں، بلکہ صحابہ و تابعین کے اقوال کے ضمن میں ان کا ذکر آتا تھا، سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے مجازات قرآنی کی تاویل اور ان کے بلاغی و بیانی گوشوں کی وضاحت کا کام منظم طور پر شریف رضی نے شروع کیا، اور جس طرح امام طبری نے تفسیر قرآن میں مصحف کی ترتیب کے اعتبار سے ہر آیت کی تفسیر کی ہے، اسی طرح رضی نے مجازات قرآن کی تاویل میں اس ترتیب کا لحاظ رکھا ہے،

شریف رضی نے عام مفسرین کی طرح ہر آیت اور ہر کلمہ کی تشریح و تفسیر نہیں کی ہے، یہ ان کے موضوع سے خارج تھا، ان کا مقصد صرف مجازات قرآن کی توضیح ہے، اسی لیے انھوں نے صرف مجاز پر مشتمل ان سورتوں اور آیات کو لیا ہے جن میں مجاز و استعارہ کا استعمال کیا گیا ہے، جن میں اس کا استعمال نہیں ہے ان کو چھوڑ دیا ہے، مثلاً سورۂ عبس اور انفطار وغیرہ۔

تلخیص البیان میں شریف رضی نے جسطرح مجاز بیانی پر سیر حاصل بحث کی اسی طرح عربی زبان کی بھی بڑی خدمت انجام دی جو ان ہی کا حصہ ہے، چنانچہ فصیح عبارتیں، لغت کے الفاظ، خالص عربی ترکیبیں اور فصحائے عرب کے صحیح اور مستند استعمالات کا ایک بڑا ذخیرہ تلخیص البیان کے ذریعہ محفوظ ہو گیا، انھوں نے ہر مسئلہ کی سند میں ایسے شواہد پیش کیے ہیں جن سے ان کے ادبی ذوق اور زبان پر عبور کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً ان جملوں اور ان کی ساخت پر غور کیجئے: اخذت المرأة قناعها اى لبسته۔ اخذت هذا الامر بالله اى بالسلطان۔ انا بعين الله اى بمكان من حفظه۔ [illegible] تتراءى اى تتقارب۔ فلان عندى بالميزان الراجح اذا كان كريما [illegible] وحبيبا اليه۔

ان فصیح و بلیغ جملوں کے استعمال سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شریف رضی کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور وہ زبان کے اسرار و رموز اور اس کے مناسب استعمالات سے پوری طرح باخبر تھے، لغت کے بارے میں بھی انکے معلومات بہت گہرے اور وسیع تھے اور یہ سب فیض تھا خاندان نبوت کا جسکی طرف شریف رضی منسوب تھے، اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ شریف رضی کے اساتذہ میں سیرافی متوفی ۳۶۸ھ، ابو علی الفارسی متوفی ۳۷۷ھ، ابن جنی متوفی ۳۹۲ھ، ابو الحسن علی بن عیسی الربعی متوفی ۴۲۰ھ اور عبد الرحیم بن نباتہ متوفی ۴۰۵ھ وغیرہ جیسی شخصیتیں تھیں، جنھوں نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور لسانی معلومات میں اضافہ کیا، اور ان کے فیض تعلیم سے وہ بہت بڑے ادیب اور قادر الکلام شاعر ہو گئے۔

اس کتاب کی ادبی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شریف رضی نے مستند عرب شعراء کے اشعار کو بکثرت استدلال میں پیش کیا ہے، چنانچہ شعراء میں ابو ذؤیب الہذلی، ابو کبیر الہذلی، الافوہ الاودی، امرؤ القیس، نابغہ ذبیانی، عبدة بن الطیب، عنترة العبسی، المنخل، ملاعب الاسنة، بقیلة الاکبر الاشجعی، ابو الہندی، العدیل بن الفرخ، طرفة، القطامی، ذو الرمة، عمر بن ابی ربیعہ اور جہدیہ وغیرہ جیسے مشہور اساتذۂ فن کا کلام سند میں پیش کیا ہے، جس سے کلام عرب پر ان کی وسعت نظر، صحیح عربی ذوق

اور حسن انتخاب کا پتہ چلتا ہے کسی مقام پر بھی اموی دور کے بعد کے شعراء کا نام نہیں لیا ہے، کیونکہ عباسی دور کے شعراء کا کلام مختلف اسباب کی بنا پر قابل سند نہیں مانا جاتا تھا۔

ایک موازنہ ابو عبیدہ کی کتاب مجازات القرآن کے طبع ہونے سے پہلے مورخین ادب کا خیال تھا کہ بیانی حیثیت سے قرآن پر بحث کرنے والی پہلی کتاب "مجاز القرآن" ہے، چنانچہ احمد اسکندری اور مصطفی عنانی نے کتاب الوسیط میں لکھا ہے کہ انہ اول کتاب دون فی علم البیان، لیکن جب ترک ادیب فواد سزگین نے مستشرق ایچ۔ ریٹر کے تعاون سے اس کتاب کو اڈیٹ کرکے شائع کیا تو معلوم ہوا کہ ابو عبیدہ کی کتاب قرآن کریم کے الفاظ کی محض ایک مختصر تشریح ہے، اور اس میں علمائے بیان کے اصطلاحی مجاز سے بحث نہیں کی گئی ہے، البتہ جاحظ اور ابن قتیبہ نے اس حیثیت سے مجازات قرآن پر بحث کی ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں، اس موقع پر ہم ابو عبیدہ، ابن قتیبہ اور شریف رضی تینوں کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں جس سے ان کے موضوع اور انداز بحث پر روشنی پڑے گی۔

ابو عبیدہ سورۂ اسراء کی آیت: ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک" کے متعلق لکھتے ہیں:

مجازہ فی موضع قولھم: لاتمسک عما ینبغی ان تبذل من الحق، وھو مثل وتشبیہ	یہ اس فقرے کی جگہ ہے کہ جتنا خرچ کرنا چاہئے اس سے ہاتھ نہ روکو" بطور کنایہ و تشبیہ استعمال کیا گیا ہے،

اسی آیت کے بارے میں شریف رضی کا بیان ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں:

ھذہ استعارۃ، ولیس المراد بھا الید التی ھی الجارحۃ علی الحقیقۃ، وانما الکلام الاول کنایۃ عن التقتیر، والکلام الآخر	یہ استعارہ ہے، اس سے مراد گوشت پوست کا اصلی ہاتھ نہیں ہے، پہلا کلام کنایہ ہے خرچ میں تنگی اور کمی سے اور دوسرا کلام کنایہ ہے اسراف اور فضول خرچی سے،

كناية عن التبذير، وكلاهما مذموم حتى يقف كل منهما عند حده ولا يجري الا الى امده، وقد فسر هذا قوله سبحانه: والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذلك قواما

یہ دونوں مذموم ہیں، دونوں کو اپنی حد کے اندر ہونا چاہیے، اسی کی تفسیر اللہ تعالےٰ کے اس قول میں ہے والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما

اب ایک نظر ابن قتیبہ پر ڈالتے چلیے جنھوں نے اصطلاحی مفہوم کے لحاظ سے مجاز سے بحث کی ہے، سورۂ رحمٰن کی آیت سنفرغ لکم ایہا الثقلان پر لکھتے ہیں:

والله تبارك وتعالى لا يشغله شأن عن شأن، ومجازه: سنقصد لكم بعد طول الترك والامهال، وقال قتادة: قد دنا من الله فراغ لخلقه، يريد ان الساعة قد ازفت وجاء اشراطها[1]

اللہ تعالیٰ کو ایک حالت دوسرے سے غافل نہیں کر دیتی یہ مجاز ہے یعنی میں کچھ دنوں کے ترک اور مہلت کے بعد پھر تمھاری طرف متوجہ ہوتا ہوں قتادہ کہتے ہیں کہ خلق کی جانب خدا کی توجہ کا وقت قریب آگیا یعنی قیامت قریب آگئی اور اس کے آثار ظاہر ہونے لگے،

اسی آیت پر شریف رضی کا بیان ملاحظہ کیجیے:

هذه استعارة والمراد بذلك سنعمد لعقابكم، ونأخذ في جزائكم على مساوئ اعمالكم، قال جرير:

الآن وقد فرغت الى نمير
فهذا حين صرت لها عذابا؟

یہ استعارہ ہے، اس سے مراد ہے کہ عنقریب تمھاری سزا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور تمھاری بداعمالیوں کا بدلہ دوں گا۔

---

[1] ابن قتیبہ: تاویل مشکل القرآن ص ۷۷

فقال فرغت الی نمیر، کما یقول	نہ یہاں فرغت الی نمیر عمدت الیھا
عمدت الیھا، فاعلمنا ان معنی	کی جگہ استعمال ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا
فرغت ھھنا معنی عمدت وقصدت	کہ یہاں فرغت عمدت و قصدت
ولو کان یرید الفراغ من الشغل	کے معنی میں ہے، اگر شغل سے فراغت مقصود
لقال فرغت لھا ولم یعتمل	ہوتی تو فرغت لھا ہوتا فرغت
فرغت الیھا	الیھا نہ ہوتا،

شریف رضی نے اس موقع پر آیت کی متعدد تاویلیں کی ہیں، اور بحث و تحقیق کا پورا حق ادا کر دیا ہے، ہم نے بنظر اختصار صرف ایک تاویل نقل کی ہے، جو ابن قتیبہ کی تشریح سے بہت زیادہ مفصل اور مبسوط ہے، اس سے ہمارا مقصد تینوں مصنفین کے درمیان تقابل وموازنہ نہیں ہے، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس طرح اس فن کو تدریجی ترقی حاصل ہوئی اور شریف رضی نے چوتھی صدی ہجری میں اس کو عروج پر پہنچایا،

قرآن میں مجاز کے وجود پر علماء کا اختلاف مسلمانوں نے خدا کی کتاب میں مجاز کے وجود کے نظریہ کو آسانی سے قبول نہیں کیا، بلکہ اس کی مخالفت میں بہت سے اشخاص اور جماعتوں نے آواز بلند کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مجاز کا استعمال نہیں کیا ہے،

امت مسلمہ کے ہر فرد کا خواہ وہ کسی مسلک سے تعلق رکھتا ہو، اس پر اتفاق ہے کہ قرآن "حقیقت" پر مشتمل ہے یعنی اس کے ہر لفظ کو اس کے اصلی اور حقیقی معنی میں کسی تبدیلی کے بغیر استعمال کیا گیا ہے، اور قرآن کا بیشتر حصہ اسی قسم کے الفاظ پر مشتمل ہے، البتہ مجاز اصطلاحی کے قرآن میں استعمال کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، جمہور کی رائے ہے کہ قرآن میں بعض الفاظ کو مجازی معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے، فرقہ ظاہریہ شوافع میں ابن القاص اور مالکیہ میں ابن خویز منداد قرآن

میں مجاز کے استعمال کے منکر ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ مجاز ایک طرح کا کذب ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کا مقدس کلام منزہ اور برتر ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ آدمی مجازی تعبیر کا سہارا اسی وقت لیتا ہے جب وہ اس مفہوم کی حقیقی تعبیر سے عاجز ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ باری تعالیٰ کا کسی مفہوم کو واضح کرنے سے عاجز ہونا محال ہے، اور اس کی شان میں ایسا تصور کرنا بہت بڑا گناہ ہے،

مگر اس شبہہ اور اعتراض کی تردید اکثر علما نے کی ہے، ابن قتیبہ لکھتے ہیں: اگر مجاز کو جھوٹ قرار دیا جائے تو ہماری روزمرہ کی اکثر بات چیت لغو اور بے معنی ہو جائے گی، کیونکہ ہم اپنی گفتگو میں اکثر یہ کہتے ہیں کہ سبزہ اگا، درخت بڑھا، پھل پکا، بھاؤ گرا، تم نے فلاں کام کیا، اور ان تمام مثالوں میں فعل کی نسبت جن چیزوں کی طرف کی گئی ہے وہ درحقیقت فعل کی موجد نہیں ہیں بلکہ ان افعال کا حقیقی فاعل کوئی اور ہے، تو جب یہ ترکیب صحیح ہے اور اسے کذب نہیں قرار دیا جاسکتا تو پھر قرآن میں اس طرح کے الفاظ کے استعمال سے کیسے کذب لازم آسکتا ہے؟

امام سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں: مانعین مجاز کا شبہہ غلط ہے، اگر قرآن سے مجاز کو خارج کر دیا جائے تو اس کا آدھا حسن ختم ہو جائے گا، علمائے بلاغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مجاز حقیقت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے، قرآن میں مجاز کے وجود کا انکار کرنے والے قرآن کے محذوفات، تاکید اور تکرار کا جواب کیا دیں گے؟[1]

امام سیوطی نے اتقان میں مجازات و استعارات قرآنیہ کا ذکر کرتے ہوئے مجاز لغوی کی بیس قسموں کا بیان کیا ہے، پھر بیسویں قسم کو جس میں ایک صیغہ کی جگہ دوسرے صیغہ کے استعمال کی بحث ہے بیا سے زائد قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

شریف رضی نے اپنی کتاب میں مجازات و استعارات قرآنیہ کی تشریح کرتے ہوئے ان انواع و اقسام کا ذکر نہیں کیا ہے، کیونکہ ان کے دور میں ان اسماء و اصطلاحات کا رواج نہیں ہوا تھا، چنانچہ

---

[1] الاتقان ج ۲ ص ۳۶ مطبوعہ مصر

شریف رضی آیت کریمہ: واسأل القریۃ التی کنا فیھا۔ کے مجاز کے بارے میں صرف یہ لکھتے ہیں کہ

وھذہ استعارۃ من مشاھیر الاستعارات، والمراد: واسأل القریۃ التی کنا فیھا	یہ استعارہ مشہور استعاروں میں سے ہے اس سے مراد اہل قریہ سے سوال ہے،

اسی آیت پر امام سیوطی اصطلاحی انداز میں یوں روشنی ڈالتے ہیں:

الرابع عشر، اطلاق اسم المحل علی الحال نحو فلیدع نادیہ ای اھل نادیہ ای مجلسہ ومنہ التعبیر بالید عن القدرۃ نحو بیدہ الملک، وبالقریۃ عن ساکنیھا نحو واسأل القریۃ[1]	یعنی مجاز کی چودھویں قسم یہ ہے کہ محل بول کر حال مراد لیا جائے، جیسے فلیدع نادیہ میں مجلس نہیں بلکہ اہل مجلس مراد ہیں، اسی طرح ید بول کر قدرت اور قریہ بول کر ساکنین قریہ مراد لیے جاتے ہیں،

ایک مفسر قرآن کیلئے جن علوم کو ضروری قرار دیا گیا ہے ان میں علوم معانی و بیان کو بھی اہم حیثیت حاصل ہے کیونکہ ترکیب کلام کے خصائص کی معرفت اسی علم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، امام سیوطی لکھتے ہیں:

علم بلاغت ایک مفسر کا اہم سہارا ہے کیونکہ اعجاز قرآنی کے مقتضی کی رعایت اس علم کے بغیر ممکن نہیں،[2]

مجازات نبویہ | شریف رضی نے تلخیص البیان میں مجازات قرآنی پر سیر حاصل بحث کی اور اس پہلو کو پوری طرح واضح کیا ہے، اسی طرح انھوں نے اپنی دوسری تصنیف مجازات نبویہ میں احادیث رسول کے مجازات و استعارات پر روشنی ڈالی ہے اور ان تمام نکات کو واضح کیا ہے جن پر حدیث نبوی کے مجازات مشتمل ہیں، شریف رضی کی اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے مجازات حدیث کے موضوع کو لوگ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس طرح کے مجازات کلام نبوت میں بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن آج سے تقریباً چالیس سال

---

[1] الاتقان ج ۲ ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۸۱

پیشتر جب یہ کتاب عراق میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی تو لوگوں کی توجہ اس موضوع کی طرف مبذول ہوئی اور کلام نبوت کا یہ دلچسپ گوشہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا،

شریف رضی نے اس کتاب میں کلام نبوت میں تعبیر کے حسن، بلاغت کے سحر آفرینی اور دلائل کے استحکام کی نشاندہی کی ہے، اور اپنے مخصوص ادیبانہ رنگ میں یہ دکھایا ہے کہ نبی امی کا کلام بھی دوسرے انسانی کلام سے بہت بلند و پرشکوہ ہے،

اس موقع پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ مجازاتِ قرآن، اور مجازات نبویہ میں کونسی کتاب پہلے تصنیف کی گئی ہے اور کون بعد میں؟ مجازات نبویہ کے مقدمہ میں یہ عبارت ہے: فانی عرفت ما شافهتنی به من استحسانك الجنبیثة التی الطلمتها، والدفینة التی اثرتها من کتابی الموسوم بتلخیص البیان عن مجازات القرآن - اسی طرح کتاب میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: وقد استقصینا الکلام علی ذلك فی کتاب تلخیص البیان عن مجازات القرآن - ان دونوں عبارتو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تلخیص البیان کی تالیف مجازاتِ نبویہ سے پہلے ہوئی ہے،

لیکن دوسری طرف تلخیص البیان میں مصنف کا یہ قول موجود ہے: وقد استقصینا الکلام علی معنی هذا الخبر فی کتاب مجازات الآثار النبویة - جس سے صراحۃً یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مجازات نبویہ کی تالیف کا زمانہ مقدم ہے،

اس ظاہری تعارض کو اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ شریف رضی نے دونوں کتابوں کو ایک ہی زمانہ میں تصنیف کیا، اور چونکہ دونوں کا مسودہ ان کے سامنے تھا اس لیے دونوں میں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرنے میں کوئی استبعاد نہیں ہے،

(باقی)

مجیر بیلقانی کی غزلیں

از جناب کبیر احمد صاحب جائسی ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجیر الدین بیلقانی کا شمار چھٹی صدی ہجری کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ خاقانی جیسے استاد زمانہ کا شاگرد رشید تھا، پھر اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ خسرو جیسے عبقری نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس کو خاقانی پر ترجیح دی ہے[1] خسرو کی رائے کسی عامی کی رائے نہیں ہے کہ اس سے سرسری گذر جایا جائے، اس لیے ہم کو یہ سوچنا ہوگا کہ مجیر کی شاعری میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر خسرو نے اس کو خاقانی پر ترجیح دی ہے، اس سے جہاں مجیر کی خصوصیاتِ شعری واضح ہو کر سامنے آجائنگی وہیں خود خسرو کے نظریۂ شاعری پر بھی روشنی پڑے گی۔ اس لیے اس مضمون میں مجیر کی شاعری کا سرسری جائزہ لیا جائے گا۔

خاقانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ اپنے اشعار میں مختلف علوم و فنون کی اصطلاحیں اور تلمیحات و اشارات بکثرت استعمال کرتا ہے[2] اس لیے اس کے اشعار سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان تمام علوم و فنون سے واقف ہونا ضروری ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کے زمانے سے لے کر آج تک اس کے کلام کی شرحیں لکھی جاتی رہیں، اور لوگ اس کو ان ہی شرحوں کے ذریعہ سمجھتے اور سمجھاتے رہے۔ اس کے مقابلہ میں خاقانی کا شاگرد ہونے کے باوجود مجیر اپنے

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال [2] شعر العجم ج ۵ ص ۹ ۱۹۴۲ء

ما فی الضمیر کو صرف شاعرانہ زبان میں ادا کرنے کا عادی ہے اور سادگی و سلاست اس کے کلام کا بہترین جوہر ہیں، یہ تو یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ علوم متداولہ سے ناواقف رہا ہو، اس کے باوجود اس نے اپنی شاعری کو علوم متداولہ سے الگ ہی رکھا اور شاعری کو صرف شاعرانہ انداز سے برتا، غالباً اسی بنا پر خسرو نے اس کو خاقانی پر ترجیح دی، خسرو خود بھی صاف اور سادہ انداز میں اپنا ما فی الضمیر ادا کرتے تھے، ان کی غزلوں، قصائد، مثنویوں اور مراثی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، اسی اشتراکِ ذوق کی بنا پر ان کو مجیر، خاقانی سے بلند نظر آیا، غالباً خسرو کا خیال یہ تھا کہ علوم و فنون کی اصطلاحات و تلمیحات کی مدد سے اپنا ما فی الضمیر بیان کرنا عجز بیان کی دلیل ہے، کمال کی نہیں، ان شارات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خسرو کا نظریۂ شاعری کیا تھا؟

مجیر کا شمار آذربائیجانی شعراء میں ہوتا ہے، اس کے وطن کے بارے میں رضازادہ شفق کا بیان یہ ہے :-

"بیلقان در شمال آذربائیجان از شہرہای شہرستان اران و توابع شروانست[1]۔"

اس کی ابتدائی زندگی پردۂ خفا میں ہے، دانشمندان آذربائیجان، تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی، تاریخ ادبیاتِ ایران، تاریخ ادبیات در ایران اور اسی طرح کے دوسرے تذکروں میں اگرچہ اس کا ذکر ہے لیکن اس کے تفصیلی حالات ان میں بھی نہیں ملتے، لے دے کر صرف ایک کتاب "سخن و سخنوران" مصنفہ بدیع الزماں فروزانفر ایسی ہے جس میں اس کی زندگی اور شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، ہم اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی زندگی کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ مجیر کا خاندان بیلقان میں کسی خاص شہرت کا

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۲۳۳

مالک نہ تھا، اور نہ اس خاندان میں کوئی ادیب و شاعر تھا، اس کی والدہ کے متعلق البتہ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ حبشن تھی، اس کے ثبوت میں وہ مجیر کا مندرجہ ذیل شعر پیش کرتے ہیں:

طفلانِ طبع من بصفت ترک چہرہ اند ویں طرفہ ترکہ از حبشی بود مادرم

اس کے علاوہ اس کے خاندان کی کوئی اور تفصیل نہیں ملتی، اتنا تو سب ہی تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ وہ خاقانی کا شاگرد تھا، لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خاقانی کا کب شاگرد ہوا؟ تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ کسی بات پر آگے چل کر خاقانی اور مجیر میں اختلاف ہوگیا، اور اس حد تک بڑھا کہ دونوں نے ایک دوسرے کی بڑی مکروہ ہجویں کہیں، اس سلسلہ میں علی عبد الرسولی مرتب دیوان خاقانی کا یہ بیان خاص توجہ کا مستحق ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"مجیر بیلقانی کہ شاگردوی بود، در آغاز خاقانی را مدائح می گفت کہ ازاں جملہ است:

کلیم وقت و مسیح زمانہ خاقانی کہ عمر خضرش باد و عصمت یحییٰ

خرد بمجلسِ او ہم چو طفل در مکتب ہنر بخدمتِ او ہم چو قطرہ در دریا

نیز گوید:

ہمان شہنشہ اقلیم نظم خاقانی کہ صیت فضل ز شرو انش رفتہ تا درچین

زہی شہنشہ صاحب قران کہ خرج اورا بروزگار تر انات کس ندید قرین

و مجیر در اواخر نسبت با استاد خود ناسپاسی کرد و اہل اصفہان را ہجا گفت فضلائے اصفہان

آں ہجارا از خاقانی دانستہ شرف الدین شفروہ و جمال الدین اصفہانی مجیر و خاقانی ہر دو را ہجا گفتند

دانچہ خاقانی در حق استاد خود ابو العلا کرد و گفت از شاگردش مجیر بعوض دید و شنید[1]"

اس تفصیل کے باوجود صاحب مقدمہ نے اس بات کی صراحت نہیں کی کہ مجیر اور خاقانی

---

[1] مقدمہ دیوان خاقانی ص ح۔ ط۔ ۱۳۱۶ھ

کے اختلاف کا کیا سبب تھا؟

اسی طرح اس کے ممدوحین میں ان اشخاص کے نام آتے ہیں: (۱) سیف الدین ارسلان (مورخین اس کو مجہول الحال لکھتے ہیں) (۲) رکن الدین ارسلان بن طغرل (۵۵۵ - ۵۷۱ھ) (۳) شمس الدین ایلدگز اتابک اعظم (۵۵۵ - ۵۶۸ھ) (۴) نصرۃ الدین جہان پہلوان محمد بن ایلدگز (۵۶۸ - ۵۸۱ھ) (۵) قزل ارسلان عثمان بن ایلدگز (۵۸۱ - ۵۸۷ھ)

ابتدا میں مجیر کا شمار اس کے خاص ندما میں ہوتا تھا، لیکن جب مجیر نے جہان پہلوان کی مدح میں قصیدہ لکھا، تو نصرۃ الدین نے اثیر اخسیکتی اور جمال الدین اشہری کو مجیر کے درجہ پر فائز کر دیا، اس سے مجیر کو بڑا قلق ہوا، اور اس نے ایک قطعہ اس کے حضور میں گذرا جس کا ابتدائی شعر یہ ہے:

شاہا بدان خدای کہ آثار صنع او | جان بخشی و جود وجی بندہ پرور یست

تذکرہ نگاروں نے ان تمام ممدوحین کے نام تو لکھے ہیں لیکن کسی تذکرہ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ اول اول کس طرح اور کس کے دربار میں مجیر کی رسائی ہوئی، اور اس میں کس کا ہاتھ تھا؟ غرض مجیر کی زندگی کی جس کڑی کو ڈھونڈھئے وہ گم ہی ملے گی۔

اس کی زندگی کا ایک خاص واقعہ اسکی قید و بند ہے۔ اس سلسلہ میں جناب حسین باستانی راد نے مجلہ یادگار (بہمن ماہ ۱۳۲۴ھ) میں ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری کے لکھے ہوئے ایک مخطوطہ میں مجیر کا ایک ایسا قطعہ ملتا ہے جو ان کے نزدیک کہیں اور درج نہیں ہوا[1]، اس قطعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مجیر جس وقت اتابک محمد کی قید میں تھا، اس نے ظہیر الدین کرجی مستوفی کو ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب موخر الذکر سفر

[1] صاحب موصوف کا یہ خیال درست نہیں ہے یہ قطعہ مخطوطہ رضا لائبریری رامپور نمبر ۳۰۳۲ اور مخطوطہ رضا لائبریری رام پور نمبر ۴۹۹ ۳ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حیثیت سے آیا تھا، اس قطعہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

خداوندم ظہیر الدین ادام اللہ ایامہ — کہ از فضل و ہنر جز صدر سلطانزادگی شاید

ہمی داند بعقل کامل و رای رفیع خود — کہ چرخ ازرق الارزق و دستانزادگی شاید

صاحب مقالہ کا خیال ہے کہ مجیر جو صحیح قول کے مطابق ۵۸۶ھ میں مرا یا قتل ہوا شمس الدین ابوبکر ایلدگز (۵۴۱ - ۵۶۸ھ) اور اس کے دو لڑکوں نصرۃ الدین ابوجعفر محمد جہاں پہلوان (۵۶۸ - ۵۸۲ھ) اور مظفر الدین عثمان قزل ارسلان (۵۸۲ - ۵۸۷ھ) وغیرہ کا مدح خوان تھا، اور وہ ۵۸۶ھ تک یقیناً اس دربار سے متعلق رہا، کیونکہ اتابک قزل ارسلان ۵۸۷ھ میں قتل ہوا ہے۔ اور اس کا مرثیہ مجیر کے دیوان میں موجود ہے۔

اس قطعہ سے اس پر روشنی نہیں پڑتی کہ وہ قید کیوں کیا گیا؟ مذکورہ مخطوط میں قطعہ سے پہلے جو چند سطریں نثر میں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اتابک جہاں پہلوان جو عراق اور بعد ان پر اتابک طغرل بن ... کے ساتھ حکمرانی کر رہا تھا، اس کے عہد میں جب مجیر اس کے بھائی قزل ارسلان (جو اران کا حکمران تھا) کا سفیر بن کر آیا تو اس کو قید کر لیا گیا، لیکن اس معاملہ نے زیادہ طول نہیں کھینچا، کیونکہ رہا ہونے کے بعد مجیر نے بارہا اس کی مدح کی۔ بعد کے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مجیر کی گرفتاری جاسوسی کے شبہ میں ہوئی تھی، اس کے بعض اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں کی یہ رائے درست ہوگی۔

اس سلسلہ میں مجیر کا وہ طویل قصیدہ خاص طور سے قابل ذکر ہے جو اس نے نصرۃ الدین جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز کی مدح میں لکھا ہے، اس قصیدہ کو بیشتر تذکرہ نگار سوگندنامہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

زوار ملک جہاں روی درکشیدہ وفا — چنانکہ زو نرسد ہیچگونہ بوے بیا[1]

---

[1] منقول از نسخہ رضا لائبریری، رامپور نمبر ۲۹۵

اسی قصیدہ میں آگے چل کر کہتا ہے:

بصدر شاہ جہان نا سزام گفت حسود ... ز رشک آنکہ شدم من بصدر شاہ سزا

اس کے بعد بادشاہ کی تعریف کر کے اپنی صفائی میں اس طرح قسمیں کھاتا ہے:

بکاف وہا و بیا سین و آیۃ الکرسی ... بقاف و صاد و بالکہف و سورۂ شعرا

بمہر ختم نبوت کز نور شد ارو ساخت ... نسیم دعوتش از پنجہ ہای زہر گیا

بصدق ہمدم ہجرت بعدل شمع بہشت ... بحزن خستۂ غوغا بسر صف وغا

بتشنہ مردہ کہ بر رشک غنچۂ سیراب ... بزہر خوردہ کہ بر نور دیدہ زہرا

اسی طرح قسموں پر قسمیں کھاتا ہوا آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ

بخوردم این ہمہ سوگند و باز میگویم ... بذات پاک مہیمن بعز عز خدا

کہ زرق خالص بہتان محض بود آن نقل ... کہ نقل رفت از آنہا کہ کردہ ام آنہا

نگفتہ ام نگذشتست بر دلم ہرگز ... نکردہ ہیچکس از بندہ این سخن اصغا

حدیث من ز مفاعیل و فاعلات بود ... من از کجا سخن سر مملکت ز کجا

من از کجا چہ کسم کیستم چہ خواندم ... کہ بیش دل بود ار چو منی غبار ترا

شہا تو شیر خدای من آن سگ در تو ... کہ بی گناہ تر از گرگ یوسفم حقا

ان اشعار سے بدیع الزماں بشرویہ ای خراسانی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

"حسودان فرصتی جستہ او را با فشای اسرار جہان پہلوان متہم داشتند تا بر وی خشم آورد از دیدار و نواخت خود مہجور کرد..."[1]

---

[1] سخن و سخنوران، قسمت نخستین از ج ۲ ص ۲۶۴، ۲۶۵ سنہ ندارد

ہمارا قیاس یہ ہے کہ یہ سوگند نامہ اسی زمانہ کی یادگار ہے، جب وہ قید سے چھوٹا تھا، اور اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے یہ سوگند نامہ لکھا تھا۔

اس قصیدہ کے علاوہ اور بھی ایسے قصائد ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اس کے حاسدوں نے اس کی زندگی تنگ کر دی تھی اور ان کے مسلسل حملوں کی وجہ سے بعض اوقات وہ معاشی دشواریوں میں بھی مبتلا ہو جاتا تھا، مثلاً ایک قصیدہ میں جس کا مطلع یہ ہے:

ہر شب کہ سر بجیب تحیر فرو برم — ستر فلک بدرم واز سدرہ بگذرم

اپنے بارے میں یوں رقمطراز ہے

زہر زمانہ گر بقناعت توان شکست — باور کنم کہ من ہمہ تریاک اکبرم
ہر شب قبای صبر بسوزم بآہ گرم — وز دست صبح پیرہن خویش بر درم
ہمچو نمک گداخت تن من در آب چشم — دیں دہر بی نمک نزد آبی بر آورم
بر طمع لقمہ لب چہ کشایم نہ کاسہ ام — وز بہر آب ترچہ نشینم نہ ساغرم[1]

اسی طرح ایک دوسرے قصیدہ میں اپنا حال زبوں یوں بیان کرتا ہے:

تا دست خوش جہان شدم من — در دست قنا عتم مکن
خصم فلک است از انکہ ہستم — من مادر عیسیٰ ادستردن
شب دوست از ان شدم کہ در شب — خورشید نیاورم بروزن
شمع فلک ار نسازدم قوت — چوں شمع کنم نوالہ از تن
از خود زبرای خود بسازم — مانندۂ عنکبوت مسکن
میداں عجب است وگوی زرین — من کودک واسب عمر توسن[2]

---

[1] منقول از نسخۂ رامپور نمبر ۵۹۵۴ [2] منقول از نسخۂ برٹش میوزیم نمبر 993 .Add

ان اشعار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مجیر کی زندگی نشیب و فراز سے دوچار رہی ہے، اور وہ اپنے زمانے کے امراء اور بادشاہوں کا مدح خواں ہونے کے باوجود بعض اوقات تنگی ترشی سے زندگی بسر کرتا تھا، اور حاسدوں کی الزام تراشی سے اس کو بار بار بادشاہ کی خدمت میں صفائی دینی پڑتی۔ محمد ابن روادی کی مدح کے ایک قصیدہ میں یوں گویا ہوتا ہے:

جہاں پناہا من عاجزم ز مدحت تو — کہ ہست بر دلم از مکر حاسداں آزار[1]
ببارگاہ تو از بندہ نقل ہا کردند — کز آں نشستہ بر اطراف خاطر تو غبار

ان اشعار کے بعد وہ پے در پے قسمیں کھانی شروع کرتا ہے، مثلاً

بلطف قبۂ اعظم بقدر عرش مجید — بحسن و زینت جنت بقہر و صدمۂ نار
بامر و نہی و بوعد و وعید مصحف مجد — کہ ہست فاتحۂ گنج نامۂ اسرار
بصدق یوسف مصری ببی گناہی گرگ — بنغمۂ خوش داؤد و لحن موسیقار
بعابدان کہ جہاں را نکردہ اند قبول — بزاہداں کہ صفا را نکردہ اند انکار

مسلسل پندرہ بیت تک قسمیں کھانے کے بعد پھر اس طرح عرض حال کرتا ہے:

بخاکپای تو ای معدنِ سخا و کرم — بخاکپای تو ای مرکز سکون و قرار
کہ بندۂ تو مجیر از ہر آنچہ گفت حسود — خبر ندارد و بر خاطرش نکردہ گزار

ان قصائد کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے اشعار ہیں جو اس کے اندرونی کرب کو ظاہر کرتے ہیں، اگر مندرجۂ ذیل اشعار کو مندرجۂ بالا اشعار سے ملا کر پڑھا جائے تو ہماری بات کی تصدیق ہو سکتی ہے، مثال کے طور پر چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

یک ذرۂ مہر در دل ایام ماندہ نیست — یک قطرۂ آب در د اجرام ماندہ نیست[2]

---

[1] منقول از نسخۂ برٹش میوزیم نمبر ۸۹۹۳ Add [2] ایضاً

تا جام روزگار پُر از خونِ خلق شد — کس را شراب خوش ز دور جام ماندہ نیست
گلگونۂ موافقت و تابِ عافیت — در روی و بر و طرۂ ایام ماندہ نیست
دلہا ز غم بسوخت مگر خرمی بمرد — جز دل شکستہ ماند مگر جام ماندہ نیست
تا دار ملک زاں سوی عالم بساختم — خود را از کائنات مسلّم بساختم[۱]
بر چیز جہاں گذرم بود از آں سبب — تن چوں رسن نزار پُر از غم بساختم
دیدم کہ زخم حادثہ مرہم پذیر نیست — با زخم بی حمایت مرہم بساختم
دیدم کہ ملک فقر من از ملک جم بہ است — نزدام کردم از رخ و خاتم بساختم

زندگی کی اس کشاکش اور حاسدوں کی مخالفت نے اس قصیدہ گو شاعر کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے صنفِ غزل کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہم اس مضمون میں ہم اس کی غزلوں کا ایک جائزہ لیتے ہیں، اس سے اس کے اصل جذبات و احساسات ہمارے سامنے آجائیں گے اور اسکے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ چھٹی صدی ہجری میں غزل گوئی کا کیا انداز و معیار تھا؟

مجیر کی غزل گوئی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے پیش رو اور استاد خاقانی کی غزل گوئی کا جائزہ لینا مناسب ہوگا، جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ مجیر کے دور تک آتے آتے غزل کس رنگ اور آہنگ میں ڈھل چکی تھی، اس جائزہ کے بعد جب ہم مجیر کی غزلوں کا مطالعہ کریں گے تو اس کی غزلوں کی قدر و قیمت پوری واضح ہو جائے گی،

خاقانی کی غزلوں کے مطالعہ سے سب سے پہلے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس دور تک آتے آتے قصیدہ اور غزل کی زبانیں دو الگ الگ زبانیں بن چکی تھیں، خاقانی جو قصیدہ میں پُرشکوہ الفاظ، دور از کار تشبیہات، بعید از فہم استعارات، اور مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کے استعمال

۱؎ منقول از نسخۂ برٹش میوزیم نمبر ۸۹۹۳ Add

میں بادشاہ گر دانا جاتا ہے، جب غزل کی وادی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی زبان یکسر بدل جاتی ہے، نہ الفاظ کا وہ شکوہ رہتا ہے، نہ تشبیہات و استعارات کی وہ غرابت، نہ اصطلاحات علمیہ کا استعمال، اس کے بجائے وہ نرم و شیریں الفاظ، نادر لیکن قریب الفہم تشبیہات و استعارات کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے، اگر اس کی غزلوں کے مقطعے نکال دیے جائیں اور ان کو الگ سے شائع کر دیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ یہ اسی شاعر کی غزلیں ہیں جس کے قصائد شکوہ الفاظ اور اصطلاحات علمیہ کی بھرمار سے گرانبار اور عام لوگوں کی سمجھ سے باہر تھے، یہ ضرور ہے کہ اس زمانہ میں غزل بہت زیادہ وسیع صنفِ سخن کی حیثیت نہ اختیار کر سکی تھی اور اس میں ان فلسفیانہ افکار و خیالات کی آمیزش نہ ہونے پائی تھی جو سعدی و حافظ کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے، لیکن جو کچھ اور جس طرح کی غزل اس دور تک بن سکی تھی وہ بھی جذبات دل کے اظہار کا کام اسی طرح انجام دیتی تھی جس طرح بعد کی غزل نے انجام دیا، اس کے نمونہ کے لیے خاقانی کی چند غزلیں درج کیجاتی ہیں،

کارِ عشق از وصل و ہجران درگذشت دردما از دستِ درمان درگذشت
کار صعب آمد ہمت بر فرو ز گوئی تیز آمد ز چوگان درگذشت
در زمانہ کار کارِ عشق تست از سرایں کار نتوان درگذشت
کی رسم در تو کہ رخش وصلِ تو از زمانہ بیت میدان درگذشت
فتنۂ عشق تو پر دارد جہاں خاصہ مید اند کہ سلطان درگذشت

جوی خون داماں خاقانی گرفت
دامنش چہ کز گریبان درگذشت

ذرہ نماید آفتاب از بکمالِ تو رسد عین کمال ختہ باد ار بکمالِ تو رسد
ماہ منی و ماہ را چرخ فدای تو دہد گر بہ یار دشمنان وقت زوال تو رسد

چشم زمانه را فلک میل زوال درکشد | گر نظری کند او سوی جمالِ تو رسد
یافتن وصال تو کار نه چون منی بود | دولت دیگری بود کو بوصال تو رسد
چشم من از هزار سال از پی روی تو رود | گر برسد بعاقبت هم بخیالِ تو رسد

دیدهٔ خاقنی اگر لافِ جمال تو زند
کس نکند قبول از و کان بمثال تو رسد[1]

از هستیٔ خود که یاد دارم | جز سایه نماند یادگارم
در سایه ز من برید ه گردد | هم نیست عجب ز روزگارم
چون یار ز من برید سایه | چون سایه ز من رمید یارم
از هم نفسان مرا چرا غیست | زان هیچ نفس زدن نیارم
زان بیم که از نفس بمیرد | در کام نفس شکسته دارم
چون هم نفسی کنم تمنا | بر آئینه چشم بر گمارم
ترسم ز نفاق آئینه هم | زان نتوانم که دم برآرم
خاقانی دار دام ایام | از کیسهٔ عمر می گذارم

ای راحتِ جانها بتو آرام جان کیستی | دل در هوس جان میدهد تو دلستانِ کیستی
ای گلبن نادیده دی اصل تو چه وصل تو کی | با بوی مشک و رنگ می از گلستانِ کیستی
ای از بتان دلخواه تو در حسن شاهنشاه تو | مارا بگو ای ماه تو کز آسمانِ کیستی
بگشا صدف یعنی دهن بفشان گهر یعنی سخن | پنهان مکن یعنی ز من تا عاشق دان کیستی

---

[1] اس غزل کو پڑھ کر بے ساختہ خسرو کی وہ غزل یاد آجاتی ہے جس کا مطلع یہ ہے؛

ای ز خیالِ ما برون در تو خیال کی رسد | با صفت تو عقل را لافِ کمال کی رسد

چو ز یر ہر موی جدا یک شہر جانداری فزا — خامی بود گفتن ترا جانا کہ جان کیستی؟
با مالی و ما را نہ جانی از آن پیدا نہ — دانم کز آن ما نہ بر گو از آن کیستی؟
خاقانی از تیمار تو حیران شدہ اندر کار تو
ای جان اد غم خوار تو تو غم نشان کیستی؟

ان غزلوں میں نہ تو دقیق فلسفیانہ یا متصوفانہ خیالات ہیں نہ حیات وکائنات پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے، نہ انسانی زندگی کے مسائل سے بحث کی گئی ہے، اور نہ بات کو پیچ در پیچ استعارات و تشبیہات سے اس طرح گرانبار کیا گیا ہے کہ پہلی نظر میں نادر اور غور وفکر کے بعد بیکار نظر آئے، ان غزلوں کی اہمیت صرف یہ ہے کہ یہ قصائد کے مقابلہ میں ایک الگ اور جداگانہ زبان کی حامل ہیں، اور غزل میں ہر وہ چیز معائب شعری میں داخل ہے، جو قصیدہ کے لیے محاسن شمار کیے جاتے ہیں، اس کو دوسرے انداز میں اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ غزل کے خیالات اور مضامین جس انداز بیان کے متقاضی ہیں انھوں نے خاقانی جیسے سحر بیان و نادر الکلام شاعر کو بھی اس بات پر مجبور کیا کہ وہ غزل کی وادی میں قصائد کی زبان سے دست بردار ہو کر قدم رکھے اور وہی زبان و انداز بیان اختیار کرے غزل کی لطافت جس کی متحمل ہو سکے، اس سے غزل اور خاقانی دونوں کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، غزل کی عظمت یہ ہے کہ اس نے خاقانی جیسے شاعر کو بھی اپنی وادی میں اس وقت تک قدم نہ رکھنے دیا جب تک وہ دوسرے اصناف سخن کی زبان سے دست بردار نہ ہو گیا، اور خاقانی کی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ اس نے تقاضائے ہنر کو مد نظر رکھتے ہوئے اس زبان و انداز بیان کو بے تکلف چھوڑ دیا جس کا اگر وہ خاتم نہیں ہو تو موجد ضرور ہے، اس مناسبت کی وجہ سے غزل کو خاقانی سے اور خاقانی کو غزل سے پورا پورا فیض پہنچا، اور غزل کا یہ بنا بنایا سانچہ مجیر بیلقانی کو وراثۃً ملا، اگر اس موقع پر مجیر کے معاصرین کے کلام پر بھی سرسری نظر ڈالی جائے تو مجیر کی غزلوں کی قدر و قیمت

کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوگی، ظہیر کے معاصرین میں اثیر اخسیکتی، جمال الدین اصفہانی اور شرف شفروہ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ یوں تو ظہیر کے دور کا ہر شاعر اس کا مخالف تھا، مگر اس زمانہ میں بھی ظہیر کا ہم پایہ اگر کوئی شاعر سمجھا جاتا تھا تو وہ اثیر اخسیکتی تھا، اس لیے ہم صرف اس کے کلام سے چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، خوش قسمتی سے اثیر کا دیوان ایران میں شائع ہو چکا ہے، جس کا ایک نسخہ پیش نظر ہے، ظہیر کا دیوان یا کلیات ابتک شائع نہیں ہوا ہے، راقم آجکل اس کی ترتیب و تصحیح و تحشیہ میں مصروف ہے، اثیر کی چند غزلیں ملاحظہ ہوں :-

طبیبِ درد بی درماں کدامست   رفیقِ راہ بی پایاں کدامست
ہمی دانم وثاق دوست جانی   اگر دانستنی جاں کان کدامست
گر این عقلست پس دیوانگی چیست   درایں جانست پس جاناں کدامست
کسی کو را بجاں جوید نگوید   کہ باری زحمتِ ونداں کدامست
نمی داند کسی درمانِ ایں درد   طبیبِ عشق را دکاں کدامست

اثیرا دم مزن او خود شناسد
کہ سرکش کیست سرگرداں کدامست

ہر کہ در دامنِ تو آویزد   نچناں افتد او کہ برخیزد
عشق تو صد ہزار صف شکند   کہ یکی گرد بر نیا نگیزد
یا لبت کشِ غذای توبہ دہاد   ہیچ گویم کہ باز نستیزد
جانِ سرگشتہ رحبہ می طلبد   تا ز جودت دوا بہ بگریزد

ہر کہ حالِ اثیر بشنود شد
از سرِ کوی تو . بپرہیزد

باز در دستِ چرخ بگدازم — پایمالِ جهانِ طنّازم
هجر بردوخت دیدهٔ طربم — عشق بدرید پردهٔ رازم
نیست پای گریز می‌باشم — نیست دستِ ستیز می‌سازم
گر برآرم هزار ناله ولی — چرخ شوری کند بر آوازم
دهر پُرفتنه کس می‌جویم — راه پُرحادثه است می‌تازم

بیم جانست سست می‌کوشم

دست خونست دیده همی بازم

جانم فدای تو است که جانانِ من تویی — شمع وثاق و تازه گلستانِ من تویی
هستند شاهدانِ شکرلب بعهدِ تو — لیکن از آن میانه بدندانِ من تویی
جان بر سرِ غمِ تو نهم وز من این سخن — بی حرمتیست جان چه بود جانِ من تویی
در عشقِ تو بخدمتِ سلطان برآمدم — ای مرسعادت تو که سلطانِ من تویی
آنکس که گفت اثیر بزنگان چه میکنی — زین نکته غافلست که زنگانِ من تویی

زلف چون بر عذار می‌فگنی — لیل را در نهار می‌فگنی
چون لبت مست لطف میگردد — باده را در خمار می‌فگنی
جانی آویخته است بر فتراک — تا نظر در شکار می‌فگنی
هرکجا مهر درمیان آمد — خویشتن برکنار می‌فگنی
خر ما با تو کی دود که بجور — اسب بر روزگار می‌فگنی
هم چو سوزن اگرچه سرتیزی — بخیه بر روی کار می‌فگنی
صف ناموس تو شکست آرد — زانکه در چنگ یار می‌فگنی

اثیر کی غزلوں کا اگر غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قصیدہ نگاری میں اس کا پایہ جو بھی رہا ہو لیکن غزل میں اس کے یہاں اتنی معنی آفرینی بھی نہیں ہے جتنی اس کے پیش رو خاقانی کی غزلوں میں ملتی ہے، حالانکہ خاقانی کی غزلیں بھی معنی آفرینی کا کوئی بہت اعلیٰ نمونہ نہیں ہیں، اور تاریخ ادبیات میں صرف اس لحاظ سے ان کی اہمیت ہے کہ وہ خاقانی جیسے قصیدہ گو کی غزلیں ہیں جس نے غزل کی شریعت کے احترام میں اپنے شکوہ الفاظ کو یہاں بالائے طاق رکھ دیا تھا، اثیر کی غزلوں میں نہ تو ندرتِ خیال ہے نہ جدتِ ادا، نہ الفاظ کا حسن ہے، نہ ترکیبوں کی رعنائی، اس کے دیوان کے صفحہ کے صفحہ پڑھ جایئے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ وہ صنفِ سخن ہے جس کے پردے میں دل کی بات کہی جاتی ہے، البتہ یہ غزلیں قافیہ پیمائی کی بہترین مثالیں ہیں، تعجب ہے کہ ایک ایسے شاعر کے لیے کہا جاتا ہے کہ مجیر اس کے کلام سے سرقہ کرتا تھا، اور اس کا بیشتر کلام سرقہ ہی پر مشتمل ہے، مجیر کی غزلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلاشبہہ اثیر سے بدرجہا بہتر شاعر تھا، اس لیے مجیر کا اثیر کے کلام سے سرقہ محض افسانہ ہے، اس موقع پر ہم دیوان اثیر کے مرتب رکن الدین ہمایون فرخ کی تحریر کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے مجیر کے متعلق اس کی رائے کا اندازہ ہوگا،

"آثار اثیر را مجیر ہیچ قابل مقائسہ و سنجش نیست، اثیر شاعریست مبتکر و خلاق، مجیر شاعریست مقلد و کار تقلید او تا جای است کہ چون اثیر را عارف و صوفی دیدہ و خاقانی را شاعری زاہد یافتہ در اشعارش از عرفان و تصوف لفظی دم زدہ است[۱]"

رکن الدین ہمایون نے یہ رائے مندرجۂ ذیل وجوہ کی بنا پر قائم کی ہے:

(۱) خاقانی نے بھی مجیر کو دزد بیان کہا ہے مثلاً

دیدہ یحییم آنکہ بود دزد بیانم ۔۔۔ گردم طغیان دزد ہجای صفاہان

[۱] دیوان اثیر شرح حال ہشتاد و یک

(۲) اثیر کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے :

لشکر زنگ بر ختن چو زنی گرہ مشک بر سمن چو زنی

مجیر نے بھی اسی زمین میں غزل کہی ہے اور اثیر کے دو اشعار ادنیٰ تغیر کے بعد اپنی غزل میں شامل کر لیے ہیں۔

(۳) اثیر نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے :

آنرا کہ چار گوشۂ عزلت میسر است گو نوبہ پنج کن کہ شہ ہفت کشور است

مجیر نے اثیر کے قصیدہ سے مضامین اخذ کر کے اسی زمین میں یہ قصیدہ کہا :

سرو ی کہ بر بهش ز شب تیرہ چنبر است لولوش زیر لعل و گلش زیر عبہر است

(۴) اسی طرح اثیر کا ایک اور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے :

طفل دو چند از ین دایۂ نامہربان گاہ قماط بہار گہ کفن مہرگان

مجیر نے تین مطالع کا ایک قصیدہ اسی زمین میں لکھا جس میں اثیر کے مضامین اڑائے ہیں، مجیر کا ایک مطلع یہ ہے :

طارم چارم نهفت پرتو شمع جہاں خیمۂ زربفت گشت لز تبیٔ آسماں

اس کے بعد فاضل مرتب نے مجیر کی ایک غزل اور اثیر کا مطلع نقل کر کے لکھا ہے :۔

"ایں غزل مجیر را می آوریم و خوانندگاں باید با غزل اثیر مقابلہ و مقائسہ فرمایند"

ہم اس موقع پر دونوں کے اشعار پیش کرتے ہیں :۔

اثیر اخسیکتی	مجیر بیلقانی
بہار اامسال خوشتر می نماید	دم گیتی معنبر می نماید
چمن چوں نقشِ آذر می نماید	چمن از خلد خوشتر می نماید

مجیر بلقانی	اثیر اخسیکتی
ہوا وز تیغ لولو می فشاند	چناں شد عارض بستاں کہ باد
جہاں از باد زیوری نماید	خط خوباں مزور می نماید
بتوقیع شریف صفت اللہ[1]	ز گلی برگ و سیاہی شگوفہ
جہاں برگل معنبری نماید	زمیں، چرخ پُر اختر می نماید
شقایق داغ بردل برنہادہ ست[2]	گہی میغ اشک عاشق می فشاند
کہ گل چیں دست برسری نماید	گہی گل روی دلبر می نماید
زہی شکر زہی آتش زہی عود	نشستہ در پس ہر ذرۂ خاک
کہ ایں ہیر وزہ مجمر می نماید	دو صد عطار و شکر می نماید
ز بہر بوسہ دادن بر لب گل	ز نرگس باغ را چشمی رسیدہ است
کہ سوسن از دہان زر می نماید	کہ لالہ شک و مجمر می نماید
نرگس شوخی و شوخی بین نرگس	دریں موسم اثیر از یار محروم
کہ عطار است و شکر می نماید[3]	ستمہا بیں کہ داور می نماید

میرے سامنے دیوان مجیر کے پانچ قلمی نسخوں کی نقل اور ان کے روٹو گرافس ہیں، مجیر کے مذکورۂ بالا اشعار تین نسخوں میں ملتے ہیں، یعنی برٹش میوزیم کے نسخے میں اور رضا لائبریری رامپور کے دو نسخوں میں، ایک جس کا نمبر ۵۹۴ ہے اور دوسرا وہ جس کا نمبر ۳۲۰۳ ہے۔ ان تینوں نسخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مندرجۂ بالا اشعار کسی غزل کے نہیں بلکہ ایک قصیدہ کے ہیں، رامپور کے اس نسخے میں جس کا نمبر ۵۹۴ ہے، اشعار کی تعداد ۱۵ ہے، رامپور کے دوسرے

۱، ۲ و ۳ یہ اشعار دیوان اثیر کے مرتب نے اسی طرح لکھے ہیں (رک دیوان اثیر)

نسخے میں ۶۴ اور برٹش میوزیم والے نسخے میں ۳۹۰۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ چند لفظی مماثلتوں کی بنا پر فاضل مرتب دیوان اثیر ۵ اشعار کے قصیدہ ۰ پر ۲ شعر کی غزل کو کس طرح ترجیح دیدی؟ اور مجیر کو سارق قرار دینے کی اصل وجہ کیا ہے؟ لطف یہ ہے کہ مرتب نے مجیر کے اشعار کا جو متن دیا ہے وہ ناقص بھی ہے، برٹش میوزیم کے نسخے سے مجیر کے اشعار کی تصحیح کیجاتی ہے، اس کے مطابق تیسرے چوتھے اور آخری شعر کی شکل یہ ہے:

بتو قیع شریف صبغۃ اللہ جہان بر گل مقرر می نماید[۱]
شقایق داغ بر دل زاں نشستہ است کہ گلبن دست بر سر می نماید[۲]
مکن شوخی و شوخی بیں ز نرگس کہ عطار است و زرگر می نماید[۳]

اس غلط متن پر تکیہ کرنے کی بنا پر موصوف نے جو غلط نتیجہ اخذ فرمایا ہے، اس کے بارے میں ہم سردست کوئی بحث نہ کریں گے، البتہ اس غزل کو ضرور پیش کریں گے جس کے بارہ میں فاضل مرتب کا خیال ہے کہ مجیر نے اس کے اشعار قدرے تبدیلی کے بعد اڑا لیے ہیں، دونوں کی غزلیں درج ذیل ہیں:-

اثیر	مجیر
گر مشک بر سمن چہ زنی	گرہ مشک بر سمن چہ زنی
لشکر زنگ بر ختن چہ زنی	لشکر زنگ بر ختن چہ زنی
چوں ز لعل تو بوسۂ طلبم	او بر نجد بدیں نشد ر بد بد
بر شکر لو لو عدن چہ زنی	تو لکد بر فتوح من چہ زنی
صد گریباں دریدہ است از تو	چوں ز لعل تو بوسۂ طلبم
چاک بر طرف پیرہن چہ زنی	بر شکر لو لو عدن چہ زنی

۱ و ۲ و ۳ رک نسخہ برٹش میوزیم

مجیر	اثیر
صد گریباں دریدہ شد زغمت	چوں تو گوئی کہ جاں نفس بزنم
چاک بر طرف پیرہن چہ زنی	من چہ گویم کہ بوسہ تن چہ زنی
دلم از غم بسوخت دم چہ دہی	بر لب اوست خط اجرہ تو
غم تو دل ربود تن چہ زنی	دست بر زلف پرشکن چہ زنی
ہر زمانی مرا کہ مرغ توام	عاشقی ای اثیر و یار تو اوست
سینہ بر نوک بازن چہ زنی	ہمہ دانند لاو لن چہ زنی
چوں ز تو دل شکستہ گشت مجیر	(دیوان اثیر ص ۳۹۳)
بر دلش زخم دل شکن چہ زنی	مشک می رنگ بر سمن چہ زنی
(نسخۂ رامپور نمبر ۲۹۵)	شب در ہندا بر بدن چہ زنی
	با سپہ زنگ سرکشی چہ کنی
	خیمہ بر دامن ختن چہ زنی
	تو مہی ای پسر برہنہ بہی
	بر تن از ابر پیرہن چہ زنی
	بادہ دہ موسم است سر چہ کشی
	بوسہ دہ فرصت است تن چہ زنی
	بر رخ دعا رضش رسید اثیر
	شعر در وصف یاسمن چہ زنی
	(ص ۴۰۴ ۔ ۴۰۵)

([illegible])

مجیر کے مندرجہ بالا اشعار نہ تو برٹش میوزیم والے نسخے میں ہیں اور نہ رامپور کے دوسرے دونوں نسخوں میں، البتہ بیاض ابن یغمور میں جس کا مخطوطہ گورنمنٹ اورینٹل لائبریری مدراس میں ہے، یہ اشعار خفیف لفظی تبدیلیوں کے ساتھ ملتے ہیں، لیکن اثیر کا یہ شعر

از برای خدا خواجہ مجیر   کار دانہای شعر من چہ زنی

جس پر فاضل مرتب دیوان اثیر نے اپنی عمارت کھڑی کی ہے، خود ان کے مرتب کردہ متن میں بھی کہیں نہیں ہے، اس سے ہم کو یہ شبہہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ شعر اثیر کا نہ ہو اور بعد کے کسی شاعر نے تفنن طبع کے لیے یہ شعر کہا ہو، اور چونکہ اسی زمین، ردیف اور قوافی میں اثیر کی بھی غزل ہے، اس لیے اثیر کے نام سے مشہور ہو گیا ہو، دوسری بات یہ ہے کہ جو مطلع اور دو شعر اثیر اور مجیر کے یہاں مشترک ہیں، اس کی بنا پر مجیر پر سرقہ کا الزام لگانا درست نہیں ہے، کیونکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی زمین، ردیف اور قوافی میں دو شاعروں کی غزلوں میں، ایک شاعر کے اشعار دوسرے شاعر کی غزل میں شامل ہو جاتے ہیں، یہی صورت اثیر اور مجیر کی غزلوں میں پیش آئی، ورنہ جو شاعر اس طرح کی غزلیں کہہ سکنے پر قادر ہو، وہ کسی شاعر کا ایک مطلع اور صرف دو شعر کیوں سرقہ کرے گا؟

چہ بد کردم کہ پیمانم شکستی   امید وصل در جانم شکستی
بعشوہ پردۂ مہرم ربودی   بغمزہ مہر ایمانم شکستی
چو در میدان عشقت گوی گشتم   بگیسوش[1] ہم چو چوگانم شکستی
بہ شواری چو یاقوتم خریدی   بسنگ عشوہ آسانم شکستی
مرا گوئی چہ بد کردم چہ کردی   دلم بستی و پیمانم شکستی
فغان میداشتم لب عرض کردی   بدان تا در لب افغانم شکستی

---

[1] اصل میں بگیسو کی جگہ بزلف لکھا ہوا ہے،

چہ گوئی گر مجیرت گوید ای شوخ
چرا در عشق ازیں سانم شکستی (نسخۂ رامپور نمبر ۴۹۵)

درکوی تو عقل بے قراریست | بی روی تو روح سوگواریست
ہر ناز ز نرگس تو زہریست[۱] | ہر موی ز طرۂ تو ماریست
نومیدیم ز کار وصلت[۲] | زیرا کہ زمانہ ہم بکاریست
وصلت ز تو تحفت بس ہجر | آری بس ہر منی خاریست
خود عشق نہ درخوراست یارا | مارا نہ دلی نہ روزگاریست
شادم کہ مجیر در غم تو
از ہر چہ گذشت یادگاریست (ایضاً)

غمی دارم کہ ہرگز کم نگردد | دلی دارم کہ گرد غم نگردد
بجان زخم ترا مرہم کردیا یہ | اگر ہم زخم تو مرہم نگردد
ہنوز آں دل نزد بر درد عالم | کہ با او درد تو مرہم نگردد
زلب صفرای من بشکن میندیش | کہ سوز ہیچکس ماتم نگردد
چناں سازی بموی کار صد دل | کہ از حسن تو موی کم نگردد
جفا کن گر کنی کاری کہ امروز
وفا در خطۂ عالم نہ گردد (ایضاً نمبر ۳۲۰۳)

زعالم دلربای بر نیاید | کز و سوز جفای بر نیاید
چگویم من تو خود دانی کہ ہرگز | بباغ کس گیاہی بر نیاید

---

[۱] رامپور کے دوسرے نسخے میں زہریست کی جگہ تیریست ہو، [۲] رامپور کے نسخے نمبر ۴۹۵ میں یہ شعر نہیں ہو،

نشد روزی شبِ هرگز که از در — بدستِ غم خطای برنیاید
شد از سازِ ارغنونِ عمر افسوس — کز و باغِ نوای برنیاید
هزاران دل بکوی غم فرو شد — که هیچ آوازِ پای برنیاید

زمانه جامهٔ راحت چنان یافت
کز و کس را قبای برنیاید (نسخهٔ رامپور نمبر ۳۲۰۳)

نیک بد عهد گشت یار این بار — سخت سست است شکل کار این بار
یار بُد درکنار هر باری — غم یار است درکنار این بار
از قراری که داشت با او دل — بی قراریست برقرار این بار
هم بره بر بماند لاشهٔ صبر — هم بگل در بماند بار این بار
یار زنهار خورد و باک نداشت — ای دلِ خسته زینهار این بار

باز دارای مجیر کوشش بخود
گو فتادی ز چشم یار این بار (ایضاً)

کار عالم نیک و بد هم هیچ بر بنیاد نیست — بر دلِ خاصان زعالم جز غم و بیداد نیست[1]
داده ام انصاف و میدانم یقین کاندر جهان — هیچکس را خاطری از بندِ غم آزاد نیست
خانهٔ جان گرچه آباد است از آن چه سود — چون زمانی خانهٔ دل از طرب آزاد نیست
زیر دستِ رنج عالم نیست الا طبعِ ما — پایمالِ عشق شیرین جز دلِ فرهاد نیست

در جوانی تازه بودن لازم است از بهر آنک
آدمی را حس سرو و قامت شمشاد نیست (نسخهٔ برٹش میوزیم) (باقی)

---

[1] یہ متن دیوان نسخهٔ مجیر بیلقانی آزاد لائبریری علی گڑھ (یونیورسٹی ضمیمہ نمبر ۳/۴۴) سے

سکندر لودھی کے ہندوستان

کا

علمی، عمرانی اور ثقافتی مطالعہ

از

جناب ذکاء صدیقی ایم اے، لکچرر فارسی، گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صرف بیس سال کے اندر، اندر عرب تمام مصر، ایران، فلسطین اور شام کے مالک بن چکے تھے، عام خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے جو مسلمان آئے وہ ترک تھے، یہ خیال صحیح نہیں ہے، یہاں بھی اولیت کا شرف عربوں ہی کو حاصل ہے، وہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت ۳۰-۶۳۶ء میں ہندوستان کو اپنی جولان گاہ بنا چکے تھے، پھر کوئی ساڑھے پانچ سو سال تک سناٹا رہا، ۱۱۹۲ء میں محمد غوری اٹھا، پہاڑوں کو عبور کرتا اور میدانوں کو لپیٹتا ہندوستان آیا اور اس کا نقشہ بدل کر رکھ دیا، اس وقت سے لیکر ۶۶۵ سال بعد تک مسلمان یہاں پورے جاہ جلال کے ساتھ حکومت کرتے رہے، ۱۸۵۷ء میں سلالۂ تیمور کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے چراغ سحری کو لندن سے چلنے والی باد مخالف نے بجھا دیا ـــ ہمیشہ رہے نام اللہ کا

محمد غوری کا جانشین خاندانِ غلاماں ہوا۔ ان کے بعد خلجی آئے، خلجیوں کی ترکی ملک کافور کے سیاہ کارناموں نے تمام کی تو غیاث الدین تغلق کا گھر روشن ہوا، تغلق خاندان کے عہد حکومت

ہی میں تیمور قہر الٰہی کی شکل میں ہندوستان پر نازل ہوا[1]، یہ قیامت صغریٰ ۱۳۹۸ء میں برپا ہوئی،
آخری تغلق بادشاہ سلطان محمود کے انتقال (۱۴۱۲ء) کے بعد نہ صرف ترکوں کی بادشاہت کا خاتمہ
ہوگیا بلکہ سلطنت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، مالوہ، گجرات، جونپور، خاندیش، گلبرگہ، بیدر، اور وجے نگر
کی ریاستیں وجود میں آئیں، دلی خضر خاں کے حصہ میں آئی، اس کے جانشین نہایت کمزور ہوئے،
آخر علاء الدین عالم شاہ کے بھتیجے ایک پٹھان سردار بہلول لودھی نے بھولے بھالے سید عالم شاہ
کی سیادت کی بساط الٹ دی اور خود دلی کا حاکم بن بیٹھا، یہ واقعہ اپریل ۱۴۵۱ء میں پیش آیا۔

اس موقع پر تمام ہندوستان چھوٹے بڑے صوبوں، ریاستوں، اور جاگیروں میں بٹا ہوا تھا،
دکن، گجرات، مالوہ، جونپور، بنگال، سنبھل، اٹاوہ، کول (علی گڑھ)، بیانہ وانیٹہ میں خود مختار امرا
اور صوبیدار کوس لمن الملک بجاتے تھے، بہلول تجربہ کار جنرل ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے
کا مدبر بھی تھا، وہ نہایت صبر وتحمل سے اپنی خارجہ پالیسی بروئے کار لاتا رہا، جو تخت پر بیٹھتے ہی
اس نے اپنے پٹھان سرداروں کے صلاح ومشورے سے بنائی تھی، اس پالیسی میں تلوار کی کاٹ
کے ساتھ چرب زبانی کا مرہم بھی تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہ ۱۴۸۸ء میں مرا ہے تو دلی کا
کھویا ہوا وقار دوبارہ جم چکا تھا،

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نظام خاں، ۱۷ شعبان ۸۹۴ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۴۸۹ء
کو سکندر شاہ کے لقب سے تخت حکومت پر متمکن ہوا[2]، ہم اس مضمون میں سکندر اور اس کے عہد
کا تفصیلی مطالعہ کریں گے،

---

[1] علاء الدین ابن عطا ملک جوینی نے تاریخ جہاں کشا میں تیمور کے جد چنگیز خاں کے سلسلے میں یہ عربی ٹکڑا لکھا ہے
اولئک ھم فرسانی، بھم انتقم ممن عصانی، اگر تیمور کے عہد کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو عربی کا یہ ٹکڑا اس کے
سلسلے میں بھی نقل کیا جاسکتا ہے [2] سکندر ۱۸ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا تھا، داؤدی ص ۴۴

تمام مورخ اور تذکرہ نگار سلطان سکندر لودھی کی شاہانہ عظمت وشجاعت اور علمیت و قابلیت کے شاہد عادل ہیں، لودھی خاندان کی حکومت ۷۷ سال سے زیادہ نہیں رہی لیکن اسی قلیل مدت میں اس خاندان کے تین بادشاہوں نے تاریخ میں اپنا نام ہمیشہ کے لیے مرتسم کردیا، سلطان سکندر اس خاندان کا گل سرسبد تھا، اس کی ماں زیبا، ایک زرگر کی بیٹی تھی، بہلول کی وفات کے بعد غیور افغان سرداروں نے یہ گوارا نہ کیا کہ جو شخص زرگر کی بیٹی کے بطن سے ہو وہ ان کا فرمانروا بنے لیکن تاریخ مسکرائی تھی کہ وہ اسی کا نام زریں حروف سے لکھے گی، اس کے بھائی باربک شاہ نے موقع کو غنیمت جان کر اپنی نجابت کے غرے میں تخت سلطنت کا دعوی کردیا، متعدد پرانے پٹھان سردار جو باپ کے وقتوں سے جاں نثاری کا حق ادا کرتے آئے تھے، باربک شاہ کے ساتھ ہوگئے، کچھ سرداروں اور امیروں نے تخت نشینی کے لیے شہزادہ خواجہ بایزید کے بیٹے اعظم ہمایوں کی بھی طرف داری کی لیکن سلطان سکندر کی حمایت میں خان خاناں فرمولی جیسا پرانا اور تجربہ کار سردار تلوار ٹیک کر کھڑا ہوگیا، اور نظام خاں کو سکندر شاہ بناکر تخت پر بٹھادیا، خود سب سے پہلے بڑھ کر نذر پیش کی اور خلعت و جاگیر کا مستحق ہوا، اور اس نے سلطان سے جو امیدیں قائم کی تھیں اس کو اس نے پورا کیا۔

سلطان سکندر کا ۲۹ سالہ دور حکومت خانہ جنگیوں کو فرو کرنے، بغاوتوں کو کچلنے اور سلطنت کا رقبہ وسیع کرنے میں گزرا، جونپور میں باربک شاہ نے علم بغاوت بلند کردیا تھا، دوسری طرف سلطان حسین شرقی بہار میں سلطنت کے خواب دیکھ رہا تھا، گوالیار اور دھولپور کے راجپوتوں کے کھانڈے بھی بے نیام ہورہے تھے۔

اس لیے تخت پر بیٹھتے ہی سلطان نے باربک شاہ کی گوشمالی کا ارادہ کیا، اس کی ساری قوت وطاقت اس کے سپہ سالار میاں محمد خاں فرمولی کے بل پر تھی، جو اپنی شجاعت، جرأت

اور ثابت قدمی کی وجہ سے "کالا پہاڑ" کہلاتا تھا، سلطان نے پہلے ہی ہاتھ میں اسے گرفتار کر لیا، جب وہ پا بجولاں سامنے لایا گیا تو سلطان اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آیا، اور اسکی تالیف قلب کی، اس کی شکرگزاری میں کالا پہاڑ نے سلطان کے سامنے اپنی خدمات پیش کیں، باربک شاہ کو یہ خبر ملی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، اور وہ بدایوں کی طرف بھاگا، لیکن سلطانی فوجوں نے اس کا پیچھا کیا اور وہ گرفتار کرکے پیش کیا گیا، سلطان نے اس کی خطا معاف کرکے اس کو جونپور کا حاکم مقرر کیا، اور خود کالپی کی طرف بڑھا، وہاں اس کا بھتیجا اعظم ہمایوں، جو خود کسی زمانے میں تخت کا دعویدار رہ چکا تھا، حاکم تھا، اسے معزول کیا اور گوالیار کے راجہ کو شکست دینے کے بعد بیانہ اور آگرہ فتح کرتا ہوا ۱۴۹۲ء میں دہلی واپس ہوا۔

دہلی آکر دم نہیں لیا تھا کہ جونپور کے جاگیرداروں نے پھر بغاوت کر دی، باربک شاہ اسے فرو کرنے میں ناکام ہوا اور بھاگ کر محمد خاں فرملی کالا پہاڑ کے پاس پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو گیا، سلطان باز کی طرح جھپٹا، جاگیرداروں کو شکست دے کر باربک شاہ کو واپس لا کر تخت پر بٹھایا، اور واپس دہلی آ گیا، اس کی واپسی کے بعد جاگیرداروں نے پھر بغاوت کر دی اور باربک شاہ بغاوت فرو کرنے میں پھر ناکام رہا، سلطان کو غصہ آ گیا، اسے گرفتار کرکے دہلی بلایا، اور خود جنار پہنچکر وہاں کے ہندو جاگیرداروں کو زیر کرنے کی کوشش کی لیکن ناکافی رسد اور راستوں کی خرابی کی وجہ سے شاہی لشکر کو سخت نقصان پہنچا، جونپور کے جاگیرداروں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور حسین شاہ شرقی کو پیام بھیجا کہ باپ دادا کا کھویا ہوا ملک پھر حاصل کرنے کا یہی وقت ہے، چنانچہ حسین ہندو سرداروں کو ساتھ لے کر بڑھا، بنارس کے قریب خانخاناں فرملی کا مقابلہ ہوا حسین شاہ کو شکست ہوئی اور وہ لکھنوتی بھاگ گیا، اور خانخاناں فرملی کی فوجوں نے آسانی سے بہار پر قبضہ کر لیا، سلطان نے خانخاناں کے اس کارنامہ پر اظہار خوشنودی کیا

۱۴۹۵ء میں یہ واقعہ پیش آیا حسین شرقی نے زندگی کے باقی دن لکھنوتی ہی میں گذارے اور پھر کبھی سر نہ اٹھایا، اس کے مرنے کے ساتھ ساتھ ملک الشرق خواجہ جہاں کا خاندان بھی ختم ہو گیا،

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت

رخت بربست و دیگرے پرداخت

۱۵۰۰ء میں سلطان سنبھل گیا، اس میں دو مصلحتیں تھیں، تبدیلیٔ آب و ہوا اور شمال کے افغان سرداروں کی نقل و حرکت پر نگرانی، سنبھل میں چار سال قیام رہا، اس دوران میں اسکے دہلی کے نائب اصغر نے بغاوت کردی لیکن سلطان کے ایک عامل خواص خاں نے اس کو فرو کردیا۔ گوالیار اور دھولپور کے راجوں نے بھی سر اٹھایا تھا لیکن ان کا بھی قلع قمع کر دیا گیا،

تجربے نے سلطان کو سکھا دیا تھا کہ فوجوں کا مرکز ایسی جگہ ہونا چاہیے، جہاں سے اٹاوہ، بیانہ، کول، گوالیار، اور دھولپور کے راجوں اور تعلقے داروں پر رعب بھی قائم رہے اور بروقت فوج کشی کرنے میں بھی دقت نہ ہو، اس نقطۂ نظر سے اس نے سنہ ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۴ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی جو اب آگرہ کہلاتا ہے،

سکندر کی باقی زندگی راجپوتوں اور خود اپنے سرداروں کی بغاوت فرو کرنے میں گزری، گوالیار اور دھولپور نے پھر سر اٹھایا، سلطان ان بغاوتوں کو فرو کرکے فارغ ہی ہوا تھا کہ ۱۵۰۶ء میں نروار (گوالیار) میں بغاوت ہوئی، یہ جنگ بڑی اہم اور فیصلہ کن تھی، نروار کی فوجوں نے پوری داد شجاعت دی لیکن سلطان کی بلند اقبالی کے سامنے ایک پیش نہ گئی، سلطان کو فتح حاصل ہوئی، نروار کی فتح نے سلطان کے لیے وسطی ہند کا دروازہ کھول دیا۔۔۔ اور چندیری کا قلعہ فتح ہوا۔۔۔ آخری معرکہ قلعہ رن تھنبور کی فتح کا تھا، یہ معرکہ سر کیا تھا جو زندگی کی آخری مہم ہو جانے کا پروانہ آگیا۔[۱]

[۱] سلطان کے معاربوں اور مجادلوں کی یہ مختصر تاریخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی کتاب ہسٹری آف میڈیول انڈیا (مطبوعہ ۱۹۲۸ء) کے صفحات ۵۰۸ تا ۵۱۹ کا خلاصہ ہے)۔

اس کی طبیعت مدت سے خراب چلی آتی تھی لیکن مسلسل محاربوں اور پیہم لڑائیوں کی وجہ سے وہ اس طرف توجہ نہیں دیتا تھا، ضابطہ اس درجہ کا تھا کہ کسی سے اپنے مرض کا تذکرہ بھی نہیں کیا، اور اسی شان اور حوصلے سے دربار کرتا رہا[۱]، آخر میں یہ حال ہوگیا تھا کہ اناج کا ایک دانہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی حلق سے نہیں اترتا تھا[۲]، جان برگس نے فرشتہ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ سلطان کو ورم لوزتین کا عارضہ تھا، لیکن یہ بات متن میں درج نہیں ہے۔

آخر ۷ ذی قعدہ ۹۲۳ھ مطابق یکم دسمبر ۱۵۱۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

سکندر، شہ ہفت کشور نماند   نماند کسے چوں سکندر نماند

انتقال کے وقت اس کی سلطنت کی حدود جنوب و مشرق میں بنگال تک، جنوب میں آگرہ، دھول پور، چندیری اور بیانہ تک، شمال میں پنجاب تک اور وسط ہند میں بندیل کھنڈ تک پہنچ چکی تھیں۔

ان مسلسل لڑائیوں اور مصروفیتوں کے باوجود جب بھی سلطان کو فرصت ملتی وہ علم و حکمت کی محفل سجاتا، وہ بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھا ـــــ اہل اللہ سے اس کی عقیدت اس روایت سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت شیخ سماء الدین[۳] اپنے وقت کے مشائخ عظام میں سے تھے، سلطان نے

---

[۱] و [۲] خانِ جہانی ج ۱ ص ۱۱-۲۱۰ [۳] شیخ کبیر نبیرۂ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری کے مرید تھے، سید شریف جرجانی کے شاگرد مولانا اسناء الدین سے علوم ظاہری حاصل کیے، ملتان میں ایک مدت تک رہنے اور رنتھنبور اور بیانہ میں قیام کرنے کے بعد دہلی آئے، اور اسکو اپنا وطن ثانی بنالیا، علوم ظاہری و باطنی اور ورع و تقویٰ میں کامل تھے، عراقی کی "لمعات" پر حاشیہ لکھا کہ بقول حضرت محدث دہلوی "بحل معانی آں کافی و وافی است"۔ آپ کی تصانیف میں رسالہ "مفتاح الاسرار" کا بھی ذکر ملتا ہے، آخر عمر میں آپ کی بصارت زائل ہوگئی تھی لیکن بغیر کسی علاج اور دوا کے خدا نے دوبارہ روشنی بخشی۔ ۹۰۱ھ میں دہلی میں انتقال کیا، شیخ کے ایک بیٹے شیخ عبد اللہ بیانی تھے، یہ بھی اپنے وقت کے نامور شیوخ میں تھے، آپ پر تجرید غالب تھی، (اخبار الاخیار، و تذکرۂ علمائے ہند)

باربک شاہ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے کوچ کرنے سے پہلے ان کی خدمت میں حاضری دی۔ کتاب میزان الصرف اس کے ہاتھ میں تھی، پہنچتے ہی عرض کی کہ حضرت "اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین" کے معنی بیان فرما دیجئے، فرمایا "خدا تعالیٰ تجھے نیک بخت کرے۔" جب عرض کی حضرت اس جملے کو تین بار دہرا دیجئے، شیخ نے دوہرا دیا، سلطان نے عرض کی کہ بس میں نے اپنا مدعا پا لیا۔[۱]

سلطان کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی، خود بھی شعر کہتا تھا اور "گلرخی" اور "گلرخ" تخلص کرتا تھا، بدایونی نے لکھا ہے :-

"صاحب طبع بود و گاہ گاہ نظمی بہ تخلص گل رخ بان روش قدیم ہند وستانیاں می گفت"[۲]

اس کی ایک مثنوی اکثر مورخین نے نقل کی ہے، یہ مثنوی مولانا جمالی[۳] کو مخاطب کرکے لکھی گئی ہے۔ اشعار یہ ہیں :

---

[۱] منتخب ج ۱ ص ۳۲۶، داؤدی (ایلیٹ اینڈ ڈوسن ج ۴) ص ۴۴۴، خان جہانی ص ۲۱۸

[۲] منتخب ج ۱ ص ۳۲۶، نیز خان جہانی ص ۲۲۴ "سلطان در شعر فارسی سلیقۂ تمام داشت و شعر خوب می گفت"۔

[۳] آپ کی تاریخ پیدائش کی طرح آپ کا اصلی نام بھی پردۂ خفا میں ہے، والد کا نام فضل اللہ تھا، علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ مند اور سیاح جہاں گرد تھے، عالم اسلام کی خوب سیر کی تھی، اپنے وقت کے بے بدل شاعر تھے، ایک دیوان قصائد و رباعیات آپ کی یادگار ہے، دو مثنویاں، مثنوی مہر و ماہ اور مثنوی مرآۃ المعانی بھی آپ کی تصنیفات میں ہیں، اولیاء اللہ کا ایک تذکرہ "سیر العارفین" بھی آپ ہی کی تالیف ہے، سکندر لودھی، بابر اور ہمایوں نے آپ کی بڑی قدر کی، ہمایوں کی مہم چمپانیر گجرات میں آپ بھی ہم رکاب تھے، وہیں ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء میں وفات پائی، "خسرو ہند بودہ" تاریخ ہوئی ۔۔۔ آپ کی حیات و شاعری پر راقم الحروف کا تفصیلی مقالہ زیر تکمیل ہے۔

اے مغز گنج لایزالی — اے سالک راہ دین جامی
در گرد جہاں بسے زدی سیر — در منزل خود رسیدی بالخیر
بودی تو مسافر زمانہ — الحمد کہ آمدی بخانہ
در مکہ و در مدینہ گشتی — گوہر بودی خزینہ گشتی
در شیخ رد و ستاں شود سیر — تشریف نمود نش کند دیر
باید کہ کتاب مہر و ماہم[1] — ارسال دہد چناں کہ خواہم
اے شیخ ، ما برس بزودی — بسیار مسافرت نمودی
بکشای بسوے در گہم گام — تا در یابی ز کار خود کام
جانم بہ جمال تو طپان است — دل مرغ مثال در فغان است
من اسکندر و تو خضر مائی — آں بہ کہ بسوئے ما بیائی
از مہر کشد دو دیدہ را نور — آہ مہ نشود ز دیدہ ام دور[2]

موسیقی سے بھی خاص شغف تھا، شہنا بہت شوق سے سنتا تھا جس کو ولس تنکا بجاتے تھے، ان موسیقاروں کو "شہنائی" کہتے تھے، سلطان صرف چار راگ سنتا تھا: (۱) مالکور (ممکن ہے یہ مالکوس ہو) (۲) کلیان (۳) کانہرا (۴) حسینی[3]

سلطان کا موسیقی سے یہ شغف دیکھ کر حماد نے موسیقی پر ایک کتاب "لہجات سکندری" لکھی

---

[1] مثنوی "مہر و ماہ" تصنیف مولانا جامی کی طرف اشارہ ہے، یہ مثنوی مولانا جامی نے اہل تبریز کی فرمائش پر نظم کی تھی شہزادہ بدخشاں مہر اور شہزادی ملک مینا ماہ کے عشق کی داستان ہے، اسی داستان سے متصوفانہ مضامین اخذ کیے ہیں ۹۰۹ھ کی تصنیف ہے [2] خان جہاں لودی ج ۱ ص ۲۰۲، صاحب خاں جہانی نے لکھا ہے کہ یہ منظوم فرمان مولانا جامی کی اولاد کے پاس محفوظ تھا [3] داؤدی ص ۱۶ - ۱۷

جو ہندوستانی کلاسکی موسیقی پر لکھی جانے والی اولین کتابوں میں سے ہے، مصنف نے سوال وجواب کی صورت میں یہ کتاب لکھی ہے، اور نقشے اور خاکے بنا کر نکات کی توضیح و تشریح کی ہے[۱]۔

سلطان کو تعلیم کی اشاعت کا خاص خیال تھا، ۱۵۰۴ء میں جب آگرہ کی بنیاد رکھی تو ایک بڑا مدرسہ بھی قائم کیا، شیخ عبد الحق محدث لکھتے ہیں کہ سکندر کی پوری سلطنت میں جا بجا مدرسے قائم تھے[۲]، داؤدی لکھتا ہے کہ علما و صلحا کو وسیع جاگیریں اور بیش قیمت وظائف دیا کرتا تھا[۳]، سلطان سے پہلے اس سلسلے میں اتنی داد و دہش کی مثال نہیں ملتی، سلطان کی قدردانی کی داستانیں دور دور تک پھیل گئی تھیں، عرب، ایران، بخارا سے علما و شیوخ کھنچ کھنچ کر ہندوستان آنے اور یہاں اقامت اختیار کرنے لگے، آگرے کے مدرسے کے علاوہ متھرا، نرور اور سنبھل کے مدرسے بھی اپنی چند در چند خصوصیت کی وجہ سے مشہور تھے، سلطان نے ملتان سے شیخ عبداللہ[۴] تلمبنی اور شیخ عزیز اللہ[۵] تلمبنی کو بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ بلا کر اول الذکر کو آگرے کے مدرسہ کا اور موخر الذکر کو سنبھل کے مدرسہ کا ناظم مقرر کیا، سلطان خود بھی شیخ عبداللہ تلمبنی کے درس میں حاضر ہوتا تھا[۶]،

---

[۱] ۹۶ ... نیز مشاورتی ص ۱۸۶ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک نایاب نادر نسخہ خلی لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے [۲] اخبار الاخیار [۳] داؤدی ص ۵۰ [۴] شیخ عبداللہ تلمبنی ابن شیخ الہ داد عثمانی وفات ۹۲۲ھ علوم معقول و منقول میں یکتائے دہر تھے، ایک مدت تک اپنے وطن تلمبنہ میں کہ مضافات ملتان میں سے تھا، درس دیتے رہے، سکندر لودھی کے عہد میں دہلی تشریف لائے اور اس دیار میں علوم معقول کی تدریس کی ابتدا کی، کہتے ہیں کہ آپکے چالیس سے زیادہ عالم و فاضل شاگرد ہوئے، ان میں سے میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ بودہ، میران سید جلال الدین بدایونی زیادہ مشہور ہوئے، سکندر آپکے درس میں نہایت ادب و انکسار سے شریک ہوتا تھا، بدیع المیزان شرح میزان منطق آپ کی تصانیف میں سے ہے (تذکرہ علمائے ہند و نزہتہ الخواطر)، [۵] شیخ عزیز اللہ تلمبنی عالم متبحر اور صاحب ارشاد و ہدایت تھے، عہد سکندری میں ملتان سے سنبھل آئے، علوم مختلفہ میں عجیب استحضار تھا، بغیر کتاب دیکھے منتہیان علوم کے سوالوں کے جواب دیتے تھے، آپ کی تصانیف میں رسالہ عینیہ مشہور ہوا، ۹۳۲ھ میں انتقال کیا، میاں حاتم سنبھلی آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند و نزہتہ الخواطر)

[۶] نزہتہ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، ج ۴ ص ۵ - ۲۰۴، عبد الحیٔ فخر الدین الحسینی، حیدرآباد ۱۹۵۴ء

یہ مدارس ہر خاص و عام کے لیے کھلے ہوئے تھے، سلطان کی علم و فن کی یہ قدر دانی دیکھکر بڑے بڑے سرداروں سے لیکر چھوٹے چھوٹے سپاہیوں تک میں تحصیل علم کا شوق پیدا ہوگیا تھا، خواجہ نعمت اللہ ہروی لکھتے ہیں:

"در زمان او علم را رواج تمام پیداشد و امرازادہا و سپاہیان بکسب فضائل مشغول شدند"[1]

سلطان ہی کے عہد حکومت میں سب سے پہلی بار ہندوؤں خصوصاً کایستھوں نے فارسی زبان سیکھنی شروع کی، چنانچہ نظام الدین لکھتے ہیں:

"کافراں بخواندن و نوشتن خط فارسی کہ تاآں زماں درمیان ایشان معمول نبود، پیدا ختند"[2]

چند دہائیوں تک تحصیل زبانِ فارسی کے بعد ہندو اس قابل ہوگئے تھے کہ مسلمانوں کی طرح انھیں اعلیٰ سرکاری عہدے ملنے لگے"[3]

سلطان جانتا تھا کہ ہندوستان علم و دانش کا خزانہ ہے، چنانچہ اس نے اپنے لائق و فاضل وزیر میاں بھوہ کو "ارگر مہابیدک"[4] کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، یہ کتاب بیماریوں کی تشخیص اور ان کے علاج میں تھی، اس کے تین حصے تھے: (۱) سوتر استھان (۲) شاریرک استھان اور (۳) ندیا چکتسا[5]، یہ کتاب ہندی طبیبوں کے لیے اس فن کی امہات کتب میں تھی، اور انکے پستوں ہی کی حد تک رہتی تھی، میاں بھوہ نے بڑی تلاش اور محنت سے اس کتاب کے بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کیا اور ان کا ترجمہ کرکے سلطان کی نذر کیا، اس کتاب نے فارسی میں "طب سکندری"

---

[1] خان جہانی ج ۱ ص ۲۱۸ [2] طبقات ص ۱۷۱ [3] Sreeram Sharma p. 96 ....

[4] ایلیٹ ڈوسن نے واقعات کے ترجمے کے حاشیہ پاورقی میں اس کتاب کا نام "ارگرم بناد ک" لکھا ہے (ص ۱۸) ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے میں یہ نام ایورویدک کسی کتاب کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے (ہسٹری ص ۵۰۸) [5] Sreeram Sharma p. 67 ....

نام پایا اور ہر شخص کے لیے عام ہو گئی، اس کتاب کے بارے میں رزق اللہ مشتاقی لکھتے ہیں کہ "ہندوستان میں اس سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کوئی کتاب نہیں ہے"[1]۔

فرشتہ نے "فرہنگ سکندری" نامی کتاب کی بھی اطلاع دی ہے[2]۔

عہد سکندری اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں بڑے بڑے زبردست سماجی اور ثقافتی انقلاب رونما ہوئے، ہندوستان کی بظاہر مذہبی پرسکون سطح کے نیچے ایک مذہبی لاوا ابل رہا تھا، مختلف نسلوں کے اختلاط اور ہندوستان میں اشاعت اسلام کی وجہ سے ایک روحانی انقلاب صورت پذیر ہو رہا تھا، اور اسلام کی تعلیمات چودھویں اور پندرھویں صدی کے موحد مصنفوں شاعروں اور صوفیوں کے لیے ذہنی غذا فراہم کر رہی تھیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عہد تغلق کے مشہور سنت سوامی رامانند نے روایتی ہندو مذہب سے اپنی برأت کا اعلان کرکے بھگتی تحریک کی بنیاد ڈالی، سوامی رامانند کے بارہ مشہور چیلے ہوئے ان میں سب سے زیادہ مشہور کبیر تھے، جن کا زمانہ ۱۴۴۰ء سے ۱۵۱۸ء تک ہے، کبیر کا مذہب توحید تھا، ان کے مذہب میں اسلام کے متعدد اصول بھی شامل تھے، ذات احد پر ان کا ایمان تھا، شمالی ہند کے مختلف مذہبوں، مسلکوں اور فرقوں میں اتحاد کے لیے ایک مشترک عقیدے کی تلاش کبیر کا مقصد تھا۔

کبیر ہی کے ہم عصر سکھ مذہب کے بانی گرونانک ہوئے جو بھگتی تحریک اور کبیر کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے، کبیر کی تعلیمات کا اثر سکھ مذہب میں جس حد تک ہو گیا تھا، اس کا اندازہ گرو گوبند سنگھ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ: "کبیر پنتھ اب بھیو خالصہ"۔ گرونانک کی صحبت مسلمان صوفیوں سے بہت رہتی تھی، انھوں نے ان صحبتوں کا تذکرہ اپنی کتاب "جنم ساکھی" میں کیا ہے،

---

[1] واقعات مشتاقی بحوالہ داؤدی ص ۱۹ [2] فرشتہ ج ۱ ص ۳۴۴

نم ساکھی"، "آدی گرنتھ" کا ایک حصہ ہے، موخر الذکر کتاب سکھوں کی مقدس مذہبی کتاب
گرو نانک خدائے واحد کو قادر مطلق مانتے تھے،

ایک طرف سوامی رامانند، کبیر اور گرو نانک ہندوستانی سماج پر اثر انداز ہو رہے تھے،
سری طرف مسلمان صوفی صوفیانہ مشرب کی تبلیغ و ترویج میں منہمک تھے، یہ حضرات زندگی
، حقائق پر زیادہ زور دیتے تھے، ان کے نزدیک انسان اور انسانیت سے محبت معرفت الٰہی
ذریعہ تھی، ابن عربی (۱۱۶۵ء سے ۱۲۴۰ء) کا فلسفہ وحدت الوجود تھا کہ اس تمام کثرت
، وحدت الٰہی کار فرما ہے، اور ان تمام مظاہر کائنات کی اصل وہی ذات واحد ہے، مولانا روم،
افظ اور جامی کی شاعری نے ابن عربی کے اس فلسفے کو عوام تک پہنچایا، اور وہ اس عقیدے
تیزی سے قبول کرنے لگے، اس سے صوفیا، کا اثر عوام پر اتنا بڑھ گیا کہ سلاطین تک ان کی قوت
ننے پر مجبور ہو گئے، چنانچہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی سکندر جیسے مطلق العنان بادشاہ کو
اکثر مواقع پر لوگوں کے سامنے ڈانٹ دیتے تھے، اور سکندر ہر بات پر آمنا وصدقنا کہتا تھا،

سکندر خود تصوف کی طرف میلان اور صوفیا سے عقیدت رکھتا تھا، چنانچہ لڑائیوں
میں جانے سے پہلے اولیا راللہ کے مزارات پر حاضری دینا فرض سمجھتا تھا، تاریخ داؤدی میں لکھا ہے
کہ ملک بہار کی فتح کے بعد سلطان نے منیر کے مقام پر حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے
روضے پر حاضری دی تھی،

سکندر کی تخت نشینی سے تقریباً نوے سال قبل تیمور نے دہلی اور اس کی تہذیب کو نیست
و نابود کر دیا تھا، اس تہذیب کا احیا سکندر کے عہد میں ہوا، عمرانی اور ثقافتی تحریکوں کے
جسد مردہ میں نئی جان پڑی، ادب کے قالب پژمردہ میں بھی تازگی آئی، سلطان کے میلان طبع
کا اثر اس کے عہد کی تصانیف و تالیفات میں بھی ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ اس عہد کی بیشتر تصانیف میں

صوفیانہ اور مذہبی ذوق کی ہیں، تاریخ داؤدی بتاتی ہے کہ

"در عہد سلطان سکندر جزصرف ونحو شیوع نیافتہ لیکن وصف صلاح و دیانت غالب بود۔"

عہد سکندری کی فارسی زبان میں وہ تصنع، جمود اور روایتی انداز نہیں پایا جاتا جو بعد میں عہد مغلیہ کی زبان میں نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عہد کے تقریباً تمام شاعر اور مصنف طبقۂ عوام سے تھے، صوفی اور بھگت شاعر اور مصنف جو عام لوگوں میں سے تھے، مقامی زبانیں جانتے تھے، ان کا مقصد عوام میں تبلیغ کرنا تھا، اس لیے وہ وہی زبان استعمال کرتے جو عوام کی سمجھ میں آسانی سے آجاتی ـــــ اس سے ایک طرف اگرچہ فائدہ ہوا کہ عوام تک ترسیل وابلاغ آسان ہوگیا، تو دوسری طرف یہ نقصان ہوا کہ اس عہد کی زبان پھیکی، بے مزا، اور بے جان ہوگئی، عہد مغلیہ میں جب نظیری، عرفی، طالب آملی اور صائب وغیرہ نے اس ہندی زدہ فارسی کو نئی چاشنی دی تو لودھیوں کے زمانے کے ادیبوں کی زبان پایۂ اعتبار سے ساقط ہوگئی۔

اس عہد کے شعراء و مصنفین میں مندرجۂ ذیل حضرات کے نام ملتے ہیں :۔

۱۔ مولانا شیخ سماء الدین: (أ) حاشیہ بر لمعاتِ عراقی (ب) مفتاح الاسرار،

۲۔ مولانا جمالی: ۔ (أ) سیر العارفین (ب) دیوان نظم فارسی (ج) مثنوی مرآۃ المعانی (د) مثنوی مہر وماہ

۳۔ شیخ عبد اللہ تلبنی (أ) بدیع المیزان

۴۔ شیخ عزیز اللہ تلبنی: (أ) رسالۂ عینیہ

۵۔ شاہ جلال شیرازی (أ) شرح گلشن راز

۶۔ سید محمد ہمدانی: (أ) شرح شمسیہ

۷۔ شیخ رزق اللہ مشتاقی: (أ) تاریخ مشتاقی۔ ہندی میں راجن تخلص کرتے تھے،

۸۔ میاں بھوہ: (أ) طب سکندری۔

کتابیات

۱۔ داؤدی: The His of India as Told by its own Historians: H.M. El J Dowson. Vol IV London 1872

۲۔ خان جہانی: تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی از خواجہ نعمت اللہ ہروی، تصحیح و تحشیہ سید محمد امام الدین ڈھاکہ ۱۹۶۰ء

۳۔ منتخب: منتخب التواریخ از ملا عبد القادر بدایونی بہ تصحیح مولوی احمد علی، کلکتہ ۱۸۶۸ء

۴۔ Glimpses: Glimpses of Medieval India Culture: by Yusuf Husain Khan, 2nd Edition. 1959

۵۔ اخبار الاخیار: شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔

۶۔ طبقات اکبری از نظام الدین

۷۔ فرشتہ: تاریخ فرشتہ از ابو القاسم فرشتہ جلد اول، نولکشور اڈیشن۔

۸۔ تذکرۂ مصنفین دہلی: شیخ عبد الحق محدث دہلوی بہ تصحیح حکیم شمس الدین قادری، حیدرآباد، ۱۹۳۰ء۔

۹۔ تذکرۂ علمائے ہند: مولوی رحمان علی، نولکشور لکھنؤ اڈیشن۔

۱۰۔ سیر الاولیاء: سید محمد مبارک، قیصر ہند پریس، دہلی ۱۳۰۲ھ

۱۱۔ اورنٹیل کالج میگزین، لاہور، بابتہ مئی ۱۹۳۳ء، نومبر ۱۹۳۳ء، اگست و نومبر ۱۹۳۴ء برائے مضامین یسین خاں نیازی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی و مولانا امتیاز علی عرشی،

۱۲۔ اردو ادب: جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴ء: ڈاکٹر نذیر احمد (مقالہ)

۱۳۔ نذر عرشی: مرتبہ مالک رام و مختار الدین آرزو، ۱۹۶۵ء، مقالہ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی،

۱۴۔ نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، عبد الحی بن فخر الدین الحسینی، حیدرآباد ۱۹۵۴ء

تلخیص تبصرہ

سوویٹ یونین کے مسلمان

مترجمہ وارث رشید قدوائی

مضمون نگار جیوفرے وھیلر ادارہ تحقیق برائے وسط ایشیا (لندن) کے ڈائرکٹر اور "سنٹرل ریویو" نامی رسالے کے بانی اور مدیر بھی ہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۹ء میں "سوویت مسلم ایشیا کے نسلی مسائل" پر ایک کتاب لکھی تھی، اس کے علاوہ "سوویت وسط ایشیا کی تاریخ جدید" (۱۹۶۴ء) اور "سوویت وسط ایشیا کے عوام" (۱۹۶۶ء) کے مصنف بھی ہیں۔

سوویت وسط ایشیا کے مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اسلام اور سوویٹ حکومت کے درمیان کشمکش کے بارے میں مختلف اور متضاد روایتیں ہیں، کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمان اپنے ذاتی معاملات میں بالکل خودمختار ہیں، اور ان کی معاشی وسماجی زندگی قابل رشک حد تک خوشگوار اور ترقی پذیر ہے، تو اسی کے ساتھ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ وہ نوآبادیاتی استبداد اور نسلی تفریق کا شکار ہیں! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مذہبی آزادی کو برقرار اور اپنی تہذیبی اقدار قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہیں، اس کے متضاد یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سوویٹ حکومت نے اسلامی معاشرہ کو تباہ کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے اور اسلامی ثقافت کو اس درجہ مسخ کیا جا چکا ہے کہ اس کے خدوخال نہیں پہچانے جا سکتے، اور اس کے جو آثار باقی ہیں وہ بڑی تیزی سے مٹتے جاتے ہیں اور شاید مستقبل

قریب ہیں اسلامی تہذیب کے نقوش ماضی کے اندھیروں میں بالکل ہی گم ہوجائیں، ان متضاد روایتوں میں جھوٹ اور سچ کی جستجو کرنا خاصا دشوار کام ہے، موجودہ مضمون میں یہ کوشش کیگئی ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی، مادی، ثقافتی اور مذہبی صورت حال کا غیرجانبدارانہ تجزیہ کیا جائے جس کا انحصار معلوم و ثابت حقائق پر ہو،

سویت یونین میں رہنے والے دو کروڑ پچاس لاکھ مسلمانوں میں سے تقریباً ایک کروڑ پچاس لاکھ وسط ایشیا میں بستے ہیں، ان مسلم علاقوں پر روسی شہنشاہیت کی دست درازی کی داستان کا آغاز ۱۷۱۶ء سے ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ انیسویں صدی کے اواخر تک وہ پورا علاقہ جو اب سویت وسط ایشیا اور قزاقستان کی جمہوریتوں پر مشتمل ہے، مکمل طور پر روسی شہنشاہیت کے زیر تحت آچکا تھا، صرف بخارا اور خیوا کی سخت جان حکومتوں کی نیم خودمختار حیثیت باقی رہ گئی تھی جو انقلاب روس کی بھینٹ چڑھ گئی، اور ان پر بھی مرکزی سویت حکومت کا براہ راست تسلط قائم ہوگیا، اشتراکی انقلاب کے بعد اس پورے علاقہ کو پانچ سویت سوشلسٹ جمہوریتوں میں تقسیم کر دیا گیا، جن کے نام ان میں آباد اقوام کی نسبت سے قزاقستان، ازبکستان، ترکستان، کرگزستان اور تاجکستان ہیں، نئی انقلابی حکومت کو اس علاقہ پر مکمل تسلط قائم کرنے اور مقامی مدافعت پر قابو پانے کے لیے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء تک سخت خوں ریز اقدامات کرنا پڑے، اور گیارہ سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد ۱۹۳۰ء میں مخالف عناصر پر پورا قابو پایا جاسکا،

روز اول ہی سے سویت حکومت نے مذہب اسلام و اسلامی طرز حیات کے خلاف اپنے معاندانہ جذبات پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی، اس کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام سوشلزم کی راہ میں ایک بڑا روڑا ہے اور اسلامی طرز حیات کی پیروی دور جدید کی اقتصادی دوڑ میں

ایک بوجھ بنی ہوئی ہے، اس کی نگاہ میں اسلام ایک فوق البشر روحانی طاقت ہونے کی بناء پر سویت مسلمانوں کی زندگی پر انتشار خیز اثرات مرتب کرتا ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ سویت کمیونزم کی یہ نگاہ کرم اسلام ہی کے ساتھ مخصوص ہے، قدیم نصرانی کلیسا کو روسی معاشرہ کے جزو کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں تو اس کو کوئی تامل نہیں ہے، مگر اسلامی تمدن کو روسی ثقافت سے نہ صرف متضاد بلکہ منافی تصور کیا جاتا ہے۔

انقلاب کے بعد نو تشکیل مسلم جمہوریتوں کا انتظامی اور سیاسی ڈھانچہ مکمل تبدیل کرکے دوسری روسی جمہوریتوں کے مماثل کردیا گیا، گو یہ مسلم ریاستیں "مکمل طور پر خود مختار" کہی جاتی ہیں، مگر عملاً داخلی تحفظ، خارجی امور، قومی دفاع، رسل و رسائل اور مرکزی حکومت سے متعلق دوسرے امور میں وہ تمام تر مرکزی حکومت کی دست نگر ہیں، ان کا کوئی سفارتی، تجارتی یا ثقافتی تعلق اپنے پڑوسی ملکوں چین یا افغانستان یا ایران سے آزادانہ طور پر نہیں ہے، ہر ایک جمہوریہ کی اپنی الگ ریاستی کمیونسٹ پارٹی ہے، جو مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے ماتحت ہے، ان ریاستوں کا ہر باشندہ سویت یونین کا شہری سمجھا جاتا ہے، اور اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس کے جذبۂ حب الوطنی کی منزل و منتہیٰ اس کی اپنی جمہوریہ نہیں بلکہ سویت یونین ہوگی۔

جہانتک ان ریاستوں کی مادی ترقی کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ گذشتہ چالیس سال میں صحت عامہ، صنعت اور کپاس کی پیداوار، رسل و رسائل، اور عوام کے معیار زندگی میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، ان تمام شعبوں میں ان علاقوں کی ترقی کا معیار دنیا کے تمام اسلامی ممالک بلکہ اسرائیل اور جاپان کے علاوہ تمام ایشیائی ملکوں سے بلند ہے، اور اس ترقی کا سہرا تمام اور تنہا مرکزی سویت حکومت ہی کے سر ہے

بلکہ اس میں خود مسلمانوں کی ذاتی محنت اور جدید علوم و فنون میں تیز رفتاری سے مہارت حاصل کرنے کی صلاحیت کو بھی بڑا دخل ہے، ہر چند مسلمانوں کو اپنے اقتصادی اور مالی معاملات میں مکمل آزادی حاصل نہیں ہے، پھر بھی جس سرعت سے وہ ان امور میں تجربہ حاصل کرکے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کر رہے ہیں، اس نے ان میں دوسرے روسیوں کے ساتھ مساوات کا جذبہ پیدا کر دیا ہے، نسلی امتیاز کی لعنت سے اگرچہ سویت یونین بھی پاک نہیں ہے، لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ دنیا کے دوسرے نوآبادیاتی علاقہ جات کے مقابلہ میں یہاں بہت زیادہ مساوات ہے، اور ان اقلیتوں کو زیادہ ترقی کے مواقع حاصل ہیں،

یہاں کے مسلمانوں کو اپنی موجودہ حالت پر مطمئن اور قانع رہنے کے بہت سے اسباب ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم عوام نے موجودہ طرز حیات سے جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، سمجھوتہ کر لیا ہے، البتہ مسلم دانشوروں میں موجودہ سیاسی نظام سے بے اطمینانی کی جھلک پائی جاتی ہے، مگر یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سویت حکومت نے مادی ترقی کے شعبوں میں جس میں زرعی و صنعتی ترقی، نظام آبپاشی، اور ٹکنیکل اور تعلیم عامہ سب شامل ہیں، اپنے عوام کی ترقی و خوشحالی کے لیے اتنا کچھ کر دیا ہے جس کا دوسرے نوآبادیاتی ممالک میں عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا ہے، لیکن ثقافتی اور روحانی امور میں جو تغیر سویت حکومت کے ہاتھوں آیا ہے، اس پر بہرحال اعتراض کی گنجائش نکل سکتی ہے تعلیم کو سیکولر بنانے، عبادت گاہوں کی قفل بندی، مذہبی پیشواؤں کی تعداد اور ان کے حلقۂ کارکردگی پر پابندی عائد کرنے، لادینیت کے پروپیگنڈے اور انقلاب کے پہلے دور میں مذہب کے خلاف نفرت کی مہم چلانے میں سویت حکومت کا رویہ تمام مذاہب کے ساتھ

یکساں رہا، مگر اس کی زد سب سے زیادہ اسلامی بنیادوں پر پڑی، کیونکہ مسلمانوں میں ابتدائی اور اعلیٰ پوری تعلیم مذہب کے زیر اثر ہوتی تھی، مسلمانوں کی عبادت گاہیں اور مذہبی پیشواؤں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے عیسائیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔

مسلمانوں کے لیے لادینیت اور خدا بیزاری بالکل ہی ناقابل فہم تھی، انقلاب سے پہلے ان میں قانون شریعت اور قانون رواج نافذ تھا، ان کی طرز زندگی کا دارومدار تمامتر اسلامی قوانین اور اسلامی فقہ پر تھا، خصوصاً معاشرہ میں عورتوں کی حیثیت، آرٹ، زبان اور ادب مکمل طور پر مذہب سے وابستہ تھے۔

سویت حکومت نے روز اول ہی سے اسلامی ثقافت کے تمام نقوش خواہ وہ روحانی ہوں یا مادی، مٹاکر ایک جدید قسم کا یکساں سویت کلچر" جس کے خدوخال قومی اور مزاج اشتراکی" ہے، رائج کرنے کی پوری کوشش کی، ان مقاصد کے حصول کے لئے جو قدم اٹھائے گئے ان کے اثرات گو خاصے گہرے پڑے ہیں، مگر پھر بھی حکومت کی توقع اور خواہش کے مطابق اس کے نتائج نہ نکل سکے، ان اقدامات کی تفصیل یہ ہے:

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اوائل ہی میں تمام اسلامی مکاتب اور مدارس بند کردیے گئے، ۱۹۱۷ء میں اس علاقہ میں تقریباً بیس ہزار مساجد موجود اور آباد تھیں، اب ان میں سے صرف دو یا تین سو مساجد کا داگزار ہونا معلوم ہے، اسی تناسب سے ملاؤں اور دوسرے مذہبی پیشواؤں کی تعداد میں کمی کی جا چکی ہے، اسلامی فقہ اور شرعی احکامات کی پابندی ممنوع ہے، حج بیت اللہ اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے صرف مخصوص اور منتخب لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے، اسلامی طرز زندگی کے ذیلی معاملات پر بھی کاری ضرب لگی ہے، مثلاً پردہ کا خاتمہ، مقامات مقدسہ کی زیارت،

اور مذہبی تہواروں پر کام کے حرج کے بہانے سے پابندی، ختنہ کی رسم کو مٹانے کی کوشش، اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے خلاف نفرت کی مہم اور الحاد کا پروپیگنڈا بڑی شد و مد سے جاری ہے، بعض اوقات وقتی مصالح کی وجہ سے اس پروپیگنڈے میں کمی بھی ہو جاتی ہے، مثلاً ۱۹۴۱ء میں روس پر جرمن کے حملہ کے وقت اسلام اور دوسرے مذاہب کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کی کوشش مشہور واقعہ ہے۔

روسی حکومت نے نئے سوشلسٹ سماج اور جدید نا مذہبی ثقافت کی تشکیل اور ترویج کے لیے نہ صرف مندرجۂ بالا منفی اقدامات کیے ہیں بلکہ بہت سے مثبت طریقے بھی اختیار کیے ہیں، جن سے اسلامی طرز زندگی پر کاری ضرب لگی ہے، ان میں سب سے اہم نا مذہبی تعلیم کا فروغ ہے، ۱۹۱۷ء میں وسط ایشیا کے مسلمانوں میں خواندگی صرف تین فی صد تھی، اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا سرے سے فقدان ہی تھا، مگر اب ناخواندگی کا نشان بھی نہیں ملتا، چھ یونیورسٹیاں قائم ہیں، اور اعلیٰ ٹکنیکل اور تربیتی اداروں کی معتدبہ تعداد موجود ہے، حکومت کی تعلیمی پالیسی سے منسلک لسانی پالیسی بھی ہے، اس کے مطابق مقامی زبانوں کے عربی رسم الخط کو پہلے لاطینی رسم الخط میں، پھر ۱۹۴۰ء میں تاریلی حروف میں تبدیل کر دیا گیا، ان مقامی زبانوں کا کوئی مروجہ اور مخصوص ادبی طرز نہ تھا، حکومت نے کوشش کر کے ہر ایک زبان کے لیے ایک طرز مروج کر دیا، عربی اور فارسی الفاظ کے اضافے کا دروازہ بند کر دیا گیا، بلکہ یہ سعی لاحاصل بھی کی گئی کہ عربی اور فارسی کے موجود اور رائج الفاظ کو بھی زبان سے نکال دیا جائے، ان لسانی اصلاحات کے نتیجہ میں اتنی کامیابی تو ضرور ہوئی ہے کہ ان زبانوں کے ادب سے اسلام کا نام مکمل طور پر خارج ہو چکا ہے، اب اگر کہیں اسلام کا ذکر ملتا ہے تو تضحیک کے طور پر

لسانی پالیسی میں یہ بھی شامل ہے کہ روسی زبان کو بتدریج فروغ دیا جائے، چنانچہ یہ حکومت کی اعلان شدہ پالیسی ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان روسی نہیں ہے، انکے لیے بھی روسی زبان سیکھنا ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب روسی زبان سیکھے بغیر کسی شخص کا ترقی کرنا تقریباً ناممکن ہے، حالانکہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ذریعۂ تعلیم اب بھی مقامی ہی زبانیں ہیں، لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف روسی زبان ہی واحد ذریعۂ تعلیم ہے۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ سویت وسط ایشیا میں اسلام کس حد تک کیونزم کے ساتھ بقائے باہم کی کشمکش میں کامیاب یا ناکام ہوا ہے، یہ ضروری ہے کہ ہم اس فرق کو جو دین اسلام اور اسلامی طرز حیات کی حیثیتوں میں ہے، نظر میں رکھیں، مسجدوں کی قفل بندی، مذہبی تعلیم پر پابندی، مذہبی تہواروں کی اجتماعی حیثیت کے خاتمہ نے بلاشبہہ عوام کے اسلامی طرز حیات کی عمارت کو متزلزل کر دیا ہے، اور اب اسلام عوامی زندگی پر اس طرح حاوی نہیں رہا، جس طرح پہلے تھا، مگر یہی بات غیر اشتراکی اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی عوامی زندگی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، جہاں مغربیت کے سیلاب کے سامنے اسلامی اقدار معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں، اور جہاں احیاے دین کی تحریکیں بھی محض سیاسی اغراض کے تحت چلائی جاتی ہیں، لیکن جہاں تک دین کی بنیادی قدروں کا تعلق ہے، چونکہ اسلام میں دوسرے مذاہب کی طرح دین کی بقا و تکمیل کے لیے کلیسائیت اور برہمنیت کا کوئی تصور نہیں ہے، اس لیے عبادات کی ظاہری رسوم کی عدم پابندی یا ملاؤں کے نہ ہونے سے اسلام کی بنیادی حقیقت اور اس کے روحانی اثرات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، اس لیے اسلام کے دینی

تصورات کے نقوش وسط ایشیائی مسلمانوں کے دلوں سے قطعی طور پر محو کرا دینے میں سویت حکومت کو کوئی قابل لحاظ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے، اور یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سویت مسلمانوں کا بھی دینی اعتبار سے کم وبیش وہی حال ہے جو دوسرے اسلامی ممالک جیسے ایران یا ترکی کے مسلمانوں کا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ الحاد اور بے دینی کا مسلسل پروپیگنڈا جس کا شروع شروع میں مسلمانوں پر شدید ردعمل ہوا تھا، اب محض ایک بے جان اور غیر موثر رسمی کارروائی بن کر رہ گیا ہو، جس کو مسلمان ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں،

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت روس میں اسلام کی حیثیت یقیناً اس معیار سے کہیں بلند ہے، جو اکتوبر ۱۹۱۷ء میں تھی، چنانچہ ۱۹۴۳ء میں تاشقند میں ایک "نظامت مذہبیات کا قیام عمل میں آیا تھا، اب اس قسم کے تین نیم سرکاری ادارے دوسری جمہوریتوں میں قائم ہو چکے ہیں، مگر ان کے اختیارات اور دائرۂ کارکردگی محدود ہیں، اور سرکاری طور پر اس پر گہری نگاہ رکھی جاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ سویت یونین میں ایسے مظاہر موجود ہیں جس سے یہ خیال تقویت پاتا ہے کہ یہاں اسلام کی کشتی اب بھی رواں دواں ہے،

سویت ارباب حکومت کم سنی کی شادی اور جہیز کی رسم وغیرہ کو مذہب کی باقیات کی حیثیت سے اکثر پیش کرتے ہیں، وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ بھی گویا مسلمانوں کے بنیادی عقائد کی شاخیں ہیں، حالانکہ مسلمان مصلحین انقلاب سے بہت پہلے ان رسوم کے خلاف آواز بلند کر چکے تھے، اب بھی کہیں کہیں یہ قدیم رسمیں باقی ہیں، مگر یہ عوام کی رسم پرستی کا نتیجہ ہیں، اس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

کمیونزم اور اسلام کے بقائے باہمی کے بارے میں بانیاں Bennigsen نے جو سویٹ یونین میں اسلام کے موضوع پر سند سمجھے جاتے ہیں، لکھا ہے کہ کوئی مختتم بات اسی وقت ممکن ہے جب دونوں نقطہ ہائے نظر کو برابر کے مواقع حاصل ہوں، مگر یہ صورت نہ تو سویٹ یونین میں ہے، جہاں کمیونزم کے مقابلے میں اسلام کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور نہ مشرق وسطیٰ میں ہے جہاں اب بھی اسلام کو تمام شعبہ ہائے حیات میں بالادستی حاصل ہے"، حقیقتاً یہ ہے کہ اصولی طور پر دونوں نظریات ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن وسط ایشیائی مسلمانوں میں البتہ دانشوروں کا ایک طبقہ شاید کیمونزم کے ساتھ مصالحت کرنا گوارا کرلے، بشرطیکہ کیمونزم کو بیرونی حکومت کی غلامی سے آزاد کرالیا جائے، انقلاب کے چند برسوں کے بعد ایک تاتاری کمیونسٹ رہنما سرسید سلطان علی اوغلو نے ایک بین الاقوامی مسلم وفاق قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس کا خاکہ یہ تھا کہ مارکسی کیمونزم کو جو صنعتی یورپ کے لیے مناسب اور موزوں ہے، ایشیا کے زرعی عوام کے مناسب بنایا جائے، لیکن اس تحریک کو سویٹ یونین نے سختی کے ساتھ کچل دیا، اور اسے انقلاب دشمن تحریک کا نام دیا، لیکن یہ ناممکن نہیں ہے کہ اس قسم کے جذبات اب بھی مسلمان دانشوروں کے دل ودماغ میں پرورش پارہے ہیں، اور بظاہر کمیونزم پر ایمان رکھنے والے اور مغربی افکار سے متاثر مسلمان اپنے دلوں میں اسلام کی شمع روشن رکھیں۔ (مسلم ورلڈ)

افکار عصریہ

سائنس نے پہلی جنگ عظیم کے جو ترقیاں کی ہیں، ان سب کا خلاصہ اس کتاب میں آگیا ہے

(جدید اڈیشن) "زیر طبع"

ادبیات

خسرو باغ الہ آباد

از جناب طالب جے پوری

آہ خسرو باغ، اے مغلوں کی عظمت کے نشاں اے امینِ عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں
داستاں برلب ہیں تیری پرسکوں خاموشیاں دفن ہیں سینے میں تیرے کتنے اسرارِ نہاں
تو کہ اک جنت کی جیتی جاگتی تصویر ہے
چشمِ بینا میں سراسر گردشِ تقدیر ہے

ہر روش تیری ہے میرے واسطے صبحِ بہار تختہ ہائے گل ہیں تیرے حسن کے آئینہ دار
یہ کنول، یہ حوض، یہ آبِ رواں، یہ آبشار یہ پرندوں کے ترانے، یہ ہوائیں کیف بار
تو کوئی رنگیں تخیل ہے کسی معمار کا
یا کوئی ٹھیرا ہوا نغمہ ہے موسیقار کا

دیدنی ہے اس لیے بھی تیرا حسن باوقار اب بھی ہے محفوظ تجھ میں ماں بائی کا مزار
آج بھی ہے عظمت آمیز جس سے آشکار وہ کہ تھی تاجِ جہانگیری کا درشاہوار
خسروِ عالی گہر جس کا بڑا فرزند تھا
جو لڑکپن ہی سے باہمت تھا، غیرتمند تھا

جب کیا خسرو نے احکامِ پدر سے انحراف
بڑھ گیا خرم کے اور خسرو کے باہم اختلاف
قتل سے خسرو کے بالآخر کیا میدان صاف
جب ہوا اس پیکرِ مغل کی سازشوں کا انکشاف

لاج آخر اس نے رکھ لی راجپوتی آن کی
زہر کھا کر جان خسرو کے لیے قربان کی

کہتے ہیں دو اور بھی تھے ماں جائی کے پسر
آسمان حسن و خوبی کے جو تھے شمس و قمر
کیسے رہتے دہر میں آغوشِ مادر چھوڑ کر
کھا گئی طفلی میں ان کو بھی زمانے کی نظر

ان کے نازک جسم بھی افسوس خاک آلودہ ہیں
وہ بھی خسرو باغ ہی کی خاک میں آسودہ ہیں

کیسی میٹھی نیند کی غفلت میں ہیں یہ شیر خوار
دیکھنے پائے نہ کچھ دن باغِ ہستی کی بہار
کیسے ہوں گے انکی معصومی کے وہ لیل و نہار
جب کہ تھا ان کا تبسم ماں بائی کا قرار

پہلوئے مادر میں رہ کر بھی اس سے دور ہیں
پھول سے معصوم بچے خاک میں مستور ہیں

قبر سے خسرو کے اک گونہ ہے مظلومی عیاں
کہہ رہی ہے بیکسی، بے چارگی کی داستاں
اللہ اللہ واقعاتِ خسرو و شاہ جہاں
بھائی ہو بھائی کا دشمن الحفیظ والاماں

سرنگوں ہوتے تھے جس کے سامنے اربابِ جاہ
کیا قیامت ہے کہ اس کی قبر ہو تفریح گاہ

باب التقریظ والانتقاد

ترجمان السنۃ جلد چہارم :- مولانا بدر عالم صاحب مرحوم میرٹھی، تقطیع بڑی، ضخامت ۵۱۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، مجلد، قیمت تحریر نہیں،

پتہ :- ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی۔

ترجمان السنۃ مصنف کی مشہور تصنیف ہے، اسکی تین جلدیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، یہ چوتھی جلد ہے، اس کا موضوع معجزاتِ نبوی ہے، اس کی پہلی جلدیں اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہیں، اس جلد میں جو فہرستیں منسلک ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے گذشتہ جلدوں میں بھی معجزات کو خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے، یہ جلد دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں نفس معجزہ پر بحث کی ہے، اور دوسرے میں معجزہ کی روایات جمع کی گئی ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ خود کلام مجید کا اعجاز، اس کی معجز بلاغت، اس کی اعلیٰ اخلاقی و روحانی تعلیمات، دنیا میں اس کے حیرت انگیز نتائج، عالم انسانیت پر اس کے احسانات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک، آپ کا کردار اور خلق عظیم ہے جس کے مخالفین تک معترف ہیں، اس لیے اکابر صحابہ میں سے کسی نے بھی معجزہ طلب نہیں کیا، ان کے قبول اسلام کے لیے کلام مجید کی سحر آفرینی اور نبوت کا پر جلال چہرہ کافی تھا، لیکن ہر زمانہ میں ظاہر بینوں کے قبول حق کے لیے معجزہ کی بھی ضرورت رہی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو معجزہ کی قوت بھی عطا فرمائی جس کو وہ ضرورت کے وقت کام میں لاتے تھے،

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معجزات ظاہر فرمائے، اس لیے معجزہ سے کسی مسلمان کو بھی انکار نہیں۔

لیکن معجزہ کے بارہ میں ہر زمانہ میں علما کا ذوق مختلف رہا ہے، ایک طبقہ معجزہ ہی کو نبوت کی سب سے بڑی دلیل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فضیلت سمجھتا ہے، اس لیے اس نے سارا زور معجزوں کی کثرت پر صرف کر دیا، اور معجزہ سے متعلق ہر قسم کی روایتیں قبول کر لیں اور ان کو مستقل کتابوں میں جمع کیا۔ دوسرا طبقہ معجزات پر تو ایمان رکھتا ہے لیکن ان کی روایات کو تحقیق و تنقید کے بعد رد یا قبول کرتا ہے، مولانا بدر عالم میرٹھی پہلے طبقہ میں تھے، ان کا ذوق معجزات کی کثرت کی طرف تھا، اس لیے انھوں نے اس کتاب میں معجزہ کے متعلق ہر قسم کی روایتیں جمع کر دی ہیں، اور ان کے ناقدین کو معجزہ کا منکر یا اس سے بدعقیدہ سمجھکر پورا زور ان کی تردید اور معجزات کی تکثیر اور ان کی توثیق پر صرف کر دیا ہے۔

معجزات سے کسی مسلمان کو بھی انکار نہیں، کلام مجید اور صحیح احادیث سے جو معجزات ثابت ہیں ان پر سب کا ایمان ہے، لیکن انکی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ ان کو دین و ایمان کا درجہ دیدیا جائے اور سارا زور انکی کثرت اور روایات کی صحت پر صرف کر دیا جائے، جو شخص معجزات کا منکر نہیں ہو لیکن اس کو معجزہ کے بغیر نبوت اور اسلام کی صداقت کا حق الیقین ہے، اسکا ایمان معجزہ طلب کرنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ پختہ ہے، چنانچہ صحابہ کا ایمان طالبین معجزہ سے زیادہ پختہ تھا، اس زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کو اس سے کہیں زیادہ اہم دینی و ایمانی اور اصلاحی و معاشرتی مسائل درپیش ہیں، اگر ان پر مصنف نے اپنا زور قلم صرف کیا ہوتا تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ فائدہ پہنچتا، آج جبکہ اسلام اور مسلمانوں کو مادی تصور حیات اور لادینی نظاموں کے چیلنج کا سامنا ہو اور اسلام پر ہر سمت سے حملے ہو رہے ہیں، بلکہ نفس مذہب ہی خطرہ میں پڑ گیا ہو معجزات کی کثرت اور ان کی روایتوں کی صحت پر اپنی صلاحیتیں صرف کرنا ان کا صحیح استعمال نہیں ہے۔

ہم نے اس کتاب میں معجزہ کی بحثوں کو غور سے پڑھا، یہ سارے مباحث اس خیالی مفروضہ پر مبنی ہیں کہ مصنف سیرۃ النبی معجزہ کے بارہ میں بدعقیدہ تھے، اور انھوں نے اس کی تاویلیں کرکے ان کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی ہے، اور سارا زور ان کی تردید میں صرف کر دیا ہے، اگرچہ ساری کوشش ہوا میں تلوار چلانے سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ ایمان کے رسوخ اور عقیدہ کی پختگی میں مصنف سے کم نہ تھے، انکی دینی و علمی عظمت خود ان کے حلقہ میں بھی مسلم ہے، انھوں نے کلام مجید اور صحیح روایات سے ثابت شدہ معجزات کو تسلیم اور ان کو سیرت میں نقل کیا ہے، البتہ ہر قسم کی روایتوں کو بے چون و چرا قبول نہیں کیا ہے، بلکہ ان پر تنقید بھی کی ہے، مصنف سیرت پر تنقید کرتے وقت یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انھوں نے سیرۃ النبی صرف مومنین صادقین کے لیے نہیں لکھی ہے، ان کے لیے مصنف ترجمان السنۃ اور ان کے حلقہ کی کتابیں کافی ہیں، بلکہ متشککین اور عقل پرستوں کے شکوک و شبہات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور عقل و نقل اور روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے معجزات پر ایسی مدلل اور دلنشین بحثیں کی ہیں کہ متشککین اور عقل پرستوں کے لیے بھی معجزہ سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی، ان بحثوں کی نظیر پورے اسلامی ادب میں نہیں مل سکتی، اور اس کی داد بڑے بڑے اہل نظر اور دیندار علما تک نے دی ہے، ایک خوش عقیدہ مومن کو پکا مسلمان بنانا آسان ہے لیکن متشککین اور بدعقیدہ مسلمانوں کو مسلمان بنانا بہت مشکل ہے، یہ مشکل کام مصنف سیرت نے انجام دیا ہے، سیرۃ النبی نے کتنے نامسلمانوں کو مسلمان بنا دیا، اور ان کے دلوں کو یقین و ایمان کے نور سے منور کر دیا، مگر مصنف ترجمان السنۃ کو اس میں صرف بدعقیدگی نظر آئی، یہ عجیب بات ہے کہ مصنف سیرۃ النبی جدید طبقہ میں اپنی قدامت پرستی کے لیے مشہور ہیں، اور مصنف ترجمان السنۃ ان کو بدعقیدہ سمجھتے ہیں، ع تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں سمجھو۔

اگر مصنف ترجمان السنۃ صرف علمی تحقیق کی حد تک مصنف سیرت کے خیالات سے اختلاف کرتے تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن انھوں نے تنقید میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے اور جو الفاظ استعمال

کیے ہیں وہ دونوں کی شان سے فروتر ہیں، افسوس ہے کہ اس کتاب پر مفصل تنقید کے لیے خود ایک مستقل کتاب درکار ہو جس کی نہ فرصت ہے نہ ضرورت، ورنہ اس پر بھی تنقید کی بڑی گنجائش ہے۔

اس کے دوسرے حصہ میں معجزات کے متعلق بلا امتیاز صحیح وسقیم ہر قسم کی روایتیں جمع کر دی ہیں، ان سے خوش عقیدہ مومنوں کے ایمان میں اضافہ ہو تو ہو، متشککین ومعترضین کا ذکر نہیں، اچھے خاصے دیندار تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ذہن بھی ان کو قبول نہیں کر سکتا، بلکہ اس کا الٹا اثر پڑے گا، اسی قسم کی روایات نے منکرین حدیث کو پیدا کیا ہے، ممکن ہے معجزہ سے یہ شغف مصنف کی خوش عقیدگی اور حب رسول کا نتیجہ ہو، لیکن ع "ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد"۔ اگر خوش عقیدگی کا مظہر یہی ہے تو پھر بریلیوں کو کیوں بدنام کیا جائے، ان کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ ان کے عقائد حب رسول اور خوش عقیدگی پر مبنی ہیں، اور ان پر وہ قرآن وحدیث ہی سے دلیل لاتے ہیں۔

ندوۃ المصنفین کے ناظم خود صاحب علم ونظر اور زمانہ کے حالات ورجحانات سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے انھوں نے بھی اس کتاب کی کمزوریوں کو محسوس کیا اور اپنے دیباچہ میں اس کی تاویل کی کوشش کی ہے، جو ناکافی ہے۔   "م"

سیرت النبی جلد سوم

معجزات

اولاً مقدمہ میں نفس معجزہ کی حقیقت اور اس کے مکان و وقوع پر فلسفۂ قدیمہ، علم کلام فلسفۂ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط بحث وتبصرہ ہے۔ اسکے بعد خصائص نبوت کا بیان ہے   ضخامت ۸۰۸ صفحے۔ قیمت عـــہ

منیجر

مطبوعات جدیدہ

معراج نما: - مرتبہ پروفیسر عبدالسمیع خاں نکہت شاہجہانپوری۔ متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۴۴، قیمت صر پتہ مولوی عبدالبدر ہی خاں تاجر کتب، بازار بہادر گنج، شاہ جہاں پور۔

معراج نبوی پر اردو میں بہت لکھا گیا ہے، سیرت النبی جلد سوم میں اس پر اتنی مبسوط اور محققانہ بحث ہے کہ اس پر اضافہ مشکل ہے، لائق مصنف تنہا نامور شاعر ہی نہیں بلکہ ان کو مذہبی مسائل سے بھی ذوق ہے، چنانچہ انھوں نے معراج پر یہ کتاب لکھی ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں حدیث سے واقعہ معراج کی تفصیل اور اس کے متعلق بعض قدیم و جدید ممتاز مفسرین، متکلمین، حکماء وصوفیا کی تشریحات لطیف و دلکش انداز میں پیش کی گئی ہیں، دوسرے میں بوعلی سینا کے رسالہ معراج نامہ کا اردو ترجمہ اور اس پر تبصرہ ہے، تیسرے حصہ میں لقاے الٰہی اور عرش کی بحث ہے، اس طرح اس کتاب میں معراج کی حقیقت، اس کی بعض مختلف فیہ بحثوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و مشاہدات کے متعلق قدیم و جدید افکار و آرا کا خلاصہ دیدیا گیا ہے، اور مصنف نے جمہور کے مسلک کے اندر رہتے ہوئے معراج کے متعلق بعض بصیرت افروز خیالات ظاہر کیے ہیں، اور موجودہ سائنسی انکشافات کی روشنی میں اس کا ممکن ہونا ثابت کیا ہے، لیکن معراج کا اصل مقصد دیدار الٰہی نہ تھا، بلکہ سیر ملکوت، مشاہدۂ آیات اور وہ احکام و وصایا تھے جو آپ کو اس مبارک شب میں عطا کیے گئے، لقاء و رویت کے عمومی امکان کے متعلق جو آیتیں

نقل کی گئی ہیں، ان کی نوعیت بالکل مختلف ہو، کلام مجید اور صحیح حدیثوں کی تصریح کے مطابق آپنے معراج میں خدا کے بجائے اس کی آیاتِ کبریٰ کا مشاہدہ فرمایا تھا، یہ بحثیں اتنی دقیق ہیں کہ کہیں کہیں بیان الجھ گیا ہے، اس قسم کے علمی وکلامی مباحث میں انشا پردازی کے بجائے سلیس اور آسان زبان زیادہ مناسب ہوتی ہے، اس سے قطع نظر مصنف نے وقت نظر سے کتاب لکھی ہے، اور وہ خواص کے مطالعہ کے لائق ہے،

دیوان خسرو:۔ مرتبہ ڈاکٹر انوار الحسن صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۷۰۹ مجلد، قیمت ۲۰؎ پتہ: راجہ رام کمار بکڈپو، وارث نولکشور بکڈپو لکھنؤ

ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں امیر خسرو کا پایہ سب میں زیادہ بلند ہے، اہل ایران بھی ان کی زبان دانی کے معترف ہیں، ان کی دوسری منظوم تصنیفات کی طرح چاروں دواوین بھی کئی بار چھپ چکے ہیں، لیکن کمیاب ہونے کے علاوہ ان میں اغلاط بھی تھے، حال میں ایران کے مشہور فاضل سعید نفیسی نے دیوان خسرو کو ایک مستند قلمی نسخہ کی مدد سے ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، اس میں بھی بعض چیزیں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، اس لیے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کے لائق استاد ڈاکٹر انوار الحسن صاحب نے اس مستند ایرانی نسخہ اور بعض دوسرے مطبوعہ اور قلمی نسخوں کی مدد سے یہ نیا مجموعۂ دواوین مرتب کرکے شائع کیا ہے، اس حیثیت سے یہ دیوان خسرو کا سب سے صحیح اور جامع مجموعہ ہے، حواشی میں اختلاف نسخ کو واضح کیا گیا ہے۔ اور مقدمہ میں امیر خسرو کے حالات وکمالات اور جامعیت کا اجمالی تذکرہ ہے، شعر العجم میں خسرو کا سنہ ولادت ۶۰۵ھ چھپا ہے جو دراصل کتابت کی غلطی ہے، غالباً مقدمہ نگار نے شعر العجم میں خسرو کا تذکرہ غور سے نہیں پڑھا ہے، انھوں نے خسرو کے جس بیان سے ان کا سنہ ولادت ۶۵۲ھ ثابت کیا ہے، وہ خود شعر العجم میں بھی کئی جگہ نقل ہوا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم کے نزدیک بھی

خسرو کا سنہ پیدائش سنہ ۶۵۲ھ ہی صحیح تھا۔

کلیاتِ غالب:۔ مرتبہ جناب امیر حسن نورانی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۷۲۲، مجلد، قیمت ۱۵ روپے۔ پتہ ایضاً

مرزا غالب کا اصلی سرمایۂ ناز ان کی فارسی شاعری تھی، لیکن اس کی جانب بہت کم اعتنا کیا گیا ہے، جشن غالب کے غلغلہ میں بھی زیادہ تر ان کی اردو شاعری ہی مرکز توجہ رہی، اس کمی کو جناب امیر حسن نورانی نے پورا کیا ہے، انھوں نے غالب کے متداول کلیات اور دوسرے متفرق مجموعوں کی مدد سے اس کا ایک جامع اور صحیح نسخہ مرتب کیا ہے، اس کی ترتیب و تصحیح میں دارالسلام دہلی اور نولکشور لکھنؤ کے مطبوعہ نسخوں اور دوسرے ماخذوں سے پورا استفادہ کیا گیا ہے، حواشی میں اختلاف نسخ اور بعض مشکل الفاظ و تلمیحات کی مختصر وضاحت کی گئی ہے، اور مقدمہ میں غالب کی فارسی شاعری پر اجمالی تبصرہ ہے، معلوم نہیں [illegible] کہ مطبوعہ کونسا اڈیشن مرتب کے پیش نظر تھا، بعض مقامات پر انھوں نے دارالسلام [illegible] سے اس کا جو فرق و اختلاف دکھایا ہے وہ نولکشور کے مطبوعہ سنہ ۱۳۱۰ھ والے اڈیشن میں بھی دارالسلام کے نسخہ کے مطابق ہے، مثلاً ص ۵۰۰ کا یہ حاشیہ "در نسخہ 'ن' رطل گراں" سنہ ۱۳۱۰ھ کے اڈیشن میں دارالسلام کے نسخہ کے مطابق "رطل گراں" ہی ہے، ص ۷۰۳ کے حاشیہ میں "ید اللہ فوق ایدیہم الآیہ کا ترجمہ" دست خدا فوقیت دارد بر دستہائے ایشاں" صحیح نہیں، ان خامیوں سے قطع نظر غالب کے فارسی کلام کا یہ سب سے مکمل اور جامع مجموعہ اور سلسلۂ غالبیات کا اہم اور مفید کام ہے۔ نولکشور پریس کے وارث راجہ رام کمار نے ہندوستان کے دو بلند پایہ فارسی شاعروں کے کلیات شائع کرکے اپنے لائق بزرگ کی جانشینی کا پورا حق ادا کیا اور فارسی شعر و ادب کی بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔

حقیقت گلزار صابری:۔ مرتبہ جناب شاہ محمد حسن صاحب صابری، بڑی تقطیع، کاغذ،

کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۴۶۵ مجلد، قیمت درج نہیں، پتہ دین محمد اینڈ سنز،

اشاعت منزل، بل روڈ، [illegible]

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر سلسلۂ چشتیہ کے نامور مجدد، حضرت بابا فرید شکر گنج کے جلیل القدر خلیفہ اور اس سلسلہ کی مشہور شاخ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مؤسس و بانی تھے، شاہ محمد حسن صاحب رام پوری (م ۱۳۱۳ھ) کا جو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی اولاد میں تھے تعلق بھی اسی سلسلہ سے تھا، زیر نظر کتاب میں انھوں نے حضرت مخدوم صاحب کے علاوہ ان کے سلسلہ کے بعض اور نامور متوسلین کے حالات و کمالات اور کشف و کرامات کے واقعات تحریر کیے ہیں اور بعض واقعات منظوم بھی لکھے ہیں، حضرت مخدوم صاحب کے ذکر سے ان کے معاصر تذکرے اور تاریخیں خالی ہیں، اور ان کے متعلق متاخرین کی کتابوں اور بیانات کا دار و مدار کشف اور سماعی روایات پر ہے، اس لیے اس کتاب کا ماخذ بھی یہی کتابیں ہیں، اس کا سنہ تصنیف ۱۳۰۳ھ ہے اور یہ اس کا پانچواں اڈیشن ہے، زبان قدیم طرز کی ہے، صوفیہ کے تذکروں کی طرح یہ کتاب بھی مستند و غیر مستند اور رطب و یابس کا مجموعہ ہے، مگر اس میں بہت سی مفید اور کام کی باتیں مل جاتی ہیں،

عبرت کدۂ سندھ:۔ مترجمہ جناب سید محمد ضامن کنتوری صاحب، تقطیع کلاں کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد ۱۲ روپے

پتہ: نفیس اکیڈمی بلاسس اسٹریٹ کراچی ۱

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح سندھ پر بھی انگریزوں نے جابرانہ قبضہ کیا تھا، ان کے اس جبر و استبداد کا خود انصاف پسند انگریزوں نے بھی اعتراف کیا ہے، چنانچہ اس کتاب میں بھی جو ان واقعات کے عینی شاہد اور ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ مسٹر ای بی ایسٹ وک

کا سفرنامہ ہے۔ امرائے سندھ پر انگریزوں کے ناروا مظالم اور ان کی معاہدہ شکنی کا اعتراف کیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں ان کے غاصبانہ قبضہ کی روداد، میانی وغیرہ کی خونریز جنگ کی داستان اور امرائے انگریزوں کے الزامات کی تردید کی گئی ہے۔ مصنف نے سندھ کے پورے علاقہ کا دورہ کیا تھا، اس لیے ضمناً اس کے جغرافیائی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی حالات اور ہندوؤں کے ساتھ مسلمان امراء کے حسن سلوک کا ذکر بھی آگیا ہے، اس حیثیت سے یہ سفرنامہ سندھ پر انگریزوں کے جابرانہ قبضہ کی مستند تاریخی دستاویز اور بڑے متنوع معلومات پر مشتمل ہے، اور تاریخ ہند کے طلبہ کے لیے عموماً اور تاریخ سندھ کے طلبہ کے لیے خصوصاً مطالعہ کے لائق ہے، اس کا اردو ترجمہ ۱۹۰۳ء میں کیا گیا تھا، یہ دوسرا اڈیشن ہے، اس زمانہ کے لحاظ سے بھی اسکی زبان عام فہم اور ترجمہ سلیس ہے۔

غزال و غزل - از جناب سراج الدین ظفر صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۱۲، مجلد مع گردپوش، قیمت عـلـہ پتہ: فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، راولپنڈی وغیرہ۔

جناب سراج الدین ظفر پاکستان کے صاحب مذاق شاعر ہیں، یہ ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف لیلائے غزل کے عاشق اور اس کے روایتی قالبوں کے حدود میں رہنے کے باوجود اسکی عام روایتوں کے پابند نہیں ہیں، انھوں نے غزل کے مخصوص الفاظ، استعاروں، علامات اور رموز کو نئے معانی و حقائق دینے کی کوشش کی ہے، اور اسی پردہ میں کائنات کے حقائق کی جستجو اور زندگی کے مسائل کی نقاب کشائی کی ہے۔ لیکن اس جدت طرازی کی وجہ سے کلام میں ناہمواری بھی آگئی ہے تاہم مصنف کے منفرد اسلوب اور اچھوتے انداز بیان کی وجہ سے یہ مجموعہ قابل توجہ ہے، شوخ تصویروں کی کثرت لطیف و سنجیدہ طبائع پر بار ہو سکتی ہے۔

"ض"

مصنفاتِ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: ۶؎

۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصۂ دوم) " ۵؎

۳۔ اسوۂ صحابیات: " ۳؎

۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کے خصوصیات کی تفصیل: قیمت: غلہ

۵۔ حکمائے اسلام: (حصۂ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: غلہ

۶۔ حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: ٹعہ

۷۔ شعر الہند (حصۂ اول) " غلہ

۸۔ شعر الہند (حصۂ دوم) " لعہ

۹۔ انقلابِ الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ

۱۰۔ سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیرِ طبع)

۱۱۔ امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت ۵؎

۱۲۔ ابنِ خلدون: ابنِ خلدون کے سوانحِ زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیرِ طبع)

۱۳۔ اقبالِ کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ۵؎

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی تاریخی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیشِ نظر ہے۔ یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۲۴۶ قیمت: عہ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دین اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۳۳۰ صفحے، قیمت :- ۵۰/ مجلد

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

69

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) ستمبر ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

جلد ۱۰۴ ۔ ماہ جمادی الاخری ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۹ء ۔ عدد ۳

مضامین

شذرات

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول اور خانہ کعبہ و مسجد نبویؐ کے بعد تیسری سب سے محترم مسجد ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں شب معراج میں نماز پڑھی اور یہیں سے آپ کو معراج ہوئی تھی، اسلیے اسکی بے حرمتی پوری دنیائے اسلام کے لیے بڑا سانحہ اور بین الاقوامی آئین و آداب کے بھی خلاف ہے، اس لیے پوری دنیا نے یہودیوں کو ملامت کی، مسلمان اس حادثہ پر جسقدر بھی غم و غصہ کا اظہار کریں کم ہے، اسلام اور مسلمانوں سے یہودیوں اور عیسائیوں کی دشمنی ہم اسو سال پرانی ہے، عارضی سیاسی مصالح کے علاوہ وہ کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے، جس پر خود قرآن مجید اور اسلامی تاریخ شاہد ہے، چنانچہ آج بھی پوری عیسائی دنیا یہودیوں کی پشت پناہی کر رہی ہے، اس لیے عربوں اور یہودیوں کی جنگ سیاسی بھی ہے اور مذہبی بھی، اور جنگ صلیبی کی طرح اسکا سلسلہ اُس وقت تک قائم رہیگا جبتک مسلمانوں میں کوئی صلاح الدین ایوبی نہ پیدا ہو، یا وہ یہودیوں کے مقابلہ میں سپر نہ ڈال دیں۔

اسکی ذمہ داری عرب بھی بری نہیں ہیں، جنگ میں کامیابی کے دو ہی وسائل ہیں، ایمانی قوت اور مادی طاقت، عربوں کی ایمانی قوت کا یہ حال ہے کہ سعودی عرب کے علاوہ قریب قریب پوری عرب دنیا مغربی تہذیب، سوشلزم اور کمیونزم کے سیلاب میں اس کے تمام لوازم کے ساتھ بہی چلی جا رہی ہے، مصر جو اس جنگ کا لیڈر ہے اس راہ میں سب سے آگے اور روس کے پنجہ میں اس طرح اسیر ہے کہ اس سے رہائی کی بظاہر کوئی صورت نہیں، مادی وسائل کا یہ حال ہے کہ جن ملکوں میں دولت آگئی ہے وہ تمامتر تعیشات میں غرق اور زندگی کی ساری ضروریات میں مغربی ملکوں کے محتاج ہیں، جس سے سعودی عرب بھی مستثنیٰ نہیں، ان سب سے بڑھکر آج بھی ان میں پھوٹ قائم ہے، اور یہودیوں کے مقابلہ میں بھی پورا اتحاد نہیں، اسلیے وہ کس قوت کے بل پر یہودیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ غنیمت یہ ہے کہ اب ناصر کو کچھ ہوش آگیا ہے۔

یہ سب نتیجہ ہے ناصر کی غلطیوں کا، انھوں نے جنگی قوت کے بجائے محض پروپگنڈے اور کھوکھلے نعروں سے یہودیوں کا مقابلہ کرنا چاہا، اور جو حقیقۃً مجاہدین کی جماعت تھی اس کو ختم کر دیا، اسکا نتیجہ پوری قوم کو بھگتنا پڑا، مگر اخوان کی

قوت موجود ہوتی تو مصر کو یہ برا دن نہ دیکھنا پڑتا، آج بھی جو کچھ کر رہے ہیں وہ الفتح کے بے سروسامان مجاہدین ہی کر رہے ہیں، اور آیندہ بھی ان ہی سے توقع ہے، مجلس اقوام متحدہ یا کسی بڑی قوت سے توقع رکھنا عبث ہے، مجلس اقوام تو بڑی قوموں کا کھلونا ہے، اور اس کا مفاد اسی میں ہے کہ یہودی عربوں پر مسلط رہیں، انکا مقابلہ صرف عربوں کی متحدہ طاقت ہی کرسکتی ہے، اگر عرب حکومتیں متحد ہوجائیں تو امریکہ کب تک یہودیوں کو بچاتا رہے گا، آخر میں ان کو ہار ماننا پڑے گی، ورنہ عربوں کو اس سے بھی برے دن دیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، قوانین قدرت ساری قوموں کے لیے یکساں ہیں، ان سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں ہیں،

گذشتہ مہینہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کا ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مقامی ارکان کے علاوہ بعض بیرونی ارکان اور اسکے معتمد داولڈ بوائے شریک ہوئے، اور مدتوں کے بعد ندوہ میں اسکے فرزندوں کا ایسا اجتماع ہوا، ملک کے عام اقتصادی حالات کا اثر ندوہ پر بھی ہے، اس کے مصارف روز بروز بڑھتے جاتے ہیں، گرانی کی وجہ سے تنخواہوں کے معیار، طلبہ کے وظائف اور تعمیر وغیرہ کے مصارف میں غیر معمولی اضافہ اور اس کا سالانہ بجٹ تین لاکھ سے اوپر ہوگیا ہے، جس کی فراہمی کا بار تمام تر مولانا ابوالحسن علی ندوی پر ہے، انکی نظامت کے زمانہ میں ندوہ نے ہر پہلو سے جس قدر ترقی کی ہے اس کی مثال اسکی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر اسلامی ملکوں تک پہنچ گئی ہے، اور ان میں اس کا اتنا اعتبار قائم ہوگیا ہے کہ اس وقت ندوہ میں نہ صرف اسلامی بلکہ خاص عرب ملکوں کے بہت سے طلبہ زیر تعلیم ہیں، تعلیمی اور علمی معیار کی ترقی پر عربی کا ماہانہ رسالہ البعث اور پندرہ روزہ اخبار الرائد شاہد ہیں جن کی علمی و ادبی حیثیت کو عرب ادیب و فضلاء تک مانتے ہیں، علمی و دینی تحقیق و تصنیف کے دو ادارے قائم ہیں، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام اور مجلس تحقیقات شرعیہ، اول الذکر میں اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر عربی، اردو اور انگریزی میں علمی و تحقیقی کتابیں تصنیف اور شائع ہوتی ہیں، اور آخر الذکر میں مسائل حاضرہ پر شرعی نقطۂ نظر سے تحقیق ہوتی ہے، تعمیرات میں دو وسیع اور شاندار ہوسٹل، اساتذہ کے لیے سکونتی مکانات تعمیر ہوگئے ہیں،

ین عمارتیں زیر تجویز ہیں جن کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے، غرض علمی، تعلیمی، مالی اور تعمیری ہر حیثیت سے ہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اور یہ سارا کارنامہ مولانا سید ابوالحسن علی کا ہے

لیکن بڑی سے بڑی شخصیت بھی تنہا کسی بڑے ادارہ کا بار نہیں سنبھال سکتی اور نہ اسکی جملہ ضروریات کی کفالت سکتی ہے، جب تک اس کی معاون ایک پوری جماعت نہ ہو، اس لیے مسلمانوں خصوصاً ان کے عقیدت مند ہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ندوے کے کارکنوں کو مصارف کی فکر سے آزاد کر دے، تین لاکھ کی رقم کوئی بڑی م نہیں ہے، یہ رقم تو تنہا مسلمان تاجر فراہم کر سکتے ہیں، اور ندوہ کے کارکنوں کا یہ فرض ہے کہ ہ دارالعلوم کے کاموں میں اپنے اشتراک و تعاون سے مولانا کا بار ہلکا کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہ ذہنی سکون اور جمعیت خاطر کے ساتھ ندوے کی خدمت انجام دے سکیں، یہی کیا کم ہے کہ وہ اپنی صحت کی خرابی اور معذوریوں کے باوجود اس بارگراں کو اٹھائے ہوئے ہیں، اس وقت اس جہاز کو چلانے والا دوسرا نہیں ہے، ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہمایوں کبیر صاحب نے انتقال کیا، وہ اس دور کے لائق ترین مسلمانوں میں تھے اور اپنے ذوق کے اعتبار سے علمی و تعلیمی لائن کے آدمی تھے، لیکن انھوں نے سیاست کا پُرخار راستہ اختیار کیا، اس لیے اس میں کامیاب نہ ہو سکے، علمی و تعلیمی لائن میں وہ زیادہ مفید کام انجام دے سکتے تھے، ان میں بعض خامیوں کے باوجود اسلامی حمیت پوری طرح موجود تھی جس کا اظہار انکی تقریروں میں ہوتا رہتا تھا، وہ مولانا ابوالکلام کے شعبہ میں رہ چکے تھے، اس لیے دارالمصنفین سے بھی واقف اور اس کے بڑے قدردان تھے، چنانچہ انھوں نے مولانا کے بعد بھی دارالمصنفین کے کاموں میں بڑی مدد پہنچائی، اب جو اور جیسا مسلمان بھی اٹھتا ہے، اس کا بدل نہیں مل سکتا، اس لیے ان کی جگہ بھی خالی رہے گی، اللہ تعالیٰ ان کی خامیوں اور خطاؤں سے درگذر کر کے ان کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

کیا امام دار قطنیؒ امام ابو حنیفہؒ سے تعصب رکھتے تھے

از ضیاء الدین اصلاحی

امام دار قطنیؒ کا شمار نامور محدثین اور مشہور علمائے اسلام میں ہے، لیکن دوسرے اکابر کی طرح ان پر بھی بعض اعتراضات کئے گئے ہیں، ان میں سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ وہ متشدد شافعی تھے اور اس مذہب کی جا و بیجا حمایت اور امام ابو حنیفہؒ پر نکتہ چینی کرتے تھے، اور حنفی مذہب سے ان کو سخت عناد و تعصب تھا، فقہ حنفی کی متعدد کتابوں مثلاً ابراہیم بن محمد حلبی (م ۹۵۶ھ) کی غنیۃ المستملی شرح منیۃ المصلی المعروف بالکبیری، علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی (م ۸۵۵ھ) اور ابو العباس احمد بن سروجی (م ۷۱۰ھ) کی شرح ہدایہ، ابو محمد جمال الدین عبد اللہ بن یوسف زیلعی (م ۷۶۲ھ) کی نصب الرایہ اور علامہ محمد معین سندی (م ۱۱۶۱ھ) کی دراسات اللبیب وغیرہ میں اس اعتراض کا ذکر ملتا ہے، عینی نے حافظ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی جوزی (م ۵۹۷ھ) کے متعلق بھی لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں

وقال ابو الفرج لا یقبل طعن الدار قطنی اذا انفرد لما عرف من عصبیتہ (عینی شرح ہدایہ ج ۱ ص ۳۵۶)

ابو الفرج کا بیان ہے کہ چونکہ دار قطنی کی عصبیت مشہور ہے اس لیے ان کا طعن اس وقت قبول نہیں کیا جائیگا جب وہ اس میں منفرد ہوں۔

امام دارقطنی کی عصبیت کے سلسلہ میں دو باتیں کہی گئی ہیں، ایک شافعیت میں غلو، دوسرے حنفیت سے عناد، پہلی بات کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے

"وہ جب مصر گئے تو بعض لوگوں کے استدعا پر انھوں نے جہری نماز میں جہر سے بسم اللہ پڑھنے کے متعلق ایک رسالہ لکھا، جب اس کی حدیثوں کی صحت کے متعلق مالکیہ نے قسم ولاکران سے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جہر بالبسملہ کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے، البتہ صحابہ کرام سے اس بارہ میں صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی روایتیں ملتی ہیں [1]،،

علامہ زیلعی حنفی نے یہ واقعہ علامہ ابن تیمیہ حنبلی (م ۷۲۸ھ) کے مشہور شاگرد حافظ ابن عبدالہادی (م ۷۴۴ھ) کے حوالہ سے بیان کیا ہے، اور اس کو اس طرح شروع کیا ہے:

وقد حکی لنا مشائخنا ان الدارقطنی	ہم سے ہمارے شیخ نے بیان کیا ہو کہ دارقطنی
لما ورد مصر [2] الخ	جب مصر تشریف لائے ۔

لیکن خود حافظ ابن تیمیہ نے اس واقعہ کو اس طرح تحریر کیا ہے:

"یا پھر جہر بالبسملہ کی حدیثیں بیان کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس باب کے مرویات جمع کیے، جیسے دارقطنی اور خطیب وغیرہ، ان حضرات نے اس کے متعلق روایتیں جمع کیں اور جب ان سے ان کی صحت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے اپنے اپنے علم کے مطابق جواب دیا، چنانچہ امام دارقطنی جب مصر گئے اور ان سے جہر بالبسملہ کی حدیثیں جمع کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے اس کے متعلق کوئی صحیح چیز ثابت نہیں ہے، البتہ صحابہ کرام سے صحیح وضعیف دونوں قسم کی چیزیں ملتی ہیں [3]۔"

---

[1] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۸ و ۳۵۹ و کبیری ص ۳۰۱ مطبع محمدی لاہور ۱۳۰۳ھ [2] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۵
[3] فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ،،

امام ابن تیمیہ کے بیان میں قسم دلانے کا کوئی تذکرہ نہیں، یہ بات غالبًا بعد میں زیب داستان کے لیے بڑھا دی گئی ہے، ورنہ امام دارقطنی کے زمانہ کی نوعیت، ابن تیمیہ، ابن عبد الہادی، اور زیلعی کے زمانہ سے مختلف تھی، اس زمانہ میں فقہی اور جماعتی عصبیت میں زیادہ شدت نہیں پیدا ہوئی تھی، بلکہ عموماً حق پسندی محدثین اور علماء کا امتیاز تھی، امام دارقطنی بھی اس وصف سے متصف تھے، اور قسم دلانے کی بات ان کی عظمت شان کے منافی معلوم ہوتی ہے،

ان بیانات کے قدر مشترک کی روشنی میں یہ اعتراض ضرور پیدا ہوتا ہے کہ امام دارقطنی نے جان بوجھ کر اور بالقصد کیوں ضعیف روایتیں جمع کیں، کیا اس کا مقصد محض اپنے فقہی مسلک کی بیجا حمایت تھا، حافظ ابن تیمیہ کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

او یرویھا من جمع ھذا الباب	یا جہر بالبسملہ کی حدیثوں کو ان لوگوں نے بیان
کالدارقطنی والخطیب وغیرھما	کیا ہے جنھوں نے اس باب کو جمع کرنے کا ارادہ کیا
فانھم جمعوا ما روی	جیسے دارقطنی اور خطیب وغیرہ، ان لوگوں نے اس
(فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۸۸)	باب کی تمام حدیثیں جمع کی ہیں۔

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام دارقطنی کا مقصد اس باب کی تمام حدیثوں کو اکٹھا کر دینا تھا اور غالبًا اسی استقصا کے خیال سے انھوں نے اس میں ضعیف حدیثیں بھی درج کر دی ہیں، اگر انکا مقصد فقہی عصبیت ہوتا تو وہ اس میں صرف ان ہی احادیث و آثار کو درج کرتے جو ان کے مذہب کی موید تھیں، لیکن ان کے پیش نظر ایک جامع رسالہ مرتب کرنا تھا، اس لیے انھوں نے موافق اور مخالف مذہب دونوں قسم کی حدیثیں تحریر کر دیں، اسکی تائید سنن کی اس تصریح سے بھی ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

"جہر بالبسملہ کے متعلق ان صحابہ کرام کے علاوہ بھی جن کا ہم نے یہاں نام لیا ہے، دوسرے صحابہ کرام اور ازواج مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بیان کی ہیں، ان کو ہم

علیٰحدہ کتاب الجہر میں لکھ چکے ہیں، یہاں اختصار کے خیال سے صرف مذکورہ بالا بزرگوں کی حدیثوں کو نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس رسالہ میں ہم ان صحابہ کرام اور تابعین عظام کی روایتیں بھی بیان کر چکے ہیں، جو جہر سے بسم اللہ پڑھنے کے قائل ہیں، اور ان کی بھی جنھوں نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے۔"[1]

اسی طرح سنن میں بھی امام دارقطنی نے جہر بالبسملہ کی مؤید و مخالف دونوں قسم کی حدیثوں کے لیے الگ الگ ابواب قائم کیے ہیں، اور اپنی حق پسندی کی بنا پر اپنے مسلک کی بعض مؤید حدیثوں کے ضعف و وہن کی وضاحت بھی کر دی ہے۔

جہر بالبسملہ کے متعلق امام دارقطنی نے اپنے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہی ائمہ محققین اور ارباب نظر محدثین کا بھی فیصلہ ہے، حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وقد اتفق اهل المعرفة بالحديث	حدیث کی معرفت رکھنے والوں کا اتفاق ہے
على انه ليس بها الجهر بها حديث	کہ جہر بالبسملہ کے متعلق کوئی صریح حدیث موجود
صريح ولم يروا اهل السنن المشهورة	نہیں ہے، اور نہ اس بارہ میں مشہور اہل سنن
كابي داؤد والترمذي والنسائي شيئا	جیسے ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے کوئی روایت
من ذلك وانما يوجد الجهر بها صريحا	تحریر کی ہے، اسکی صراحت صرف ان موضوع حدیثوں
في احاديث موضوعة يرويها الثعلبي	میں ملتی ہے جن کو ثعلبی و ماوردی وغیرہ نے
والماوردي وامثالهما في التفسير او	کتب تفسیر میں روایت کیا ہے، یا ان فقہا کی
في بعض كتب الفقهاء الذين لا يميزون	کتابوں میں ملتی ہے جو موضوع وغیر موضوع
بين الموضوع وغيره ..... او يرويها	روایتوں میں امتیاز نہیں کرتے ..... یا پھر
جمع هذا الباب كالدارقطني والخطيب وغيرهما	اس سلسلہ کی حدیثوں کو ان لوگوں نے بیان کیا ہے

(فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱ ص ۱۷۱)

نصب الرایہ ج ۱ ص [illegible] دارقطنی اور خطیب وغیرہ

[1] سنن دارقطنی ج ۱ ص ۱۱۷ مطبوعہ فاروقی دہلی ۱۳۱۰ھ

عقیلی کا بیان ہے کہ

ولا یصح فی الجھر بالبسملۃ	(نماز میں) بسم اللہ زور سے پڑھنے کے بارہ میں
حدیث مسند[۱]	کوئی مسند حدیث صحیح نہیں ہے۔

صحاح کی ان مشہور شرحوں میں بھی جو شوافع نے لکھی ہیں، اس مذہب کی تائید میں کوئی صحیح روایت نہیں پیش کی گئی ہے[۲]، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں فقہائے عراق اور امام ابوحنیفہ کا مسلک ہی اقرب الی السنۃ ہے۔

امام صاحب کا یہ ارشاد بھی بالکل بجا ہے کہ صحابہ کرام سے اس کے متعلق صحیح و غلط دونوں قسم کی روایتیں ملتی ہیں، علامہ ابن تیمیہ نے بھی ان کے اس خیال کی کوئی تردید نہیں کی ہے اور حازمی کا بیان ہے کہ

ان احادیث الجھر، وان کانت	جہر بالبسملہ کی حدیثیں اگرچہ صحابہ کی ایک جماعت
ماثورۃ عن جماعۃ من الصحابۃ	سے مروی ہے لیکن ان میں سے اکثر جرح کے
غیر ان اکثرھا لم یسلم من شوائب	شائبوں سے محفوظ نہیں ہیں، یہی حال
الجرح کما فی الجانب الآخر[۳]	عدم جہر والی روایتوں کا بھی ہے۔

علامہ زیلعی حنفی نے اس باب کی تمام احادیث و آثار کی تخریج کرکے ان کی صحت وضعف پر مفصل گفتگو کی ہے لیکن بعض آثار صحابہ کی صحت و قوت کا وہ بھی انکار نہیں کر سکے ہیں، مثلاً سعید بن عبد الرحمن ابن ابزی نے اپنے والد سے یہ روایت کی ہے کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو حضرت عمرؓ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم زور سے پڑھا، سعید کا بیان ہے کہ میرے والد عبد الرحمن بھی بسم اللہ زور سے پڑھتے تھے، اسی طرح بکر بن عبد اللہ مزنی نے ابن زبیر کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے بسم اللہ زور سے پڑھا،

---

۱ نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۳ ۲ دیکھئے نووی شرح مسلم مطبوعہ مصر ج ۴ ص ۱۱۱ و فتح الباری ج ۲ ص ۱۸۸-۱۸۹ و معالم السنن خطابی ج ۱ ص ۱۹۸ و ۱۹۹ ۳ نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۶۲ و کبیری ص ۳۰۱

گو زیلعی نے ان آثار کی مختلف توجیہیں کی ہیں اور انھیں صحیح حدیثوں کے خلاف بتایا ہے، تاہم وہ انکے اسناد وغیرہ میں کوئی ضعف ثابت نہیں کرسکے ہیں، بلکہ ابن زبیرؓ کے اثر کے بارہ میں ابن عبد الہادی کی توثیق نقل کی ہے[۱]۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ امام دارقطنی نے محض استقصاء اور جامعیت کے خیال سے صحیح وضعیف دونوں قسم کی حدیثیں درج کی ہیں، اور زیر بحث واقعہ سے تعصب کے بجائے انکی حق پسندی کا ثبوت ملتا ہے، کیونکہ یہ رسالہ شوافع کے مرکز یعنی اہل مصر کی فرمائش پر لکھا گیا تھا جو یہ چاہتے تھے، کہ امام صاحب صرف جہر بالبسملہ کی حدیثیں جمع کردیں، لیکن انھوں نے ان کی اس خواہش کی پرواہ کیے بغیر انصاف اور حق پسندی سے کام لے کر دوسرے نقطۂ نظر کی حدیثیں بھی ان میں شامل کیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر سنن میں انھوں نے شوافع کے مسلک کی موید حدیثوں کے ضعف وحسن کی بھی تصریح کردی اور رسالہ کی حدیثوں کے متعلق تو ان کا صاف اقرار ہی موجود ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امام دارقطنی نے امام شافعی کے مسلک کی تائید وترجیح کے خیال ہی سے رسالہ مرتب کیا تھا، تب بھی اس سے ان کی عصبیت کا ثبوت نہیں ملتا، کیونکہ تمام متبعین مذاہب اپنے ائمہ کے مسلک کو قوی اور مرجح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، امام دارقطنی نے تو اس کے برعکس اپنے مسلک کی مخالف حدیثوں کو بھی جمع کیا اور موافق حدیثوں کے ضعف وعدم صحت کا اقرار بھی کیا جس سے ان کا عدم تعصب ظاہر ہوتا ہے،

البتہ ایک خلش رہ جاتی ہے کہ جب امام دارقطنی کے خود اپنے خیال کے مطابق صحیح حدیثوں سے جہر بالبسملہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا تو انھوں نے اس سے رجوع کیوں نہیں کرلیا، یہ رجوع نہ کرنا درحقیقت شافعیت میں ان کے غلو اور اس کی بیجا حمایت ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے لیکن جو لوگ

---

[۱] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۲ و ۳۵۶،

جہر بالبسملہ کے قائل ہیں، ان کے بھی کچھ دلائل ہیں محض عصبیت کی وجہ سے عدم جہر کا انکار نہیں کرتے مثلاً

(۱) جن حدیثوں میں جہر کا ذکر ہے، اگرچہ ان کا درجہ صحت و قوت کے لحاظ سے ان حدیثوں سے جن میں جہر کا ذکر نہیں ہے، کم ہے، تاہم جہر والی حدیثوں کی تعداد زیادہ ہے، اور عدم جہر کا ذکر صرف چند ہی حدیثوں میں ہے، اور پہلی قسم کی طرح اس قسم کی حدیثوں پر بھی کلام کیا گیا ہے۔

عدم جہر کے متعلق سب سے مشہور حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے، لیکن اس کے متعدد طرق اور واسطوں میں بعض کی سندیں قوی نہیں ہیں، علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ حضرت انس کی روایت میں ایسا اضطراب پایا جاتا ہے جس کی بنا پر محدثین کے نزدیک اس سے کوئی حجت قائم نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ مرفوعاً اور غیر مرفوعاً دونوں طریقوں سے مروی ہے، بعض لوگوں نے اس میں حضرت عثمانؓ کا ذکر کیا ہے اور بعض نے نہیں، بعض راویوں نے بیان کیا ہے کہ بسم اللہ پڑھتے تھے (غالباً آہستہ سے) بعض نے بیان کیا ہے کہ بسم اللہ پڑھتے ہی نہیں تھے، بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ بسم اللہ زور سے نہیں پڑھتے تھے[۱]۔

اس سلسلہ کی دوسری مشہور روایت حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے مروی ہے، اس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، لیکن یہ زیادہ واضح اور صریح نہیں ہے، تیسری حدیث ترمذی میں عبداللہ ابن مغفل کے واسطہ سے مروی ہے، امام ترمذی نے گو اس کی تحسین کی ہے (تصحیح نہیں) لیکن بعض محدثین نے اس کی صحت میں بھی کلام کیا ہے[۲]۔

دوسری طرف جن حدیثوں میں بسم اللہ جہر سے پڑھنے کا ذکر ہے، ان میں بعض کی توثیق کی گئی ہے، مثلاً نعیم بن مجمر کی حدیث کی تخریج دارقطنی کے علاوہ بھی بعض اکابر محدثین اور ائمہ فن جیسے امام امام نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان، بیہقی اور حاکم وغیرہ نے کی ہے، اور دارقطنی کی طرح بیہقی نے

---

[۱] بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۹۷ [۲] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۳۲

اس کے اسناد کو صحیح قرار دیا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کے تمام رواۃ کی عدالت پر اتفاق ہے اور وہ سب ثقہ و حجت ہیں، حاکم نے اس کو صحیحین کے شرائط کے مطابق بتایا ہے[۱]، اسی طرح جہر کے متعلق ایک حدیث حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے، اور محدثین کی ایک جماعت اسکی صحت کی قائل ہے،[۲]

۲۔ حدیثوں کے علاوہ متعدد آثار صحابہ سے بھی جن میں بعض کی صحت جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، مسلم ہے، اس مسلک کی تائید ہوتی ہے،

۳۔ متعدد کبار صحابہ مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور کئی حافظ تابعین نیز بعض مشہور فقہائے امصار امام شافعیؒ امام ابو ثور، ابو عبید قاسم بن سلام، اسمٰعیل بن حماد اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے،[۳]

۴۔ جہر کی حدیثوں سے ایک چیز کا ثبوت ملتا ہے اور عدم جہر کی روایتوں سے نفی ثابت ہوتی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ اثبات کو نفی پر ترجیح و تقدم حاصل ہوتا ہے،

۵۔ شوافع نے اس مسئلہ میں اس اصول کا لحاظ کیا ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی اور ایک روایت کے مطابق ہر ہر سورہ کی آیت ہے، اس لیے وہ جہری نمازوں میں اس کو سورۂ فاتحہ کا جزء سمجھکر اس سے پہلے اور دوسری روایت کے بموجب ہر سورہ کا جزء مان کر سورۂ فاتحہ کے بعد اور سورہ شروع کرنے سے پہلے بھی زور سے پڑھنا ضروری قرار دیتے ہیں، امام نووی لکھتے ہیں۔

"ہمارے اصحاب اور ان لوگوں کی جو بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کی آیت مانتے ہیں، دلیل یہ ہے کہ یہ مصحف کے اندر اسکی شان تحریر کے ساتھ لکھی جاتی ہے، اور یہ صحابہ کے اجماع سے ثابت ہے کہ وہ قرآن میں غیر قرآن کو اس کی شان خط کے ساتھ درج نہیں کرتے تھے، شروع سے ابتک تمام مسلمانوں کا بھی یہی اجماع ہے،"[۵]

---

[۱] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۳۵ [۲] ایضاً ص ۳۴۵ [۳] بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۹۷ و جامع ترمذی ص ۳۴ مطبع علوم دہلی [۵] نووی شرح مسلم مصر ج ۴ ص ۱۱۱

فقہا کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو چیز کتاب وسنت کے متفقہ اصولوں سے ثابت ہو اس کو کسی حال میں رد نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ اس کے مقابلہ میں آثار و احادیث کو نظر انداز کر دیتے ہیں، فقہ حنفی میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

۶۔ جن حدیثوں میں بسم اللہ آہستہ پڑھنے کا ذکر ہے اور وہ صحیح ہیں، ان کو رد کرنے کے بجائے یہ لوگ ان کی تاویل کرتے ہیں، ان کی تاویل و توجیہ سے اتفاق نہ کرنا الگ بات ہے تاہم اس کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ان ہی اسباب کی بنا پر بعض دوسرے علما، کی طرح امام دارقطنی بھی بسم اللہ کو جہری نمازوں میں زور سے پڑھنے کے قائل تھے، ان کے خیال میں اس کے دلائل دوسرے مسلک کے دلائل سے قوی رہے ہوں گے۔ اس لیے انھوں نے اس کو مرجح سمجھا اور اس سے رجوع کرنا پسند نہیں کیا۔

امام دارقطنی کا اس مسئلہ میں رجوع بھی خالی از امکان نہیں، کیونکہ جس زمانہ میں انھوں نے یہ رسالہ تالیف کیا تھا، غالباً اس وقت ان کے سامنے یہ مسئلہ منقح نہیں تھا، لیکن رسالہ کی ترتیب کے کچھ عرصہ بعد جب اس کے متعلق سوالات کیے گئے اور امام صاحب کو زیادہ توجہ سے اس پر غور کرنے کا موقع ملا تو یہ مسئلہ ان کی نگاہ میں منقح ہو گیا، جیسا کہ ان کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے، اس تنقیح کے بعد ممکن ہے انھوں نے رجوع کر لیا ہو، لیکن اس کی کوئی تصریح موجود نہیں۔

رہا یہ سوال کہ کیا ان کو واقعۃً شافعیت میں غلو تھا، اور وہ اس مذہب کی بلا وجہ تائید و حمایت کرتے تھے، تو بظاہر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور نہ زیر بحث واقعہ سے اس کی کوئی دلیل مہیا ہوتی ہے، بلکہ جیسا کہ پہلے گذرا، اس سے ان کی حق پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ درحقیقت امام صاحب ان علمائے حق میں تھے جن کی عظمت شان سے اس قسم کا غلو اور تعصب بعید ہے۔ انکا شافعی مذہب کی طرف میلان ضرور تھا لیکن وہ مجتہد فی المذہب تھے، اس لیے اپنے

امام کی ناحق تائید نہیں کر سکتے تھے، علمائے دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کو جو مقام حاصل ہے وہ پوشیدہ نہیں، مولانا توجیہ النظر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:۔

واما الدارقطنی فانہ کان یمیل	امام دارقطنی کا میلان شافعی مذہب
الی مذہب الشافعی الا ان لہ	کی طرف تھا لیکن وہ صاحب اجتہاد
اجتھاد او کان من ائمۃ الحدیث	اور ائمہ حدیث وسنت میں تھے، اور
والسنۃ ولم یکن حالہ کحال	ان کا حال اپنے بعد کے بڑے محدثین جیسا
احد من کبار المحدثین ممن	نہ تھا، جو بجز چند گنے چنے مسائل کے عموماً
جاء علی اثرہ فالتزم التقلید	تقلید کا التزام کرتے تھے، کیونکہ دارقطنی
فی عامۃ الاقوال الا فی قلیل	ان لوگوں سے اجتہاد میں قوی اور
منہا مما یعد ویحصر فان	اور بڑے فقیہ وعالم تھے۔
الدارقطنی کان اقوی فی الاجتھاد	

منہ وکان افقہ واعلم منہ (مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم ج ۱ ص ۱۰۱)

اعتراض کا دوسرا جزیہ ہے کہ امام دارقطنی کو امام ابوحنیفہ اور ان کے مذہب سے تعصب و عناد تھا، اس کے ثبوت میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سنن میں امام صاحب پر طعن کیا ہے، مثلاً مشہور حدیث "من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ [یعنی جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کی قرأت اس کے لیے کافی ہے] کو نقل کرنے کے بعد اس کی اسناد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

لم یسندہ عن موسی بن ابی عائشۃ	اس کو موسیٰ بن ابی عائشہ کے واسطے سے
غیر ابی حنیفۃ والحسن بن عمارۃ	صرف امام ابوحنیفہ اور حسن بن عمارہ نے بیان
وھما ضعیفان (سنن دارقطنی ج ۱ ص ۱۲۳)	کیا ہے اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔

اسی باب کی ایک اور حدیث کی سند پر جو دوسرے واسطہ سے مروی ہے، تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

ولم یذکر فی ھذا الاسناد جابرا غیر ابی حنیفۃ (سنن دارقطنی ج ۱ ص ۱۲۳)	امام ابو حنیفہ کے سوا کسی نے اس کے اسناد میں جابر کا ذکر نہیں کیا۔

آگے ان لوگوں کا نام گناتے ہوئے جنھوں نے اس حدیث کو مسند کے بجائے مرسل اور حضرت جابر کا نام لیے بغیر بیان کیا ہے، اپنا یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ اس کی مرسلا ہی روایت صحیح ہے۔

روی ھذا الحدیث سفیان الثوری وشعبۃ واسرائیل بن یونس وشریک وابو خالد الدالانی وابو الاحوص وسفیان بن عیینۃ وجریر بن عبد الحمید وغیرھم عن موسی بن ابی عائشۃ عن عبد اللہ بن شداد مرسلا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو الصواب (سنن دارقطنی ج ۱ ص ۱۲۳)	اس حدیث کو سفیان ثوری، شعبہ، اسرائیل بن یونس، شریک، ابو خالد دالانی، ابو الاحوص سفیان بن عیینہ اور جریر بن عبد الحمید وغیرہ نے موسی بن ابی عائشہ سے اور انھوں نے عبد اللہ بن شداد سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کیا ہے اور یہی درست ہے۔

اس سے ملتا جلتا اعتراض باب المسح میں بھی کیا ہے، فرماتے ہیں :۔

ھکذا رواہ ابو حنیفۃ عن خالد بن علقمۃ قال فیہ ومسح رأسہ ثلثا وخالفہ جماعۃ من الحفاظ الثقات منھم زائدۃ بن قدامۃ	اسی طرح اس حدیث کو امام ابو حنیفہ نے خالد بن علقمہ کے واسطہ سے بیان کیا ہے اور اس میں انھوں نے کہا ہے کہ [مسح رأسہ ثلثا] یعنی آپ نے تین دفعہ سر کا مسح کیا ہے لیکن

وسفيان الثوري وشعبة و ابو عوانة وشريك وابوالاشهب جعفر بن الحارث وهارون بن سعد وجعفر بن محمد وحجاج بن ارطاة وابان بن تغلب وعلي بن صالح بن حي وحازم بن ابراهيم وحسن بن صالح وجعفر الاحمر فرووه عن خالد بن علقمة فقالوا فيه ومسح رأسه مرة ولا نعلم احدا منهم قال في حديثه انه مسح رأسه ثلثا غير ابي حنيفة

(سنن دارقطنی ج ۱ ص ۳۴)

متعدد ثقہ محدثین نے اس میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے، جیسے زائدہ بن قدامہ سفیان ثوری، شعبہ، ابوعوانہ، شریک، ابوالاشہب جعفر بن حارث، ہارون بن سعد جعفر بن محمد، حجاج بن ارطاۃ، ابان بن تغلب علی بن صالح بن حی، حازم بن ابراہیم، حسن بن صالح اور جعفر احمر وغیرہ۔ ان سب لوگوں نے اس کو خالد بن علقمہ کے واسطہ سے اس طرح بیان کیا ہے کہ (مسح رأسه مرة) یعنی آپ نے ایک دفعہ سر کا مسح کیا، سوائے ابوحنیفہ کے کسی شخص کے متعلق ہم کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے اپنی حدیث میں [مسح رأسه ثلثا] یعنی آپ نے سر کا تین دفعہ مسح کیا، کہا ہو۔

آگے وہ مسح کے سلسلہ میں یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے اپنی ہی بیان کردہ حدیث کے حکم کی مخالفت کی ہے۔

ومع خلاف ابي حنيفة فيما روى لسائر من روى هذا الحديث فقد خالف في حكم المسح فيما روى عن علي رضي الله عنه عن النبي

اس اختلاف کے باوجود جو امام ابوحنیفہ نے اس حدیث کے سلسلہ میں اس کے تمام راویوں سے کیا ہے، خود مسح کے حکم کے بارے میں بھی انھوں نے اپنی ہی روایت کردہ

صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان السنۃ فی الوضوء مسح الرأس مرۃ واحدۃ

(سنن دارقطنی ج ۱ ص ۹۳)

اس حدیث کی مخالفت کی ہے، جو حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ وضو میں سر کا ایک ہی دفعہ مسح کرنا مسنون ہے۔

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) امام دارقطنی کے نزدیک امام ابوحنیفہ کا پایہ حدیث میں زیادہ بلند نہیں تھا، اسی لیے انھوں نے سنن میں صراحۃً ان کو ضعیف کہا ہے، اور اپنی کتاب الضعفا میں بھی اسی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے لیکن یہ کتاب نایاب ہے، اسی لیے اس کا بیان یہاں درج نہیں کیا جا سکا۔

(۲) امام ابوحنیفہ نے ثقہ رواۃ کی مخالفت کی ہے، چنانچہ ایک حدیث کو مرسل کے بجائے مسند بیان کیا ہے، اور اس کی سند میں حضرت جابر کا ذکر کرنے میں وہ منفرد ہیں، اسی طرح ایک حدیث کے متن میں ایک دفعہ کے بجائے تین دفعہ سر کے مسح کو بیان کرنے میں بھی وہ منفرد ہیں۔

(۳) ان کا فتوی اپنی ہی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہے۔

اب نمبروار ان اعتراضات کا جائزہ لے کر ان کی حقیقت واضح کی جاتی ہے۔

(۱) امام دارقطنی نے امام ابوحنیفہ کو ضعیف ضرور کہا ہے لیکن وہ اس میں منفرد نہیں ہیں، اس زمانہ کے بعض اور محدثین بھی اس قسم کی رائے رکھتے تھے، چنانچہ جرح و تعدیل کی کتابوں میں ان کی توثیق کی طرح تضعیف کے اقوال بھی ملتے ہیں، حافظ ذہبی لکھتے ہیں

ضعفہ النسائی من جہۃ حفظہ وابن عدی وآخرون وترجم لہ الخطیب فی فصلین من تاریخہ

امام نسائی، ابن عدی اور بعض دوسرے لوگوں نے امام ابوحنیفہ کی تضعیف کی ہے، اور خطیب نے اپنی تاریخ کی دو فصلوں میں

واستوفی کلام الفریقین معدلیہ ومضعفیہ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۳۷) | دونوں فریقوں یعنی تعدیل وتضعیف کرنے والوں کے اقوال مفصل تحریر کیے ہیں،

امام بخاریؒ نے جامع صحیح میں جابجا اشارۃً وکنایۃً امام ابو حنیفہ کا استخفاف کے ساتھ اور التاریخ الصغیر میں نہایت نامناسب انداز میں ان کا ذکر کیا ہے، ائمہ صحاح میں امام نسائی نے ان کو کتاب الضعفاء والمتروکین میں شامل کیا اور یہ لکھا ہے کہ "لیس بالقوی فی الحدیث"[1] یعنی وہ حدیث میں قوی نہ تھے، عبد اللہ بن مبارک جنھوں نے ایک طرف امام صاحب کو افقہ الناس (سب سے بڑا فقیہ) احسنہم وادقہم فطنۃ (دقیق النظر اور نہایت فطین) اغوصہم فی الفقہ (فقہ میں سب سے زیادہ غواص) اور "ما رأیت فی الفقہ مثلہ" (میں نے فقہ میں ان کو عدیم المثال پایا) وغیرہ کہا ہے، دوسری طرف "یتیما فی الحدیث" بھی کہا ہے، یحییٰ بن سعید القطان جن کے متعلق یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ

یذھب فی الفتوی الی قول الکوفیین ویختار قولہ من اقوالھم ویتبع رأیہ من بین اصحابہ | وہ فتوی میں اہل کوفہ کے قول کی طرف جاتے ہیں، اور ان میں بھی امام ابو حنیفہ کے قول کو مرجح قرار دیتے ہیں اور ان کے اصحاب میں ان ہی کی پیروی کرتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف ان کے متعلق ابن معین یہ بھی کہتے ہیں کہ "جب ان کے سامنے امام ابو حنیفہ کا ذکر کیا گیا اور ان کی حدیث کے بارہ میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ "لم یکن بصاحب حدیث" (یعنی وہ صاحب حدیث نہیں تھے) خود ابن معین سے جو امام صاحب کو ثقہ، صدوق اور مامون کہتے ہیں، ان کی تضعیف کی روایتیں بھی ملتی ہیں، یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں "امام ابو حنیفہ

---

[1] ص ۲۹

صدوق مگر ضعیف الحدیث تھے، اور سفیان ثوری نے ان کو غیر ثقہ اور غیر مامون قرار دیا ہے[1]۔

لیکن یہ صرف محدثین کی ایک جماعت کا خیال ہے، جو متعدد غلط فہمیوں کی وجہ سے جنکا آگے ذکر کیا جائے گا، امام صاحب کا درجہ حدیث میں بلند نہیں سمجھتی تھی، ورنہ محدثین کی بڑی تعداد سے امام ابوحنیفہ کی توثیق منقول ہے، حافظ ابن عبد البر کا بیان ہے:

"جن لوگوں نے امام ابوحنیفہ سے روایت کی اور ان کی تعریف و توثیق کی ہے انکی تعداد ان لوگوں سے زیادہ ہے جنھوں نے ان کے بارہ میں کلام کیا ہے، علی بن مدینی کا بیان ہے کہ ابوحنیفہ سے سفیان ثوری اور ابن مبارک نے روایت کی ہے اور وہ ثقہ اور بلا عیب تھے، شعبہ ان کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے اور یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ ہمارے اصحاب امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی بڑی مدح کرتے تھے، اس پر لوگوں نے ان سے پوچھا کہ کیا امام ابوحنیفہ جھوٹ کہتے ہیں، فرمایا نہیں[2]"

اس تفصیل سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ امام دارقطنی کی طرح بعض اور نامور محدثین بھی امام ابوحنیفہ کو حدیث و روایت میں کمتر سمجھتے تھے، گو یہ رائے صحیح نہیں ہے بلکہ غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے تاہم اسکے کچھ اسباب تھے، ان میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) اس میں شبہہ نہیں کہ امام ابوحنیفہ کا پایہ علم و عمل دونوں میں نہایت بلند تھا، لیکن انکا اصلی طغرائے امتیاز فقہ و اجتہاد ہے۔ اس میں وہ بے نظیر اور عدیم المثال تھے، امام شافعی کا مشہور مقولہ ہے کہ [الناس عیال فی الفقه علی ابی حنیفة[3]]۔ حدیث میں بھی اگرچہ وہ کم مایہ نہ تھے

---

[1] یہ سب اقوال تاریخ بغداد ج ۱۳ تذکرہ امام ابوحنیفہ سے ماخوذ ہیں، اور دوسری کتابوں میں بھی ملتے ہیں، لیکن ان میں بعض کی صحت مشکوک ہے، کیونکہ ان میں سے بعض مثلاً سفیان ثوری، یحییٰ بن سعید القطان اور ابن مبارک وغیرہ نے امام صاحب سے روایت حدیث بھی کی ہے [2] حواشی سنن دارقطنی ج ۱ ص ۱۲۳ [3] الانتقاء لابن عبد البر ص ۱۳۶

لیکن فقہ واجتہاد میں ان کی غیر معمولی اہمیت وشہرت کی وجہ سے ان کو محدث کی حیثیت سے زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی، چنانچہ یزید بن ہارون سے جب دریافت کیا گیا کہ امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری میں کس کا درجہ زیادہ بلند ہے، تو انھوں نے جواب دیا کہ امام ابو حنیفہ فقہ میں باکمال تھے، اور سفیان ثوری حدیثوں کے بڑے حافظ تھے[1]، علامہ شبلی مرحوم فرماتے ہیں:

"یہ خیال اگرچہ غلط اور بالکل غلط ہے کہ امام ابو حنیفہ علم حدیث میں کم مایہ تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام طور پر وہ محدث کے لقب سے مشہور نہیں، بزرگانِ سلف میں سینکڑوں ایسے گذرے ہیں جو اجتہاد وروایت دونوں کے جامع تھے، لیکن شہرت اسی صفت کے ساتھ ہوئی جو ان کا کمال غالب تھا، امام ابو حنیفہ کی تو حدیث میں کوئی تصنیف نہیں، تعجب ہے کہ امام مالک وامام شافعی بھی اس لقب کے ساتھ مشہور نہ ہوئے، نہ ان کی تصنیفوں کو وہ قبول عام حاصل ہوا جو اصحاب ستہ کو ہوا، امام احمد بن حنبل ان لوگوں کی نسبت علم حدیث میں زیادہ نامور ہیں، ان کی مسند کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ صحیح حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ اور کوئی نہیں مل سکتا، لیکن جسقدر حدیث وروایت میں ان کا زیادہ اعتبار ہے، اسی قدر استنباط اور اجتہاد میں انکا شمار نہیں کیا۔"[2]

(۲) چونکہ امام ابو حنیفہ کی اصل عظمت وشہرت فقہ اور اسلامی قانون میں مہارت کی وجہ سے ہے، اس لیے ان کے ساتھ اسی حیثیت سے اعتنا بھی کیا گیا ہے، اور محدثین کے لقب سے مشہور ہونے والوں کے ساتھ جس قسم کا اعتنا کیا گیا، وہ ان کے ساتھ نہیں کیا گیا، اس لیے بھی لوگوں نے ان کو حدیث میں کم مایہ خیال کیا۔

(۳) امام صاحب فقیہ ومجتہد تھے، اور مجتہد وفقیہ کو ان ہی حدیثوں سے سروکار ہوتا ہے جن سے کوئی فقہی قانون یا شرعی حکم مستنبط ہوتا ہے، اس لیے محدثین کی طرح اس کے پاس احادیث

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۲ [2] سیرۃ النعمان حصہ اول ص ۱۲۲

روایات کا زیادہ ذخیرہ اور وسیع سرمایہ نہیں ہوتا، عام لوگ اس کے قلیل الروایت ہونے کی وجہ سے اس کو حدیث میں بے بضاعت خیال کرتے ہیں، حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہے، علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ مجتہد و محدث کی حیثیتیں الگ الگ ہیں، محدث مواعظ، قصص، فضائل، سیر ہر ایک قسم کی روایتوں کا استقصا کرتا ہے، بخلاف اس کے مجتہد کو زیادہ تر صرف ان احادیث سے غرض ہوتی ہے جن سے کوئی حکم شرعی مستنبط ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ محدثین کی بنسبت مجتہدین ہمیشہ قلیل الروایت ہوئے[۱]"

(۴) امام صاحب کو فقہ و قیاس اور استنباط و استخراج میں خاص کمال حاصل تھا، اس لیے وہ احادیث کے ظاہری مفہوم سے قطع نظر ان کی اصل معنویت اور حقیقی مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے درپے ہوتے تھے۔ اس کے برعکس محدثین کی نظر عموماً صرف ظواہر حدیث تک محدود و مرکوز رہتی ہے۔ اس لیے ان کو امام صاحب سے یہ سوء ظن تھا کہ وہ رائے و اجتہاد کے مقابلہ میں احادیث کی اہمیت کے زیادہ قائل نہ تھے۔ اور حدیث میں قلیل البضاعت تھے، اسی حیثیت سے امام بخاری وغیرہ اکابر محدثین نے امام ابوحنیفہ کے خلاف سخت نکیر کی ہے، اور متعدد مسائل کی نسبت یہ تصریح بھی کی ہے کہ ان میں وہ حدیث کے خلاف ہیں، مشہور محدث اور صاحب مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ نے بھی اسی حیثیت سے امام ابوحنیفہ کے رد میں ایک مستقل باب لکھا ہے،

(۵) ان کے علاوہ اور بھی متعدد ایسی چیزیں ہیں جو غلط فہمی کا باعث ہوئیں، مثلاً امام صاحب کا اہل الرائے میں شمار، محدثین کے مقابلہ میں ان سے کم روایتوں کا مروی ہونا اور صحاح وغیرہ میں ان کی حدیثوں کا نہ ہونا وغیرہ، مولانا شبلی ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام ابوحنیفہ کے وہ واقعات جو منظر عام پر نمایاں ہیں،

---

[۱] سیرۃ النعمان حصہ اول ص ۱۳۲ و ۱۳۳، [۲] ایضاً ص ۱۳۴

ان سے ایک ظاہر بین شخص ایسی ہی رائے قائم کرسکتا ہے، حدیث میں ان کی تصنیف موجود نہیں، صحاح میں بجز ایک دو روایت کے ان کا نام تک نہیں پایا جاتا، سب سے زیادہ یہ کہ ان کی شہرت اہل الرائے کے لقب سے ہے جس سے متبادر ہوتا ہے کہ حدیث سے ان کو کم تعلق تھا۔[1]"

یہ اور اس قسم کے بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے جن پر بحث کرنے کا یہ محل نہیں، محدثین کی ایک جماعت کا ذہن امام صاحب کی جانب سے صاف نہ تھا، اور نہ وہ روایت وحدیث میں ان کا درجہ زیادہ بلند ماننے کے لیے تیار تھی، امام دارقطنیؒ کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا، وہ بھی ان ہی اسباب کی وجہ سے امام صاحب سے سوئے ظن رکھتے تھے،

گو امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف الحدیث قرار دینا سراسر غلط فہمیوں پر مبنی ہے، تاہم ان اسباب و وجوہ کی بنا پر جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، محدثین کو معذور سمجھنا چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ محدثین اپنی دینی حمیت اور روایت پسندی کی وجہ سے حدیث کے باب میں ادنیٰ سامحت بھی برداشت نہیں کرتے تھے، اسی لیے امام ابوحنیفہؒ اور اس پایہ کے دوسرے بزرگوں کے متعلق ان کے لب ولہجہ میں تلخی اور شدت پیدا ہوگئی ہے جو عام حالات میں یقیناً معیوب اور خود ان محدثین کے مرتبہ سے فروتر ہے، لیکن اس کا تعلق براہ راست دین کے اصل ماخذ یعنی فرمان رسول سے ہے، اس لیے خواہ اس میں کسی غلط فہمی ہی کا دخل کیوں نہ ہو اس کو گوارا اور محدثین کو معذور سمجھا جاسکتا ہے، بلکہ اس حیثیت سے محدثین کے یہ بے لاگ تبصرے قابل ستایش ہیں کہ بڑے سے بڑے امام کا علم وفضل اور زہد وتقویٰ بھی ان کی جرأت، حق پسندی اور صاف گوئی کے لیے مانع نہ بن سکا، اور انھوں نے اکابر کے معمولی تساہل وتہاون کے متعلق اپنی اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، دیانت اور ایمان داری کے ساتھ بیان کردی،

---

[1] سیرۃ النعمان ص ۴۴

اس لیے محدثین اور امام دارقطنی کے بارہ میں یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے کہ ان کو امام ابوحنیفہؒ سے کد یا عناد تھا، ان کو امام صاحب سے جو سوئے ظن ہے، وہ اگرچہ غلط فہمی پر مبنی ہے لیکن ان کی نیک نیتی شک و شبہہ سے بالاتر ہے، اگر امام دارقطنیؒ کو حنفی مذہب سے واقعی اس قسم کا عناد ہوتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے تو وہ اس کے ایک اہم رکن امام محمدؒ کے متعلق یہ نہ فرماتے کہ [من الثقات الحفاظ] یعنی وہ ثقہ محدثین میں تھے۔[1]

۲۔ امام دارقطنیؒ کے دوسرے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث [من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قراۃ] کو موسیٰ بن ابی عائشہ کے واسطہ سے امام ابوحنیفہؒ اور حسن بن عمارہ کے علاوہ کسی نے بھی سنداً نہیں بیان کیا ہے، اسی طرح اس کے دوسرے سلسلۂ اسناد میں ان کے سوا کسی اور نے حضرت جابرؓ کا نام نہیں لیا ہے، بلکہ تمام ثقہ محدثین نے امام ابوحنیفہؒ کے برخلاف اس کو مرسلاً بیان کیا ہے، لیکن اس خیال میں بھی امام دارقطنیؒ منفرد نہیں ہیں، اکثر محدثین کی یہی رائے ہے کہ یہ حدیث مرسلاً صحیح ہے اور اس کی موصولاً روایت کو وہ شذوذ کی بنا پر ناقابل تسلیم سمجھتے ہیں، امام بیہقیؒ فرماتے ہیں

ھکذا رواہ جماعۃ عن ابی حنیفۃ	ایسے ہی اس کو ایک جماعت نے امام ابوحنیفہ
موصولا ورواہ عبد اللہ بن	سے موصولاً روایت کیا ہے لیکن عبد اللہ بن
المبارک عنہ مرسلا دون ذکر	مبارک نے ان سے اس کو مرسلاً اور حضرت جابرؓ کا
جابر وھو المحفوظ[2]	ذکر کیے بغیر بیان کیا ہے اور مرسل روایت ہی محفوظ ہے

آگے وہ عبد اللہ بن مبارکؒ کی روایت سے حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"ابن مبارک ہی کی طرح سفیان بن سعید ثوری، شعبہ بن حجاج، سفیان بن عیینہ، اسرائیل بن یونس، ابوعوانہ، ابوالاحوص اور جریر بن عبد الحمید وغیرہ ثقہ و ثابت لوگوں نے مرسلاً (غیر موصولاً)

---

[1] امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۹۲ بحوالہ غرائب مالک للدارقطنی [2] سنن بیہقی ص ۱۵۹

روایت کیا ہے لیکن حسن بن عمارہ نے موسیٰ کے واسطے سے اسے موصولاً بیان کیا ہے، اور وہ متروک ہیں۔[1]

سنن ابی داؤد کے مشہور شارح اور عظیم محدث امام خطابی کا بیان ہے

وقال سفیان الثوری واصحاب الرأی لایقرأ احد خلف الامام جهر الامام او سر واحتجوا بحدیث رواه عبداللہ بن شداد مرسلا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم "من کان لہ امام" الخ[2]

سفیان ثوری اور اصحاب الرای کا قول ہے کہ کوئی شخص امام کے پیچھے قرأت نہ کرے خواہ امام زور سے قرأت کرتا ہو یا آہستہ سے، ان لوگوں کی دلیل یہ حدیث ہے جس کو عبداللہ بن شداد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً بیان کیا ہے "من کان لہ امام" الخ

مشہور امام فن حافظ ابن حجر کے نزدیک تو یہ روایت ضعیف ہے:-

واستدل من اسقطها عن المأموم مطلقا کالحنفیة بحدیث من صلی خلف امام فقرأة الامام لہ قرأة لکنہ حدیث ضعیف عند الحفاظ وقد استوعب طرقہ وعللہ الدارقطنی[3]

جو لوگ مطلقاً مقتدی کے لیے قرأت کو ساقط قرار دیتے ہیں جیسے حنفیہ، انکی دلیل یہ حدیث [من صلی خلف امام فقرأة الامام الخ] ہے لیکن یہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، امام دارقطنی وغیرہ نے اسکے طرق وعلل کا مکمل ذکر کیا ہے۔

ان تفصیلات سے ظاہر ہوگیا کہ امام دارقطنی کی طرح دوسرے محدثین کے نزدیک بھی یہ روایت مرسلاً ہی صحیح ہے لیکن حنفیہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس حدیث کو امام صاحب کے علاوہ بھی بعض لوگوں نے موصولاً اور مسنداً بیان کیا ہے، چنانچہ احمد بن منیع نے اپنی مسند میں اس کو اس طرح بیان کیا ہے:-

اخبرنا اسحٰق الازرق حدثنا سفیان وشریک عن موسی بن

ہم کو اسحٰق ازرق نے بتایا کہ ان سے سفیان وشریک نے اور ان لوگوں سے موسیٰ بن

---

[1] سنن بیہقی ص ۱۹۰ [2] معالم السنن ج ۱ ص ۲۰۰ [3] فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۱

ابی عائشة عن عبد اللہ بن شداد	ابی عائشہ اور ان سے عبد اللہ بن شداد نے
عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اور ان سے جابر نے بیان کیا کہ رسول اللہ
من کان لہ امام فقرأة الامام	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام کی قرأت
لہ قرأة[1]	سے مقتدی کی قرأت بھی ہو جاتی ہے۔

سفیان و شریک نے جو صحیحین کے رجال میں ہیں حضرت جابرؓ کا نام لینے اور اس حدیث کو مسند بیان کرنے میں امام ابوحنیفہ کی متابعت کی ہے، امام محمد نے بھی موطا اور کتاب الآثار میں اس کو مسنداً بیان کیا ہے، ابن ہمام کا بیان ہے کہ امام محمد اور محمد بن منیع کی روایتوں کی سندیں صحیحین کے شرائط کے مطابق صحیح ہیں[2]۔

یہ امام ابوحنیفہ کی ثقہ رواۃ کی مخالفت و عدم متابعت کے الزام کا جواب تھا لیکن اگر الواقع امام صاحب نے ثقہ راویوں کی مخالفت کی ہوتی تب بھی ان کی روایت کے وثوق و اعتبار میں کوئی فرق نہ آتا، کیونکہ حنفیہ کے نزدیک امام صاحب کا ثقہ ہونا مسلّم ہے، اور جرح و تعدیل کے ائمہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ثقہ کا اضافہ معتبر اور لائق قبول ہوتا ہے۔

حضرت جابرؓ کے علاوہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، ابوسعید خدری، ابوہریرہ، انس بن مالک اور ابن عباس (رضی اللہ عنہم) وغیرہ نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے لیکن ان کی سندوں میں کلام کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن حجر نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، حالانکہ کثرت و تعدد طرق کی وجہ سے ضعف ختم ہو گیا، اور حضرت جابرؓ کے صحیح طرق نے بھی ان کو قوی بنا دیا[3]،

حنفیہ کی دلیل یہ بھی ہے کہ اگر اس روایت کا مسند و موصول ہونا نہ بھی ثابت ہو تو بھی اس کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ اس کا ارسال تمام محدثین کے نزدیک صحیح و ثابت ہے اور

---

[1] حاشیہ نصب الرایہ ج ۲ ص ۵، [2] فیض الباری ج ۲ ص ۲۷۷، ۲۷۸ و حاشیہ معانی الآثار طحاوی ج ۱ ص ۱۲۸
[3] نصب الرایہ ج ۲ ص ،

مراسیل حنفیہ کے نزدیک علی الاطلاق حجت ہیں، اس لیے یہ مرسل بھی جس کو متعدد ثقہ و ثابت راویوں نے بیان کیا ہے حجت ہوگی، دوسرے یہ حدیث موقوفاً بھی مروی ہے، اور حنفیہ کے نزدیک موقوف بھی حجت ہے، کیونکہ تمام صحابہ عدول ہیں[۱]، پھر بعض اجلہ صحابہ مثلاً حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ وغیرہ کا مسلک بھی اس کے مطابق ہے۔

مگر امام دارقطنیؒ کے نزدیک جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے امام صاحبؒ ضعیف الحدیث تھے، اس لیے انھوں نے ان کے اضافہ کو قبول نہیں کیا، یہ ان کی اپنی رائے تھی، اس کی اس زمانہ میں تو گنجائش رہی ہوگی، کیونکہ اس وقت کے بعض ائمہ جرح و تعدیل بھی امام دارقطنیؒ کے ہمنوا تھے، لیکن اب تو امام صاحب کی ثقاہت مسلم طور پر ثابت ہو چکی ہے، اور اس عہد میں بھی حافظ ابن عبدالبر کے بیان کے مطابق امام صاحب کی توثیق کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی، تو ان کی روایت کے معتبر و حجت ہونے میں کلام کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

امام دارقطنیؒ نے مسح کے تکرار و تثلیث کی حدیث کے سلسلہ میں بھی امام ابو حنیفہؒ پر ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام عائد کیا ہے، جو اس حیثیت سے بے معنی معلوم ہوتا ہے کہ خود انھوں نے اور بعض دوسرے محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں تثلیث مسح کی روایت کی ہے، اس طرح جب امام ابو حنیفہؒ کی بیان کردہ حدیث کے شواہد و متابعات موجود ہیں، تو اس کی صحت میں کلام کی کیا گنجائش؟ اور اگر یہ شواہد و متابعات نہ بھی ہوتے تو جیسا کہ ابھی گذرا ہے، ثقہ راوی کی زیادتی اور اضافہ مقبول اور حجت ہے۔

۳- اس سلسلہ میں امام دارقطنیؒ نے امام ابو حنیفہؒ پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ تین بار مسح کرنے کا بیان کرنے کے باوجود وہ خود ایک ہی بار مسح کرنے کو مسنون سمجھتے ہیں، علامہ عینی اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:-

---

[۱] بذل المجہود ج ۱ ص ۷۸ ،

"دارقطنی کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ تکرار مسح امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی مسنون ہے، بشرطیکہ وہ ایک ہی دفعہ کے پانی سے کیا جائے اور اعادہ کے لیے نیا پانی نہ لیا جائے، چنانچہ ان سے حسن نے مجرد میں روایت کی ہے کہ اگر وہ ایک ہی دفعہ کے پانی سے ہو تو مسنون ہے[۱]۔"

لیکن یہاں کسی قدر تفصیل و وضاحت کی ضرورت ہے، حنفیہ کا عام اور مشہور مفتی بہ قول وہی ہے جو امام دارقطنیؒ نے بیان کیا ہے، فقہ حنفی کی تمام اہم اور معتبر کتابوں میں ایک ہی بار مسح کو مسنون لکھا گیا ہے، بلکہ بعض کتابوں میں تثلیث کو مکروہ[۲] اور بدعت تک بتایا گیا ہے، کبیری میں ہے کہ "تثلیث بدعت ہے، مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں کوئی مضایقہ نہیں، اور صحیح یہ ہے کہ وہ مکروہ ہے[۳]۔" لیکن فتاوی قاضیخاں میں ہے کہ "گو ہمارے نزدیک مسح میں تکرار مکروہ نہیں تاہم وہ نہ سنت ہے اور نہ مقتضائے ادب[۴]۔"

خود عینی نے شرح کنز میں تکرار و تثلیث کا سرے سے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ یہ لکھا ہے کہ

والعاشرة مسح کل رأسه مرة	وضو کی دسویں سنت سارے سر کا ایک دفعہ
واحدة وعند الشافعی ثلاثا	مسح کرنا ہے، اور امام شافعی کے نزدیک تین دفعہ
وعند مالک مسح کل رأس فرض[۵]	مسح کرنا مسنون ہے، اور امام مالک کے یہاں سارے سر کا

تاہم بعض کتابوں میں امام صاحب کی جانب تثلیث کا قول بھی منسوب کیا گیا ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

وقال الشافعی السنة هو التثليث	امام شافعیؒ نے اعضائے مغسولہ کا اعتبار کرتے ہوئے
بمياه مختلفة اعتبارا بالمغسول	تین مختلف پانی سے تین دفعہ مسح کرنے کو مسنون قرار دیا ہے

---

[۱] البنایہ فی شرح الہدایہ ج ۱ ص ۱۱۰ مطبوعہ نولکشور [۲] بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۲ مطبوعہ مصر ۱۳۲۷ھ [۳] کبیری ص ۲۷ [۴] فتاوی قاضی خاں ج ۱ ص ۲۵ مطبع العلوم ۱۲۷۱ھ [۵] رمز الحقائق شرح کنز الدقائق ج ۱ ص ۱۷ مطبوعہ نولکشور

ولنا ان انسا توضأ ثلاثا ثلاثا ومسح	ہماری (احناف کی) دلیل یہ ہے کہ حضرت انسؓ نے
برأسه مرة واحدة وقال هذا وضوء	اعضا کو تین تین بار دھویا اور سر کا ایک ہی
رسول الله صلى الله عليه وسلم والذي يروى	بار مسح کیا اور انھوں نے بتایا کہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
من التثليث محمول عليه بماء واحد	کا وضو ہے، اور تثلیث کے بارہ میں جو روایت
وهو مشروع على ما روى عن ابي حنيفة	کیجاتی ہے اس کو اس پر محمول کیا جائیگا کہ وہ
ولان المفروض هو المسح وبالتكرار	ایک دفعہ کے پانی سے ہوگی، اور یہی مشروع
يصير غسلا فلا يكون مسنونا	ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کیگئی ہے
فصار كمسح الخف بخلاف الغسل	اور چونکہ فرض مسح کرنا ہے جو تکرار کی وجہ سے
	غسل کے درجہ میں ہو جائیگا، اس لیے یہ مسنون

لیکن حنفیہ اس قول اور روایت کو مرجوح سمجھتے ہیں، مثلاً شرح النقایہ[ب] فرماتے ہیں :

والجواب برجحان رواية الافراد	ایک دفعہ سر کا مسح والی روایت کو تین دفعہ
على التثليث او حمله على تحقيق الاستيعا[ب]	مسح والی روایت پر ترجیح حاصل ہے، یا تین دفعہ
او حمل تعدد المياه على قلة البلة	مسح والی حدیث کو استیعاب پر محمول کیا
او نفادها لا لتكون سنة مستمرة	جائیگا اور کئی دفعہ پانی سے مسح کرنے کو اس پر
وقال البيهقي وقد روى من اوجه	محمول کیا جائیگا کہ ایک دفعہ کا پانی خشک
عن عثمان تكرار المسح الا انه مع	یا ختم ہوگیا تھا اسکو مستقل سنت قرار دینا صحیح
خلاف الحفاظ ليس بحجة	نہیں ہے، امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ
عند اهل العلم	سے تکرار مسح کئی وجوہ سے مروی ہے لیکن یہ
	حدیث تمام محدثین کی حدیثوں سے مختلف

۱- سنن دارقطنی ص ۳۱ ... ۲- ... ۳- ...

... ۱ ص ...

علامہ عینی خود ہی شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں :-

والصحیح عن ابی حنیفة ترک التثلیث[1] امام ابوحنیفہ سے صحیح طور پر یہ ثابت ہے کہ وہ تین دفعہ مسح کرنے کے قائل نہیں تھے ،

(عینی شرح ہدایہ جزا ج ا ص ۱۱)

علامہ زیلعی مسح میں تکرار و عدم تکرار دونوں قسم کی روایتوں کی تخریج کرتے ہوئے اکثر حنفیہ کے اصل مسلک کی تائید و ترجمانی بھی کرتے گئے ہیں ، مثلاً حضرت علیؓ کی حدیث [ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتوضاء ثلاثا ثلاثا الا المسح فانه مرة مرة] کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

وهذا اصرح فی المقصود لاصحابنا فانه بلفظ "کان" المقتضیة للدوام الا ان فیه ضعفا (نصب الرایہ زیلعی ج ۱ ص ۳) ہمارے اصحاب کے مقصد کے لحاظ سے یہ حدیث زیادہ صریح ہے کیونکہ اس میں "کان" کا لفظ آیا ہے جو دوام کا مقتضی ہے لیکن اس میں ضعف ہے۔

آگے حضرت عثمانؓ کی حدیث کو جس میں توضا ثلاثا کے الفاظ آئے ہیں نقل کرنے کے بعد اس پر مفصل بحث اس طرح کرتے ہیں :-

" امام بیہقی فرماتے ہیں کہ تکرار مسح کے متعلق امام شافعی نے اسی حدیث پر اعتماد کیا ہے حالانکہ یہ روایت مطلق ہے اور حضرت عثمانؓ کی غیر مطلق روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تکرار کا تعلق سر کے بجائے دوسرے اعضاء سے تھا ، اور سر کے بارہ میں تو یہ ہے کہ اس کا صرف ایک ہی دفعہ مسح کیا ، حضرت عثمانؓ سے بعض غریب وجوہ و طرق سے ایسی روایتیں بھی کی گئی ہیں جن میں مسح کے تکرار کا ذکر ہے ، لیکن وہ ثقہ محدثین کی روایتوں کے خلاف اور اہل فن کے نزدیک حجت نہیں ہیں ، گو ہمارے بعض اصحاب (شوافع) ان سے استدلال کرتے ہیں ،

امام ترمذی نے سفیان کی حدیث نقل کی ہے ، اس کو انھوں نے ابوحیہ کے واسطہ سے اور انھوں نے حضرت علیؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ [توضا ثلاثا ثلاثا] یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے تین تین بار وضو رکیا، ترمذی نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے، ہمارے اصحاب (حنفیہ) کہتے ہیں کہ ان حدیثوں میں مسح کی تثلیث کی کوئی دلیل ہی نہیں ہے، کیونکہ آپ کے ارشاد "توضار" کا حاصل و مقصود "وضارت" ہے، جو غسل سے عبارت ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ خود امام ترمذی نے حضرت علیؓ کی یہی حدیث ابوالاحوص کے واسطے سے اور انھوں نے ابواسحٰق کے واسطے سے اور انھوں نے ابوحیہ سے اور انھوں نے حضرت علیؓ سے اس طرح بیان کیا ہے،

عن علیؓ انہ توضاء فغسل کفیہ	حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے وضو رکیا تو
ثم تمضمض ثلاثا واستنشق ثلاثا	اپنی ہتھیلیاں دھوئیں، پھر تین دفعہ کلی اور تین دفعہ
وغسل وجہہ ثلاثا وذراعیہ ثلاثا	ناک میں پانی ڈالا اور تین تین دفعہ چہرہ اور کلائیاں
ومسح برأسہ مرۃ ثم غسل قدمیہ	دھوئیں اور ایک دفعہ سر کا مسح کیا، پھر دونوں
ثم قال احببت ان اریکم کیف	پاؤں دھوئے اور کہا کہ میں نے تم لوگوں کو رسول اللہ
کان طہور النبی صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا طریقہ دکھانا چاہا۔

پہلے راوی (سفیان) کے یہاں جو ابہام تھا دوسرے راوی (ابوالاحوص) نے اسکی تفسیر کر دی پس اس سے یہ ثابت ہوا کہ وضو میں تثلیث کا تعلق صرف دھونے والے اعضاء سے ہے نہ کہ مسح کیے جانے والے سے، اسکی تائید حضرت عثمانؓ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو صحیحین میں ہے کہ

انہ توضاء فغسل وجہہ ثلاثا	آپ نے وضو کیا تو تین تین دفعہ چہرہ اور دونوں
ویدیہ ثلاثا ثم قال ومسح رأسہ	ہاتھ دھوئے، پھر انھوں نے کہا کہ اور اپنے
فلم یذکر عددا ثم قال وغسل	سر کا مسح کیا (اسکی) تعداد نہیں بیان کی، پھر کہا
رجلیہ ثلاثا	کہ دونوں پیر تین بار دھوئے۔

لیکن فریق مخالف نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ وضو رکا لفظ مطلق ہونے کی صورت میں غسل

اور غسل دونوں کو شامل ہوتا ہے۔[۱]

ظاہر ہے کہ اگر امام ابو حنیفہؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک تین دفعہ سر کا مسح کرنا مسنون ہوتا تو زیلعی اس شد و مد کے ساتھ اس کی تردید اور ایک دفعہ مسح کرنے کی تائید نہ کرتے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ عینی نے ہدایہ کے جس متن کی بنیاد پر امام دارقطنیؒ کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اس کی ان تمام تصریحات کے سامنے کوئی حقیقت نہیں، صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں :۔

قولہ [والذی یروی من التثلیث] الخ بالتمریض یشعر بضعفہ[۲]	صاحب ہدایہ کے قول [والذی یروی] الخ کا صیغہ تمریض سے ہونا خود اسکے ضعف کا پتہ دیتا ہے۔

اس تجزیہ و تنقیح سے پوری طرح ظاہر ہوگیا کہ حنفیہ کے نزدیک ایک ہی دفعہ سر کا مسح کرنا مسنون ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کا بھی صحیح و ثابت قول یہی ہے، اس لیے اس بارہ میں امام دارقطنیؒ کا اعتراض صحیح ہے، رہی امام حسن کی روایت تو مذکورۂ بالا تصریحات کے مقابلہ میں اس کی کوئی خاص حقیقت نہیں ہے، اور اگر اس کی کوئی حقیقت بھی ہو تو بھی اس کے ضعف، مرجوحیت اور عدم شہرت اور دوسرے قول کی قوت و شہرت کی وجہ سے امام دارقطنیؒ نے جس حیثیت سے اعتراض کیا ہے وہ صحیح ہے لیکن کسی حدیث کی روایت کرنے سے یہ لازم اور ضروری نہیں ہو جاتا کہ راوی کا اس کے مطابق فتوی اور عمل بھی ہو، جبکہ اس کے مقابلہ میں متعدد صحیح و ثابت روایتیں بھی موجود ہیں، دوسرے ائمہ اور خود امام دارقطنیؒ نے کتنی ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جنکے مطابق ان کا عمل نہیں ہے۔ واللہ اعلم ۔

---

[۱] نصب الرایہ ج۱ص ۳۳ و ۳۴ [۲] فتح القدیر ص ۱۴

(ادارہ دارالمصنفین)

تذکرۃ المحدثین جلد اول (از مولوی ضیاء الدین اصلاحی) قیمت ۔۔۔

شریف رضی اور انکے علمی کارنامے

از جناب مولانا مقتدیٰ حسن صاحب اعظمی فاضل جامعہ ازہر مصر

(۲)

شریف رضی کا زمانہ: شریف رضی ۳۵۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۰۶ھ میں وفات پائی، اس حساب سے انھوں نے تین عباسی خلفاء مطیع، طائع اور قادر کا زمانہ پایا، یہ وہ زمانہ تھا جب عباسی خلفاء کے ہاتھوں سے اقتدار نکل چکا تھا، وہ صرف نام کے خلیفہ رہ گئے تھے، حکومت کا سارا اقتدار بنی بویہ کے ہاتھوں میں آگیا تھا، وہی اس کے سیاہ وسپید کے مالک تھے، اس کا سبب خود خلفاء کی کمزوری تھی، چنانچہ آل بویہ سے پہلے ہی ان پر امراء و وزراء حاوی ہو چکے تھے، چوتھی صدی میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ وزیر ابن فرات نے ۱۳ سالہ مقتدر کو مکتب سے اٹھا کر تخت خلافت پر بٹھا دیا،

یہ وہ زمانہ تھا جب بنی بویہ کی قوت بڑھ رہی تھی، وہ شیعہ تھے، اس لیے انھوں نے عباسی خلفاء کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور معز الدولہ دیلمی نے ان کو ختم کر کے علوی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا مگر لوگوں نے اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کر کے روک دیا، اس لیے اس نے عباسی خلافت کو تو ختم نہیں کیا، لیکن اس کو اپنے اثر و اقتدار میں لے لیا، شریف رضی

نے دیلمی حکمرانوں میں عزالدولہ بختیار، عضدالدولہ، صمصام الدولہ، شرف الدولہ، اور بہاءالدولہ کا زمانہ پایا، اسی کے زمانہ ۴۰۶ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

دیلمی فرمانرواؤں کی کئی شاخیں ہوگئی تھیں، کچھ دنوں تک وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرتے رہے، لیکن پھر ان میں اختلاف شروع ہوگیا، اور وہ ایک دوسرے کی حکومت پر قبضہ کی فکر میں لگ گئے، ان میں سب سے طاقتور عضدالدولہ تھا۔ اس نے عراق کے فرمانروا عزالدولہ بختیار کی حکومت پر قبضہ کرکے اس کے سارے امراء و وزراء کو قتل کردیا، اور خود خلافت بغداد کا متولی بن گیا، اسی طرح صمصام الدولہ اور شرف الدولہ میں اختلافات پیدا ہوگئے، ۳۷۹ھ میں جب عراق پر بہاءالدولہ کا اقتدار ہوا تو اسی کے خاندان کے افراد نے بغاوت کی کوشش کی لیکن بہاءالدولہ نے حالات پر قابو پالیا،

عراق پر بہاءالدولہ کی حکومت تقریباً چوبیس سال رہی، شریف رضی اس پوری مدت میں اس سے وابستہ رہے، اس کی تعریف میں قصیدے لکھے، ۴۰۳ھ میں جب بہاءالدولہ نے وفات پائی تو اس کا پرسوز مرثیہ لکھا، اس کے چند اشعار یہ ہیں:

رزیئة لم تدع شمسا ولا قمرا ولا غماما ولا نجما ولا فلکا

اس مصیبت سے آفتاب و ماہتاب، بدلی، تارے اور آسمان ہر ایک متاثر ہے۔

لوکان یقبل من مفقودها عوض لانفق المجد فیها کل ما ملکا

اس سے جدا ہونے والے کے عوض میں اگر کوئی چیز قبول کی جاتی تو مجد و شرافت اپنا سب کچھ فدا کرکے مرحوم کو بچا لیتی،

لا تبصر الدهر بعد الیوم مبتسما ان اللیالی الست بعده الضحکا

زمانہ کے ہونٹوں پر آج سے تو ہنسی نہیں دیکھے گا، مرنے والے کے بعد لوگ ہنسی فراموش کرچکے ہیں۔

عراق کی سیاسی صورت حال کے اس مختصر تذکرہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شریف رضی

ے زمانہ میں عباسی خلافت بالکل کمزور ہو چکی تھی، بنی بویہ نے ہر طرح کا اقتدار خلفاء سے چھین کر نھیں بالکل بے بس کر دیا تھا، اور خود ان میں بھی اختلاف اور حرص وطمع سے خانہ جنگی کی شکل پیدا ہو گئی تھی،

اس سیاسی مد وجزر، فتنوں، سازش اور شیعہ سنی اختلافات نے عراق کی سیاسی وسماجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، ان ہی حالات سے رومیوں کو انطاکیہ پر حملہ کی جرأت پیدا ہوئی اور انھوں نے خلافتِ عباسیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر یہاں کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے،

ان واقعات اور حوادث سے شریف رضی بھی متاثر ہوئے، اور ان کی زبان سے ایسے اشعار کہلوائے جن میں زمانہ کی نامساعدت کا شکوہ ہے، مگر ان حالات میں بھی شریف رضی نے درس ومطالعہ کا سلسلہ برابر جاری رکھا، اور اپنے ادبی جواہر پاروں سے عربی ادب میں قابل قدر اضافہ کرتے رہے

شریف کے دور کی ادبی زندگی

چوتھی صدی ہجری کے آخری پچاس سال جو شریف رضی کا زمانہ ہے، ادبی حیثیت سے ممتاز ہے، اس زمانہ میں عباسی حکومت چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ چکی تھی، جو ملک وملت کے لیے مضر تھی، لیکن ادبی سرگرمیوں پر اس کا بڑا خوشگوار اثر پڑا، ان میں ہر ریاست اور اس کے امراء واعیان علم وادب کی حوصلہ افزائی میں بیش از بیش حصہ لے کر اپنا نام روشن کرنا چاہتے تھے، اس لیے خلفاء کے علاوہ امراء وسلاطین اور وزراء وحکام میں سے ہر ایک کا دربار ادباء وشعراء کا مرکز بن گیا تھا، چنانچہ خاندانِ بنی بویہ نے بھی اس صدی میں ادب کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور حکومت کے کلیدی عہدوں پر صرف شعراء وادباء کا تقرر کیا، اس سلسلہ میں ابن العمید اور الصاحب بن عباد کے نام زیادہ مشہور ہیں، عضد الدولہ

متوفی ۳۷۲ھ نے جو بویہی خاندان کا نامور فرمانروا تھا، علماء و ادباء کی بہت زیادہ قدردانی کی، اسی کے ایما سے ابواسحاق الصابی نے آل بویہ کی تاریخ میں "التاجی" اور مشہور نحوی ابوعلی الفارسی نے علم نحو میں "الایضاح" اور "التکملہ" نامی کتابیں لکھیں، اس دور کے نامور شعراء میں متنبی اور سلامی وغیرہ نے عضد الدولہ کی فیاضیوں سے بڑا فائدہ اٹھایا، ثعالبی کے بیان کے مطابق عضد الدولہ خود بھی کامیاب اور خوشگو شاعر تھا۔

اس دور کے ادبی رسائل، فن انشاء پردازی اور فصاحت و بلاغت کی زندہ مثال ہیں، اس زمانہ کے مشہور مراسلہ نویس اور انشاء پرداز الصابی نے جب وفات پائی تو شریف رضی نے اس کے کمال کی بنا پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا، حالانکہ وہ غیر مسلم تھا، رضی کے مرثیہ کا ایک شعر ہے:

من للبلاغة والفصاحة ان همی		ذاك الغمام وعبّ ذاك الوادی ؟

مراسلہ نویسی کے فن کو شریف رضی نے بھی بہت کچھ دیا، علی خاں المدنی متوفی ۱۱۱۸ھ نے اپنی کتاب "الدرجات الرفیعہ" میں رضی کے مراسلات کا نمونہ دیا ہے، ابن ندیم نے بھی "الفہرست" میں "مراسلات الشریف الرضی" کے نام سے ابواسحاق الصابی کی جمع کردہ ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن ابھی تک یہ کتاب پردۂ خفا میں ہے۔

اس دور کے دوسرے مشہور مراسلہ نویس ادیبوں میں بدیع الزماں ہمدانی متوفی ۳۹۸ھ، ابوالفتح البستی متوفی ۴۰۰ھ اور ابوالفضل المیکالی متوفی ۴۳۶ھ کے نام نمایاں ہیں، ابوہلال عسکری متوفی ۳۹۵ھ کی کتاب "الصناعتین" اور آمدی متوفی ۳۷۱ھ کی کتاب "الموازنہ بین ابی تمام والبحتری" بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔

علمائے نحو و لغت میں اس دور کے مشاہیر کے نام یہ ہیں:- ابن خالویہ متوفی ۳۷۰ھ، ابن جنی متوفی ۳۹۲ھ، ابوعلی الفارسی متوفی ۳۷۷ھ، ابوسعید سیرافی متوفی ۳۶۸ھ

الرمانی متوفی سنہ ۳۸۴ھ، الازہری متوفی سنہ ۳۷۰ھ اور ابو نصر اسماعیل بن حماد صاحب "الصحاح" وغیرہ۔

شریف رضی کے دور کی ادبی حالت کا یہ مختصر جائزہ ہے، شریف رضی ادیب انشا پرداز کے مقابلہ میں شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، اس لیے ہم اس دور کی شاعری کا علحدہ جائزہ لیتے ہیں۔

شعراء اور شاعری چوتھی صدی ہجری کے نصف اول میں جن شعراء کا نام لیا جاتا ہے، وہ یہ ہیں: ابن بسام متوفی سنہ ۳۰۲ھ، الخبزارزی متوفی سنہ ۳۱۷ھ، ابن العلاف متوفی سنہ ۳۱۸ھ، المتنبی متوفی سنہ ۳۵۴ھ، ابو فراس الحمدانی متوفی سنہ ۳۵۷ھ، ابو الفتح کشاجم متوفی سنہ ۳۶۰ھ، ابن ہانی الاندلسی متوفی سنہ ۳۶۲ھ،

مشہور شعراء کی اس جماعت میں متنبی اور ابن ہانی نے اپنے پیشرو ابو تمام اور بحتری کی طرح اتنا نام پیدا کیا اور ایسی ناموری حاصل کی کہ آج تک اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اس صدی کے نصف آخر کے شعراء کے نام یہ ہیں، ابو الفرج محمد بن احمد متوفی سنہ ۳۹۰ھ، ابو الحسن السلامی متوفی سنہ ۳۹۳ھ، ابو الفرج الببغاء متوفی سنہ ۳۹۸ھ، ابو العباس النامی متوفی سنہ ۳۹۹ھ، ابن نباتہ السعدی متوفی سنہ ۴۰۵ھ، مہیار الدیلمی متوفی سنہ ۴۲۸ھ

یہ ہیں وہ شعراء جن سے شریف رضی کی ملاقات اور معاصرت رہی،

اپنے دور کے شعراء میں شریف رضی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ کبھی ان کے قلم سے کوئی نامناسب کلمہ نہیں نکلا، مشہور مستشرق آدم متز کا بیان ہے کہ "اس باوقار شاعر کی زبان سے کبھی کوئی بازاری لفظ نہیں نکلا اور نہ دوسرے معاصر شعراء کی طرح اس نے ہجو میں مبالغہ آمیزی کی،

یہ حقیقت ہے کہ اس دور کے شعراء میں اس حیثیت سے شریف رضی کا مقام سب سے بلند ہے' ان کی شاعری میں عربوں کی خود داری اور مجد و شرافت کے جوہر نمایاں ہیں، اسی کے ساتھ فنی

اعتبار سے کلام انتہائی مرصع اور سحر آفریں ہے۔

شریف رضی کے اشعار میں حکم و امثال بھی بکثرت ہیں، لیکن ان کے اشعار کو متنبی کے اشعار جیسی شہرت اس لیے حاصل نہ ہوسکی کہ رضی کے اشعار متنبی کے مقابلہ میں مشکل اور غور و فکر کے زیادہ محتاج ہیں۔

شیعہ سنی نزاع اور شریف رضی۔ شریف رضی کا زمانہ شیعہ سنی اختلاف کے شباب کا دور تھا، یہ فتنہ کسی خاص شہر یا علاقہ میں محدود نہ تھا، بلکہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا تھا کہ پورا عراق اور ایران کے بہت سے شہر اس کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ اگر ایک طرف شہر "قم" میں غالی شیعہ بستے تھے تو دوسری طرف "اصفہان" میں سنیوں کا دور دورہ تھا، ہنگاموں کا دروازہ کھولنے کے لیے صرف یہ سن لینا کافی تھا کہ کسی شیعہ نے صحابہ پر تبرا کیا ہے۔ یا کسی سنی نے حضرت معاویہؓ کی تعریف کی ہے۔ اتنا سنتے ہی دونوں فریق آپے سے باہر ہوجاتے تھے، اور کشت وخون کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا،

اس شورش میں بہت سے افراد، جماعتیں اور شہر بربادی کا شکار ہوگئے۔ معزالدولہ بن بویہ نے خلیفہ المستکفی کو انتہائی رسوائی کے ساتھ صرف اس لیے تخت سے اتار دیا تھا کہ اسے یہ پتہ چلا کہ المستکفی نے ایک شیعی سربراہ کو گرفتار کرلیا ہے، دونوں فرقوں کی کشیدگی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ۳۴۹ھ میں بغداد میں سنیوں کی مساجد میں جمعہ کی نماز نہیں پڑھی جاسکی۔

"المنتظم"، "الکامل" اور "تجارب الامم" وغیرہ کتب تاریخ میں اس صدی کے واقعات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی اخوت کس طرح مذہبی اختلافات سے پاش پاش ہوچکی تھی۔

ابن الجوزی نے اپنی کتاب "المنتظم" میں ۳۹۸ھ کے واقعات کے ضمن میں کرخ کے اس

فتنہ کا ذکر کیا ہے جس میں سنی عالم ابو حامد الاسفرائنی کو اپنا گھر چھوڑ کر دوسری جگہ پناہ لینی پڑی تھی، اور خلیفہ ان کی حفاظت کے لیے شاہی فوج بھیجنے پر مجبور ہوا تھا۔

ایسی فضا میں شریف رضی نے زندگی بسر کی، وہ خود بھی شیعہ تھے، اس کے باوجود انھوں نے تعصب کو اپنے قریب نہیں آنے دیا، ان کی کشادہ دلی نے مذہبی اختلافات اور باہمی کشیدگی سے انھیں ہمیشہ بچائے رکھا، مصر کے مشہور محقق ڈاکٹر زکی مبارک مرحوم نے لکھا ہے

والواقع ان الشریف کان قلیل	یعنی شریف رضی میں مذہبی تعصب بہت کم
الرعایۃ للعصبیۃ المذھبیۃ	تھا، اور بڑی حد تک آزاد ذہن و فکر
والظاھر ھو انہ کان حر العقل	رکھتے تھے۔
الی حد بعید[1]	

بے تعصبی اور کشادہ دلی کی یہ نعمت شریف رضی کو اپنے والد ابو احمد الحسین بن موسیٰ سے ورثہ میں ملی تھی، جو ہمیشہ مصلحانہ اور تعمیری پہلو اختیار کرتے تھے۔ اور شیعہ اختلاف کو ہوا دینے کے بجائے ان کو فرو کرنے کی کوشش کرتے تھے،

شریف رضی کا بھی یہی موقف تھا، انھوں نے اس کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، سنی اساتذہ سے علم کی تحصیل شریف رضی کی وسعت نظری کی سب سے بڑی دلیل ہے، رضی کے ایک استاد ابو اسحاق ابراہیم بن احمد بن محمد الطبری المالکی متوفی ۳۹۳ھ تھے، ابن الجوزی کے بیان کے مطابق شریف رضی نے ان سے قرآن پڑھا تھا، ایک دن مالکی استاد نے شریف رضی سے پوچھا، تم کہاں رہتے ہو؟ شریف رضی نے جواب دیا کہ اپنے آبائی مکان میں جو باب المحول میں واقع ہے، استاد نے کہا کہ تم میرے گھر میں آکر رہو، اور اپنے باپ کا مکان خالی کر دو،

---

[1] الدکتور زکی مبارک: عبقریۃ الشریف الرضی ج ۱ ص ۱۰۱

رضی نے جواب دیا کہ میں نے اپنے والد کے علاوہ کبھی کسی کی طرف سے کوئی چیز قبول نہیں کی، مشفق استاد نے جواب دیا تم پر میرا حق تمھارے باپ سے زیادہ ہے، کیونکہ میں نے تمھیں قرآن حفظ کرایا ہے، یہ سنکر شریف رضی نے اس کے حکم کے سامنے سر خم کر دیا،

دوسرے شیعہ علماء کے مقابلہ میں شریف رضی کا قلم جادۂ اعتدال سے بہت کم بھٹکا ہے، اور "حب علی" کے جوش میں کہیں بھی انھوں نے بردباری و وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے، صرف اپنی کتاب "المجازات النبویۃ" میں ایک مقام پر حضرت حسانؓ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول:

حسان حجاز بین المؤمنین	حسان مومنوں اور منافقوں کے درمیان
والمنافقین، لایحبہ منافق	آڑ ہیں، منافق ان سے دوستی اور مومن
ولایبغضہ مؤمن	دشمنی نہیں رہ سکتے۔

پر بحث کرتے ہوئے ان کا قلم بھٹکا ہے، اور یہ لکھ دیا کہ

ھذا الکلام عندنا فی حسان	یعنی حسان کی یہ حیثیت صرف نبی صلی اللہ
متعلق بوقت مخصوص، وھو زمن	علیہ وسلم کے دور تک باقی تھی، پھر جب آپ کے
النبی (ص)، فاما حین ظاھر	بعد انھوں نے حضرت علیؓ سے دشمنی شروع
امیر المومنین علیہ السلام	کر دی اور اپنے اشعار میں ان پر تعریض
بعداوتہ، ورماہ بمعاریض	کرنے لگے تو یہ حیثیت ختم ہوگئی اور وہ
القول فی اشعارہ، فقد خرج	دشمنی و گمراہی کی جانب جھک پڑے،
من ان یکون حجازا بین الایمان	
والنفاق، وتحیز الی جانب	

(المجازات النبویۃ ص ۱۰۵، مطبوعہ مصر)

شریف رضی کے اس اہتمام کے علاوہ اور کوئی بیان ایسا نہیں ملتا ہے جس میں تعصب و تنگ نظری کا شائبہ پایا جاتا ہو، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو تلخیص البیان اور المجازات النبویہ دونوں کتابوں میں تعصب کے اظہار کا موقع مل سکتا تھا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا،

اساتذہ | شریف رضی کے اساتذہ کی ایک فہرست جس میں دس پندرہ علما، کے نام ہیں، عبدالحسین احمد الامینی نے اپنی کتاب "الغدیر" میں لکھی ہے، اس کے علاوہ تاریخ بغداد، المنتظم، معجم الادباء، وفیات الاعیان، بغیۃ الوعاۃ، النجوم الزاہرۃ، الکامل اور طبقات و تراجم کی دوسری کتابوں میں بھی بعض اساتذہ کا ذکر ہے،

شریف رضی کے تعلقات اپنے اساتذہ سے بہت قریبی تھے، وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے، جہاں ان کی رائے کا ذکر کرتے تو تعظیم و تعریف کے ایک دو جملے ضرور کہہ دیتے، اور ان کے لیے دعائے خیر کرتے، ہم ان میں سے بعض اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں،

۱۔ ابوسعید الحسن بن عبداللہ السیرافی النحوی :- بغداد کے قاضی تھے، علوم قرأت قرآن، فقہ، نحو اور لغت میں کمال حاصل تھا، نحو میں بصریوں کے مذہب کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے، معاشی زندگی میں بڑے محتاط تھے۔ اپنے ہاتھ سے روزانہ دس صفحے لکھتے تھے اور اسی کی اجرت سے گذر اوقات کرتے تھے، ۳۶۸ھ میں وفات پائی، شریف رضی نے نو سال کی عمر سے پہلے ان سے استفادہ کیا تھا،

۲۔ ابوالفتح عثمان بن جنی موصلی :- علم نحو اور عربی زبان کے امام مانے جاتے تھے، یاقوت نے معجم میں ان کے تفصیلی حالات لکھے اور بعض اشعار نقل کیے ہیں، ابن جنی نے متنبی کے اشعار کی روایت اور شرح بھی کی ہے، متنبی کا قول ہے کہ ابن جنی اعرف بشعری منی، یعنی ابن جنی میرے اشعار مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ ۳۹۲ھ میں ان کی وفات پر شریف رضی نے ان کا

دردناک مرثیہ لکھا جس میں ان کے فضل و کمال کا ذکر ہے، اس مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے:

فمن للمعانی فی الاکنۃ القیت الی با قرغیث المعانی وفاتق

۳۔ قاضی ابوالحسن عبدالجبار بن احمد شافعی معتزلی:۔ اپنے دور کے مشہور معتزلی اور قاضی القضاۃ کے لقب سے معروف تھے، رے میں ۴۱۵ھ میں وفات پائی، شریف رضی نے ان سے تقریب لاصول اور شرح الاصول الخمسۃ پڑھی تھی،

۴۔ سہل ابن احمد بن عبداللہ بن سہل الدیباجی:۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور ابن العوارس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہ غالی شیعہ تھے[۱]، ۳۸۵ھ میں وفات پائی، شریف رضی نے المجازات النبویۃ میں حدیث: الخلق عیال اللہ پر گفتگو کرتے ہوئے ان کا تذکرہ کیا ہے،

۵۔ ابوعبداللہ محمد بن عمران مرزبانی:۔ ان کی کتاب "معجم الشعراء" مشہور ہے، جس میں انھوں نے اپنے دور تک کے شعراء کا تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے کیا ہے، یہ کتاب تاریخ ادب کا معتبر ماخذ ہے، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ "علم حدیث میں ثقہ اور مذہباً تشیع کی طرف مائل تھے، شعر اور شعراء سے بہت زیادہ لگاؤ تھا، انھوں نے سب سے پہلے یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کا دیوان جمع کیا اور اس کام سے یہ ثابت کیا کہ علم کا مقام تعصب و تنگ نظری سے بلند ہے، ۳۸۴ھ میں وفات پائی۔

تصنیفات | شریف رضی کا دور مختلف علوم و فنون کی تصنیفات سے مالا مال تھا، ادب، نحو، لغت، تاریخ، فقہ، حدیث اور علم کلام کی بہت سی اہم کتابیں اسی دور میں لکھی گئیں، ابن العمید، الخوارزمی، الصاحب بن عباد اور بدیع الزمان الہمدانی جیسے اساطین علم و فن کی تصنیفات

[۱] لسان المیزان ج ۳ ص ۱۱۷، مطبوعہ حیدرآباد دکن

کے علاوہ اس دور میں ثعالبی نے یتیمۃ الدہر، ابو ہلال عسکری نے کتاب الصناعتین، شریف مرتضیٰ نے الدرر والغرر، آمدی نے الموازنۃ بین الطائیین، ابوحیان توحیدی نے الامتاع والموانسۃ، راغب نے محاضرات الادباء، ابو العلاء المعری نے رسالۃ الغفران، ابن جنی نے الخصائص، ازہری نے التہذیب، ابن فارس نے مقاییس اللغۃ، جوہری نے الصحاح، ابن ندیم نے الفہرست اور ابن مسکویہ نے تجارب الامم لکھی۔

اس دور کی تصنیفات میں شریف رضی کی کتابوں کو ممتاز مقام حاصل ہے، ان کی نثر و نظم دونوں میں عربی فصاحت و بلاغت کی گہری چھاپ اور انداز بیان میں بڑی دل کشی اور گہرائی ہے، اور یہ ثمرہ ہے قرآن و حدیث اور حضرت علیؓ کے خطبات سے ان کے غیر معمولی شغف کا، فصاحت و بلاغت کے ان سرچشموں سے استفادہ نے شریف رضی کے کلام میں غیر معمولی دلکشی اور نکھار پیدا کردیا ہے، قرآن و حدیث کے بلاغت کے پہلوؤں کو واضح کرنے میں شریف رضی نے جو کمال دکھایا ہے اس کا مختصر نمونہ ہم آیندہ پیش کریں گے جس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ ان کی ان تحریروں سے عربی فن بلاغت کو کس قدر جلا ملی اور اس کے محاسن اجاگر ہوئے اور بعد کے مصنفین کے لیے راستہ ہموار ہوا، آخر میں شریف رضی کی تالیفات کا مختصر تعارف کیا جاتا ہے۔

۱۔ نہج البلاغۃ:۔ شریف رضی نے اس کتاب میں حضرت علیؓ کا کلام اور ان کے خطبات کو جمع کیا ہے، اس کتاب کے متعدد اڈیشن شائع ہوچکے ہیں، اس کتاب کی اہمیت کی بنا پر بہت سے علماء نے اس کتاب کی شرحیں لکھیں، جن کی تعداد ستر سے زیادہ بتائی جاتی ہے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت ابوحامد عزالدین عبدالحمید بن ابی الحدید متوفی ۶۵۵ھ کی شرح کو حاصل ہے، نہج البلاغۃ کی شرحیں فارسی زبان میں بھی لکھی گئی ہیں، ان میں عبدالباقی تبریزی کی شرح منہاج النبویۃ اور تاج الدین حسن معروف بہ ملا تاجا کی شرح قابل ذکر ہے۔

نہج البلاغۃ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں شریف رضی نے اپنا کلام بھی شامل کر دیا ہے، اور موجودہ تمام خطبے حضرت علیؓ کے نہیں ہیں، متقدمین میں ابن ابی الحدید نے اور معاصر علماء میں جامعہ ازہر مصر کے مشہور استاد نحو و لغت علامہ محمد محی الدین بن عبد الحمید نے نہج البلاغۃ کے مقدمہ میں اس مسئلہ پر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے اور مذکورہ شبہہ کا جواب دیا ہے، ہم اس پہلو پر کسی دوسرے مقالہ میں بحث کریں گے۔

۲۔ المجازات النبویۃ :- اس کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۳۶۱ احادیث کی فن بلاغت کی روشنی میں تشریح کی گئی ہے، اور ان کے مجاز و استعارے کو واضح کیا گیا ہے، یہ کتاب عراق میں ۱۳۲۴ھ، ۱۳۲۸ھ میں طبع ہوئی تھی، پھر جامعہ ازہر میں عربی زبان و ادب کے استاد علامہ محمود مصطفیٰ مرحوم کی تحقیق کے ساتھ مصر میں چھپی۔

۳۔ تلخیص البیان فی مجازات القرآن :- یہ وہی کتاب ہے جس کا مختصر تعارف اس مضمون میں کیا گیا ہے، اس کتاب کو سب سے پہلے اس کے قلمی نسخہ کا فوٹو لے کر ایران سے ۱۳۶۹ھ میں محمد المشکاۃ اور حسین علی محفوظ نے تفصیلی فہرست اور مختصر مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا، اس کے بعد ۱۳۷۴ھ میں مصر کے مشہور ناشر عیسیٰ البابی الحلبی کے کتبخانہ دار احیاء الکتب العربیۃ سے یہ کتاب شائع ہوئی جس پر مصری عالم محمد عبد الغنی حسن نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا اور کتاب کی تحقیق کے ساتھ ساتھ اس کی مفصل فہرست مرتب کی، اس کے مقدمہ کو پیش نظر رکھکر ہم نے یہ تعارف تیار کیا ہے، اس کتاب کے بارے میں علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ

انہ جاء نادر فی بابہ[1] یعنی یہ اپنے موضوع پر انوکھی کتاب ہے۔

۴۔ دیوان :- شریف رضی کے اشعار پر مشتمل اس دیوان کو ابو حکیم الخبری متوفی ۴۷۶ھ

---

[1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۳۔

نے جمع کیا تھا، یہ دیوان بیروت، بمبئی اور قاہرہ سے مختلف اوقات میں شائع ہوچکا ہے۔

۵۔ حقائق التاویل فی متشابہ التنزیل:۔ شریف رضی نے مجازاتِ نبویہ اور تلخیص البیان میں متعدد مقامات پر اس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے، صاحب "عمدۃ المطالب" نے اس کا نام "کتاب المتشابہ فی القرآن" بتایا ہے، ان کے علاوہ شریف رضی کی دوسری مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کا تذکرہ بھی اصحابِ سیر و تراجم نے کیا ہے، لیکن زیادہ اہمیت مذکورۂ بالا کتابوں ہی کو حاصل ہے،

شریف رضی نے ان تصنیفات میں جن مسائل پر اظہار خیال کیا ہے، اس سے ان کی تنقیدی نظر اور منفرد شخصیت پوری طرح نمایاں ہے، وہ کسی مسئلہ کو ماننے سے پہلے اسکی پوری چھان بین کرتے ہیں، اپنی رائے کا اظہار کرکے پھر مسئلہ کی صحیح صورت کے بارے میں محاکمہ کرتے ہیں، مجازات نبویہ اور تلخیص البیان میں یہ چیز ہر جگہ نمایاں ہے، چنانچہ آیت کریمہ فضربنا علی آذانھم فی الکھف سنین عددا، کی تفسیر میں بعض مفسرین کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

وفی ھذا القول بعض التخلیط والذی اذھب الیہ فی ذلک ماذکرتہ فی کتابی الکبیر علی شرح واستقصاء، وھو ان یکون المراد بقولہ: فضربنا علی آذانھم واللہ اعلم ای اخذنا اسماعھم فبطل استماعھم

یعنی اس میں خلط ملط ہو گیا ہے، اس مسئلہ پر میں نے اپنی کتاب الکبیر میں پوری شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے، وہ یہ کہ فضربنا علی آذانھم سے مراد یہ ہے کہ انکی سماعت لے لی، اس سے ان کی قوت سماعت جاتی رہی۔

اسی طرح مجازاتِ نبویہ میں حدیث لا اسلال ولا اغلال میں مجاز کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ وقد قال بعضهم: المراد بالاسلال هھنا سل السيوف، وبالاغلال لبس الدروع وهذا القول غير معروف، والقول الاول هو السدد والصحيح المعتمد۔

ان دونوں مثالوں سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ شریف رضی میں علمائے راسخین کی خود اعتمادی تھی، اور وہ تنقیدی امور میں متقدمین کی اندھی تقلید کے بجائے اپنے علم و بصیرت سے مسئلہ واضح کرتے تھے۔

نمونے | ذیل میں ہم تلخیص البیان کے کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں جن سے شریف رضی کا ادبی اسلوب، مجازات قرآن کے سلسلہ میں ان کی توجیہ اور فن بلاغت و ادب پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوگا۔

سورۂ مریم کی آیت: ووهبنا لهم من رحمتنا وجعلنا لهم لسان صدق عليا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وهذه استعارة. والمراد بذكر اللسان ههنا۔ والله اعلم۔ الثناء الجميل الباقي فى اعقابهم والخالف فى ابنائهم، والعرب تقول: جاء فى لسان فلان، يريد مدحه اوذمه، ولما كان مصدر المدح والذم عن اللسان عبروا عنهما باسم اللسان. وانما قال سبحانه لسان صدق اضافة للسان الى الصدق حالانه واشرف متصرفاته لان افضل احوال اللسان ان يخبر صادقا او يقول حقا۔

یعنی آیت میں استعارہ ہے۔ لسان سے ثنائے جمیل و ذکر خیر مراد ہے جو آنے والی نسلوں میں باقی رہے گا، چنانچہ اہل عرب جاء فی لسان فلان بول کر مدح یا ذم مراد لیتے ہیں اور چونکہ مدح و ذم کی تمام باتوں کا صدور زبان سے ہوتا ہے اس لیے زبان کا لفظ استعمال کرکے دونوں ہی کیفیتوں کو مراد لیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آیت میں لسان کی اضافت صدق کی طرف کرکے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ سچائی زبان کی فضیلت اور اس کا سب سے بہترین عمل ہے۔

سورۂ حم السجدہ کی آیت واما ثمود فھدینا ھم فاستحبوا العمی علی الھدی کے مجاز پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

وھذہ استعارۃ، والمراد بالعمی ھھنا ظلام البصیرۃ، والمتاع فی الغوایۃ فان ذلک اخف علی الانسان واشد ملاءمۃ للطباع من تحمل مشاق النظر والتاجج فی غمار الفکر[1]

یعنی اس آیت میں عمی (اندھاپن) سے بصیرت کی تاریکی اور گمراہی میں متحیر و سرگرداں رہنے والی کیفیت مراد ہے، کیونکہ انسانی طبیعت کے لیے فکر و نظر اور غور و خوض کی گہرائیوں میں آنے کی مشقت کے مقابلہ میں وہی تاریکی زیادہ آسان

سورۂ حم عسق کی آیت وینشر رحمتہ وھو الولی الحمید کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وھذہ استعارۃ، ولیس المراد ان ھناک رحمۃ کانت مطویۃ فنشرت وخفیۃ فاظھرت، وانما معنی الرحمۃ ھھنا الغیث المنزل لاحیاء الارض واخراج النبت، ونشرہ عبارۃ عن اظھار النفع بہ وتعریف الخلق عواقب المصالح بموقعہ[2]

یعنی آیت میں استعارہ ہے، کیونکہ مراد یہ نہیں ہے کہ رحمت لپٹی ہوئی تھی، پھر اسے پھیلا گیا یا پوشیدہ تھی تو ظاہر کیا گیا، بلکہ رحمت سے مراد بارش ہے جسے زمین کی زندگی اور نباتات کی روئیدگی کے لیے اللہ تعالیٰ برساتا ہے اور نشر سے بارش کے فوائد کا اظہار اور مخلوق کو اس کے برسنے سے پیدا ہونے والے منافع کا بتانا مقصود ہے۔

تلخیص البیان کے اس جائزہ سے مجازات قرآن کے سلسلہ میں شریف رضی کی کوششیں ان کی کتاب کی اہمیت قارئین کے سامنے آگئی ہوگی، اور ان کے علمی کمالات اور ادبی خدمات کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

---

[1] تلخیص البیان ص ۲۹۳ [2] ایضاً ص ۲۹۸

مجیر بیلقانی

از جناب کبیر احمد صاحب جائسی ایم اے، ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

اس موقع پر ہم کو مجیر کے اُن قصائد کا بھی جائزہ لینا چاہیے تھا جن کی نشاندہی فاضل مرتب دیوان اثیر نے کی ہے، لیکن اس مضمون کا مقصد صرف غزلیاتِ مجیر کا جائزہ لینا ہے، اس لیے قصائد پر بحث کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی۔

مجیر کی غزلیں اس دور کی یادگار ہیں جب غزل کی روایات بن رہی تھیں، اور اس کا پس منظر بہت وسیع اور روشن نہ تھا، یہ وہ دور تھا جب قصیدہ کو اصنافِ سخن کا سرتاج سمجھا جاتا اور اس میں ممدوح کی مدح کے ضمن میں ملکی، معاشی، معاشرتی اور سماجی مسائل اور اس کی جنگ و امن، فتح و شکست اور دوسرے کارناموں کا ذکر بھی ہوتا تھا، اس لیے وہ مدح سرائی کے ساتھ تاریخ کا بھی کام سرانجام دیتے تھے، اس لیے قصیدہ نگاری نے زندگی اور اس کے مسائل کا اس طرح احاطہ کر لیا تھا کہ دوسرے اصنافِ سخن کا دروازہ بند سا ہو گیا تھا، اس زمانے کے شعراء قصیدہ سے غزل، مثنوی اور مرثیہ سب کا کام لیتے تھے، اس لیے دوسرے اصنافِ سخن کا چراغ ان کے سامنے بجھ گیا تھا، ہمارے دور کے کچھ ناشناسانِ سخن جو قصیدہ کے اس وصف پر نظر نہیں رکھتے ان کا خیال ہے کہ یہ صنفِ سخن صرف شاہانِ وقت کو خوش رکھنے اور پیسہ کمانے کے لیے ایجاد کی گئی تھی، اور اس کا "واقعی شاعری" سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

اگر یہ حضرات قدماء کے قصائد کا غائر نظر سے مطالعہ کریں تو ان کو محسوس ہوگا کہ قدماء نے قصائد سے صرف مدح کا ہی کام نہیں لیا ہے بلکہ اس کو دیگر اصنافِ سخن کے بدل کے طور پر بھی استعمال کیا ہے، اور آج ہم قدماء کے قصائد سے اس دور کے معاشی و معاشرتی حالات، رہن سہن اور زندگی کے دوسرے کوائف کا پتہ لگا سکتے ہیں، قصیدہ نے زندگی اور کوائفِ زندگی کو اس طرح گھیر لیا تھا کہ اس میں غزل کے لیے مشکل سے جگہ نکل سکتی تھی، لیکن غزل میں ایسا سحر ہے کہ اس دور میں بھی اصحابِ ذوق اس کے سحر سے مسحور تھے، ایسے غزل گویوں میں ایک مجیر بیلقانی بھی ہے، جس نے اپنے وسیع لیکن تلخ تجربات زندگی کی مدد سے اس صنفِ سخن کی ایسی آبیاری کی ہے کہ بعض اوقات اس کی غزلیں متوسطین کی غزلیں معلوم ہوتی ہیں اور یہ مطلق احساس نہیں ہوتا کہ یہ کلام اس دور کے شاعر کا ہے جب قصیدہ ہی تمام اصنافِ سخن کا سرتاج اور کوائفِ زندگی کا ترجمان سمجھا جاتا تھا،

اس کی غزلوں کے مطالعہ سے راقم کو یہ اندازہ ہوا کہ چھٹی صدی ہجری کے شعراء میں کوئی شاعر بھی اس لحاظ سے مجیر کی ہمسری نہیں کر سکتا کہ اس نے زندگی اور کوائفِ زندگی کو غزل کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے، جس طرح مجیر نے ڈھالا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر مخالف قوتوں سے نبرد آزما رہا، یہ مخالف قوتیں ارضی بھی تھیں اور سماوی بھی، ان میں سے بعض پر اس کا قابو چل گیا، اور بعض کے سامنے وہ مجبور و بے بس ہو گیا، ان تجربات نے اسکی شاعری، خاص طور سے غزل کو زندگی سے بہت قریب کر دیا، چنانچہ اس کی غزلیں صرف وصفِ محبوب اور عشق و محبت کے افسانوں میں محدود نہ رہیں بلکہ اس نے غزل سے وہی کام لیا جو اس کے بعد متوسطین نے اعلیٰ پیمانہ پر لیا ہے، ان دونوں میں صرف یہ فرق ہے کہ مجیر کے دور کی زبان اتنی منجھی، سہل اور رواں نہ تھی، جتنی متوسطین کے دور کی تھی، اس کے علاوہ اس کے دور میں بات کو

پیچیدہ انداز میں کہنے کا بھی رواج نہ تھا، جس سے بات تہ دار ہو جاتی اور اس کے معنی میں زیادہ حسن پیدا ہو جاتا، اس لیے پہلی نظر میں مجیر کی غزلیں صاف، سادہ اور ہلکی پھلکی معلوم ہوتی ہیں، لیکن جب ان پر بھی غور و فکر کی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان غزلوں میں بھی ایک تہ داری زندگی کے تجربات کا نچوڑ اور ایک جیتے جاگتے انسان کا دل دھڑک رہا ہے، یہ ضرور ہے کہ ان میں فلسفیانہ یا متصوفانہ افکار کا پتہ نہیں چلتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم افکار اس وقت سے شاعری میں داخل ہوئے ہیں جب بات کو پیچیدہ اور تہ در تہ کہنے کا آغاز ہوا، قدما کے پاس کہنے کے لیے اتنے مضامین اور ان کے ادا کرنے کے لیے الفاظ کا اتنا ذخیرہ تھا کہ ان کو پیچ در پیچ انداز بیان کی ضرورت نہ محسوس ہوتی، بلکہ صاف اور سادہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے، اسی لیے مجیر اور اس کے ہمعصروں کا کلام متصوفانہ اور فلسفیانہ افکار سے تقریباً خالی ہے، یوں تو تلاش کرنے والوں نے کھینچ تان کر ان کے یہاں بھی متصوفانہ اور فلسفیانہ افکار و مضامین تلاش کر لیے ہیں، مگر انصاف یہ ہے کہ ان افکار کو فلسفیانہ یا متصوفانہ کہنا صحیح نہیں ہے، اور مجیر کی غزلیں ان سے خالی ہونے کے باوجود اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہیں، اور ان کا حسن بیان دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

باکہ کشایم نفس کا بل صفای نماند	در ہمہ روی زمیں بستہ کشای نماند
بر چمن روزگار پی ... کا ... رو	خوب نہالی ز رست مہر گیای نماند
قافلۂ خرمی زاں سوی عالم گذشت	در پی آزادگاں بانگ درای نماند
دل طلب یار کرد یار تر کش مکن	دید کہ در ہیچکس ہیچ وفای نماند
بسر کوی جہاں انس مگیر ای مجیر	گر ہمہ دل خستگان جنس تو جای نماند

(نسخۂ رامپور نمبر ۲۹۵)

هیچ وفای ز روزگار ندیدم — هیچ می خالی از خمار ندیدم
چیده ام از باغ روزگار بسی گل — لیک بجز خار در کنار ندیدم
همنفسان رفته اند واز غم شان — راحتی از هیچ غمگسار ندیدم
راحتِ دل گفته اند هست درین عهد — این همه گفتند و هیچ بار ندیدم
چو بدیدم سرای عمر و لیک
هیچ بنا در وی استوار ندیدم (نسخۂ رامپور نمبر ۳۲۰۳)

در دست برد نظم زدوران گزینه ام — گردون بصد قران ننماید قرینه ام
باخود نداشت حوصلۂ دهر روزیم — حاصل نه شد ز خرمنِ ایام چینه ام
صد جام جم کند زمن این چرخ شسته رنگ — گر بشکند بسنگ فنا آبگینه ام
گردون چو چرب دست که هر دلبرست ازو — گندم صفت شگافت درین عرصه سینه ام
در بر گرفته اشک چو خط بر پیاله ام — دل خون شده ز رشک جوی در خزینه ام
داند بلا که بنده مجیر بلاکشم
هرچند پایمال شده سرسری نه ام (ایضاً نمبر ۴۹۵)

گلی کو کز و زخم خاری نیاید — مئی کو کزان می خماری نیاید
ز پشت جهان هر نفس عاشقانرا — غم آید ولی غمگساری نیاید
ازین رهروان گر کسی بر شماری — ازو حاصل الا شماری نیاید
اگر سقف گردون بصد پاره گردد — بجز بر سر سوگواری نیاید
کسی کز میان جهان بر سر آمد — ز دریای غم بر کناری نیاید
مجیر از تو کار جهان به نگردد
که از سبزه نوبهاری نیاید (ایضاً نمبر ۳۲۰۳)

بلبلان رخت بباغ افگندند زاغ را بار سفر می بندند
لب لاله بعبیر اندودند دهن او بمشک آگندند
صبح و گل خنده را بیند زهم هر دو بر کار جهان می خندند
سوگوارست بنفشه که هنوز سوسن را یاسمن اندر بندند
تازه رو بیند ریاحین الحق
عاقلان جز که چنین نپسندند (ایضاً)

ز چه دل بجوانی ز غم جدا نبود زعیش لاف زدن در جهان روا نبود
هر ذخیره که اندر جهان کسی سازد بر از موافقت یار باوفا نبود
ز زمانه بدان عهد بست و پیمان کرد که خوشدلی و فراغت بعهد ما نبود
ین زمانه فراغت طلب نباید کرد که جای دارد دل کام اژدها نبود
کجاست مجلس انسی بگوی در آفاق
که او بزحمت نا اهل مبتلا نبود (نسخه برتش میوزیم)

سیت تا نصیبهٔ ما از جهان غم است حال دل از فلک چو فلک نیک برهم است
عالم از فراغت خاطر اثر نماند آری مگر فراغت خاطر فسوی عالم است
ز روزگار دل خوش از زمانه گفت چیزی مجوی بیش که اندر جهان کم است
یم روی غصه کنون وقت خوشدلیست خوردیم زخم فتنه کنون جای مرهم است
انصاف ده که قسمت ما غم بسی رسد
گر زانکه در جهان غم و شادی بی قسمت (نسخه برتش میوزیم)

مطلع کا متن دیوان نسخہ مجیر بیلقانی سے درست کیا گیا ہے،

ان اشعار کے سرسری مطالعہ سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مجیر نے اپنی غزلوں کو مدح و ممدوح کے تنگ دائرہ تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ ان کو زندگی اور شدائدِ زندگی کی عکاسی کا وسیلہ بنایا ہے، مجیر کے یہاں بے ثباتیٔ دنیا کا جو تصور نظر آتا ہے وہ دوسرے شعراء کے بے ثباتیٔ دنیا کے تصور سے بالکل الگ ہے، مجیر اس تلخ اور سنگین حقیقت کو صرف حقیقت کے ہی روپ میں پیش کرتا ہے، وہ اس سے نہ تو قنوطیت کا شکار ہوتا ہے اور نہ اس کے ردعمل کو لذتیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، بلکہ ایک حقیقت کو حقیقت سمجھکر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی ان غزلوں میں بھی جو محبوب کی ذات کے گرد گھومتی ہیں ایک ٹھہراؤ، ایک سنجیدگی و تامل اور صبر سکون پایا جاتا ہے، اس کی غزلوں میں محبوب کا وہ روایتی کردار بھی بہت کم ملتا ہے جس کے لیے فارسی شاعری بدنام ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس کا عشق شعلۂ جوالہ نہیں ہے، جو ایک مرتبہ بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے، بلکہ دیرپا دھیمی آنچ کی طرح ہے جو وجود کو خاکستر کر دیتی ہے، اسی تصورِ عشق کی بنا پر اس کی غزلیں جذبات کا دہکتا ہوا لاوا نہیں بلکہ اس کی مثال اس شمعِ سوزاں کی ہے جو مستقل آگ میں جلتی رہتی ہے۔

ان کی اس کیفیت نے ان کو اس کے معاصرین کی غزلوں سے ممتاز بنا دیا ہے، ہمارے خیال میں اس کی غزلوں کی یہی کیفیت اس کے مخالفین کے لیے ناقابلِ فہم رہی ہے اور آج بھی بہت سے ایرانی نقاد صرف اس وجہ سے اس کی غزلوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے کہ وہ لوگ اس کی غزلوں کو اس کے معاصرین کی غزلوں کے معیار پر جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس نافہمی کی بہترین مثال بدیع الزماں بشرویۂ خراسانی

کا یہ اقتباس ہے :

"مجیر غزلیات و قطعات ہم بسیار دارد و قطعہ بطرز انوری می پرداز د ولی در ہیچ یک فکر و مضمون چنداں تازہ و سودمند یا موثری بکار نمی بردو آں سحر بیان کہ در قصائد او چناں کارگر شدہ است کہ اکثر باند اشتن مضمون بدیعے در فریفتن دل و شیفتن خاطر از شاعران سحر آفریں گردی بردو در غزل و قطعہ ہای او اثر نہ نمودہ است . . . . [1]"

یہ اس ناقد کا بیان ہے جس نے فارسی زبان میں مجیر کی شاعری پر سب سے زیادہ مفصل کام کیا ہے، ہمارے خیال میں موصوف کی نافہمی کی واحد وجہ یہی ہے کہ انھوں نے مجیر کی غزلوں کو اس کے معاصرین کی غزلوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی، اگر وہ ان کو اس کی زندگی کی روشنی میں دیکھتے تو غالباً وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچتے جس پر ہم پہنچے ہیں، اب ہم مجیر کی چند ایسی غزلیں پیش کرتے ہیں جو مدیح مجوب ہوتے ہوئے بھی اس دور کی مروجہ غزلوں سے الگ ہیں :

باد چوں طرۂ آں جان درشکند ـ فتنہ بینی کہ در عقل رواں درشکند
دل بآتش نہم آں لحظہ کہ آں رشک پری ـ بر مہ نو زرہ مشک فشاں درشکند
عہد کرد او کہ خورد خونم دیترسم از آنک ـ شکند عہد مرا کام بجاں درشکند
گرچہ بسیار کمانش بکشم آ مرہ ـ تیر مژگانش مرا ہم چو کماں درشکند
در غمش زاں سخن خویش بگویم کہ مرا ـ سخن از شرم خیالش بزباں درشکند
زلف بشکست چو دل در خم او بست مجیر
تا دل خستۂ او را بمیاں درشکند (نسخہ رامپور نمبر ۴۹۵)
آں زلف پر از پیچ و شکن راچہ تواں گفت ـ واں چہرہ چو برگ سمن راچہ تواں گفت

[1] سخن و سخنوراں قسمت نخستین از جلد دوم ص ۲۵۳، ۲۵۴

رویش چمن و رنگ رخ او گل خود روست / یا آن گل خود روست چمن را چه توان گفت
هرچند سخنهاش همه تلخ چو زهراست / شیرینی آن تلخ سخن را چه توان گفت
عهد دل من سوخته بشکست و دلم بست / دل بستن آن عهد شکن را چه توان گفت
شمع ختنش گویم و دانم که خطا نیست / جز شمع ختن، شمع ختن را چه توان گفت

گفت این که مجیر این همه رنجی و نکوهی
ای تنگ دل آن تنگ دهن را چه توان گفت (ایضاً)

شمع دلرا و شب هجر تو سر سوخته ام / مرغ جانرا که ز سودای تو پر سوخته ام
تو چه دانی که من از دست شکرخندهٔ تو / چند بر مجمر غم همچو شکر سوخته ام
مرغ عشق تو منم زانکه درین آتش غم / بهتر آنروز شمر دم که بتر سوخته ام
سوز عشق تو بتا هست بهر خام دریغ / هم مرا سوز که صد بار دگر سوخته ام
زان مفرح که بدل سوختگان از تو رسید / شربتی ده بمن آخر که جگر سوخته ام

ورنه هر لحظه مجیر از سر دین گوید (کذا است در اصل)
شمع دلرا شب هجران تو سر سوخته ام (ایضاً)

داد دلم بدست غم غمزهٔ دلربای تو / برد بعرض بوسه جان لعل شکر فزای تو
گر تو بدان خوشی که من بی تو ز تو جفا کشم / شاد بری که ساختم حرز دل از جفای تو
سوخته دل مکن مرا بو که بتو سزا شوم / صد چو من اندای صنم سوخته دل سزای تو
هرچه توانی از بدی از کنی بجان من / آن منم که بد کنم تا بزیم بجای تو

گر ز تو لاف زد مجیر از سر چشم دیده گذر
تا ز تو می زنند لاف بردر این گدای تو

(ایضاً)

ای بحسن آفت جہاں کہ توئی / کی شناسد ترا جناں کہ توئی
ہمہ عالم بتانِ عشوہ گرانذ / نہ ازیں خوب و دلستاں کہ توئی
از تو دور او فتادم چہ عجبست / ایں چنیں خانہ درمیاں کہ توئی (کذا ست در اصل)
نیک دانی کہ بیوفا نہ منم / ای نکو روی بدگماں کہ توئی
کہ بدرد تو شادنیست مجیر
بی وفا باد ہم چناں کہ توئی (بیاض ابن یمور)

مجیر کی یہ غزلیں ہمارے خیال کی تصدیق کے لیے کافی ہیں، مگر ان غزلوں کو اس دور کی مروجہ غزلوں کے پس منظر میں دیکھنا درست نہ ہوگا، ان کی اصل قدر و قیمت معلوم کرنے کے لیے اس کے قصائد کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے، جن میں وہ مدح کی تمام پابندیوں کے باوجود دنیا کے بدلتے ہوئے رنگ کا بھی لحاظ رکھتا ہے، جیسا شاعر کی نظر زمانہ کے تغیرات پر ہو اور اس کی شاعری میں بھی اس کے اثرات ہوں، اسکی غزل میں وہ سپردگی، وہ عالم جذب اور وہ کیف پیدا نہیں ہو سکتا جو "من تو شدم تو من شدی" کے تصور میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے مجیر کی غزلیں اپنے معاصرین اور اپنے استاد خاقانی کی غزلوں سے بالکل الگ ہیں، اور ایک طرح سے ان کو انحراف روایت کا نام دیا جا سکتا ہے، اور اسی انحراف سے انفرادیت قائم ہوتی ہیں، دنیا کے تغیر و تبدل کا یہ احساس مجیر کی فکر میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ قصیدہ ہو یا مرثیہ، قطعہ ہو یا رباعی، غزل ہو یا کوئی دوسری صنف ہر پردہ میں اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے، ہمارے بزرگ ناقد مولانا حالی نے حافظ کے کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا تھا، "از تکرار مضامینش قاری را دل ملول نمی شود"[ا] یہ بات مجیر کی غزلوں پر بھی صادق

آتی ہے، کیونکہ اوپر مجیر کی جتنی غزلیں پیش کی گئی ہیں، وہ سب اسی مرکزی خیال کے گرد گھومتی ہیں، اس کے باوجود کوئی غزل خیال کی تازگی اور بیان کی شگفتگی سے خالی نہیں ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ وہ صحیح معنوں میں فنکار تھا، اگر اس کے رموز سے آشنا نہ ہوتا تو اسکی غزلیں یکسانیت کا شکار ہو کر اپنی ساری شگفتگی کھو دیتیں لیکن یہ اس کی فن کاری ہے کہ اس نے ایک ہی مضمون اور ایک ہی خیال کو مختلف انداز سے اس طرح باندھا ہے کہ ہر شعر الگ مضمون اور الگ خیال کا حامل نظر آتا ہے، یہی فن کاری اس کے اچھے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

آخر میں یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجیر کی وفات کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں میں بڑا اختلاف ہے، ایک گروہ کا خیال ہے کہ اصفہان کے عوام اور اوباشوں نے اس کو ۵۸۶ھ میں قتل کر دیا، دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ۵۹۴ھ میں طبعی موت مرا، لیکن تذکرہ نگاروں کی کثرت پہلے بیان کی جانب ہے، اور قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ مجیر کی پوری زندگی حاسدوں کا ہدف بنی رہی، ان ہی نے اوباشوں کو اس کے پیچھے لگا کر قتل کرا دیا ہوگا۔

کیا نواب امیر خاں پنڈاری تھے؟

از جناب ڈاکٹر برہم دت شرما صاحب ایم اے پی، ایچ ڈی

آباء اجداد

امیر خاں یا میر خاں جسے ۱۸۱۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک نئی ریاست ٹونک کا حکمراں مقرر کیا، بنیر قبیلہ کا سالار زئی پٹھان تھا، سترہویں صدی کے آغاز میں انکے ...دا طالع خاں اپنے شمالی مغربی سرحدی قبائلی وطن کو خیرباد کہہ کر روہیلکھنڈ کے شہرت یافتہ افغان علی محمد کی ملازمت میں آگئے ان کے والد حیات خاں نے سنبھل ضلع کھمیرا موجودہ ...رادآباد) میں زمین حاصل کرکے کاشتکار بن گئے، اس کاشتکار والد کے گھر نواب امیر خاں ۱۷۶۹ء مطابق ۱۱۸۲ھ) سنبھل کے محلہ سرائے ترین میں تولد ہوئے۔

...گمنامی سے ملک گیر شہرت

جب نواب امیر خاں بیس برس کے ہوئے تو ذریعۂ معاش کی تلاش ...گھر سے نکل کھڑے ہوئے، ان دنوں متھرا میں فرانسیسی سپہ سالار ڈی بوئی اپنے آقا مادھو ...دھیا کے لیے سپاہی بھرتی کر رہا تھا، امیر خاں نے قسمت آزمائی کی مگر ناکامیاب رہے کیونکہ ...بوئی نے کمسنی کی بنا پر بھرتی نہیں کیا، کچھ برسوں تک امیر خاں کو جہاں زیادہ اجرت ملتی اپنی ...مات پیش کر دیتے، اس لیے آغاز میں وہ سپہ بندی یا مقامی سپاہیوں کی شکل میں بسر اوقات ...تے رہے۔ ریاست بھوپال کے وزیر چھوٹے خاں کی وفات پر جب بھوپال میں سیاسی انقلاب ...نواب محمد حیات خاں نے امیر خاں کو اپنی مدد کے لیے مدعو کیا، اس سے انھوں نے پورا ...ہ اٹھایا، اور وہ تقریباً ایک سال تک بھوپال میں رہے، اس کے بعد انھوں نے کھیچی واڑہ

ے راجپوت سرداروں درجن سال ورجے سنگھ کی طرفداری کی، کیونکہ دولت راؤ سندھیا نے
نھیں رگھوگڈھ سے نکالدیا تھا۔ اس جدوجہد میں امیرخاں نے اپنی قابلیت، شجاعت وہمت
کے جوہر دکھائے۔ اس سے متاثر ہوکر انھیں ۱۵۰۰ سپاہیوں کا سالار نامزد کیا گیا، اس کے
علاوہ فتح گڑھ کا قلعہ بھی ان کے سپرد کیا گیا، مگر اس قلعہ کو امیرخاں زیادہ دنوں تک اپنے
قبضہ میں نہ رکھ سکے۔ مگر قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ ۱۷۹۸ء میں امیرخاں جسونت راؤ ہلکر کے
دست راست بن گئے، ہلکر نے ان کو پگڑی بدل بھائی بنا لیا، اور انکی شجاعت اور کارناموں
کی بنا پر ان کو اونچے عہدوں پر مامور کیا۔ امیرخاں ہلکر کی حمایت میں پیشوا انگریزوں اور بھونسلہ
سے ہلکر کے ساتھ شانہ بشانہ لڑے اور اپنی بہادری کا سکہ ملک کے طول وعرض میں بٹھایا جسونت راؤ
نے ملک گیری میں امیرخاں کو اپنا مستقل رفیق بنانے کے لیے مفتوحہ علاقوں کو آپس میں بانٹ لیا
اور ۱۷۹۸ء میں سرونج، ۱۸۰۶ء میں ٹونک وپڑاوہ، ۱۸۰۹ء میں نیماہیڑہ اور ۱۸۱۶ء
میں چھبڑہ نواب امیرخاں کو دے کر نواب کا خطاب بخشا۔ امیرخاں نے اپنی وفاداری کے ثبوت
میں اپنی مہر پر فدوی جسونت راؤ ہلکر کندہ کرایا، مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور نواب امیرخاں
کی دوستی ہندومسلم رفاقت کی لاثانی مثال ہے۔ مگر انگریز ہمیشہ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا
کرنے کے لیے ان کو بدنام کرتے رہے

لارڈ ولزلی کے واپس جانے کے بعد ۱۸۰۵ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان
کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کی پالیسی کا اعلان کیا، تو لٹیروں اور پنڈاریوں کی بن آئی،
اس طوائف الملوکی کے زمانہ میں نواب امیرخاں نے اپنے توپخانہ کی بنا پر وسط ہند اور راجپوتانہ
میں بڑی قوت حاصل کر لی، ان کو زیر کرنا آسان نہ رہا، کرنل ٹاڈ کی رائے میں امیرخاں کو ناقابل تسخیر
تصور کیا جاتا تھا، راجپوتانہ کی خاص ریاستیں جے پور، جودھ پور، اودے پور نواب امیرخاں

دیر اقتدار تھیں، اودے پور کی خوبصورت راجکماری کرشنا کماری کے لیے جے پور اور جودھپور رقابت نے راجپوتانہ کو ویرانہ بنا دیا، نواب امیر خاں نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر تینوں ستوں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کیا،

امیر نامہ کے مصنف منشی بساون لال شاداں کے بیان کے مطابق نواب امیر خاں نے ب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے مل کر کابل کے شاہ شجاع اور اپنے وطنی قبائلیوں کی مدد سے یزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینے کا منصوبہ بنایا، لیکن حالات کی ناموافقت سے جامہ نہیں پہنا سکا، ~~سنہ~~ ۱۸۰۵ء کی طوائف الملوکی میں نواب امیر خاں کے کوٹہ کے اعلیٰ راج رانا جھالا ظالم سنگھ سے اتنے گہرے تعلقات قائم ہوگئے کہ نواب جب تک ک کا حکمراں نہیں بن گئے اپنے کنبہ کو قلعہ شیر گڑھ ہی میں رکھا، اس طرح جھالا ظالم سنگھ ست عملی اور دور اندیشی سے ریاست کوٹہ پنڈاریوں کے ظلم و استبداد سے محفوظ ہوگئی، یسٹ انڈیا کمپنی نے پنڈاریوں کے استیصال کی مہم شروع کی اس وقت نواب ں نے ان سے مصالحت کے لیے تجاویز پیش کیں، اور نواب کے وکیل لالہ نرنجن لال نے انگریز ریذیڈنٹ سر چارلس مٹکالف سے گفت و شنید کی، اس کے نتیجہ میں نواب ، ریاست ٹونک کے حکمراں بن گئے،

ن تھے؟ | ہندوستان کی تاریخ میں پنڈاری کا نام سب سے پہلے ۱۶۸۹ء میں آتا ہے، میں پنڈاری مرہٹہ فوج کے مددگار کی شکل میں موجود تھے، پنڈاری نام ایک نشیلی ۔وب ہے جس کو پنڈاری کثرت سے استعمال کرتے تھے، پیشوا باجی راؤ اول کی ا پنڈاریوں نے پیچھا کیا تھا، اس لیے باجی راؤ نے ان کو اپنے سرداروں سندھیا سرکردگی میں مالوہ میں آباد کر دیا، جہاں وہ سندھیا شاہی اور ہلکر شاہی پنڈاری

کہلاتے، ۱۷۹۴ء میں سندھیا نے ان کو نربدا کے کنارے بسنے کے لیے زمین عطا کی جس کا رقبہ کریم خاں، چیتو، دوست محمد خاں، نامدار خاں اور واصل محمد نے بہت بڑھا دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدم مداخلت کی پالیسی نے پنڈاریوں کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا، ان کو سندھیا، ہلکر اور پٹھان جنگجو سرداروں کی حمایت بھی حاصل تھی، اس لیے ان میں بہت سے فتنہ پرور عناصر شامل ہو گئے تھے، یہ لوگ وحشیوں کی طرح دیہاتوں پر ٹوٹ پڑتے اور ان کو لوٹ کر تباہ و برباد کرتے، جو چیز ساتھ نہ لیجا سکتے اس کو جلا دیتے، عورتیں خاص طور سے ان کا نشانہ بنتیں، جہاں ان کے قدم پہنچ جاتے اس کو اپنے ظلم و ستم سے بالکل ویران کر دیتے، لیکن کھلے میدان میں کبھی مقابلہ نہیں کرتے تھے۔

نواب امیر خاں و پنڈاری | میر خاں کو علاقہ ڈونڈار (جے پور) کے لوگ پنڈاری یا پنڈارہ کے نام سے موسوم کرتے ۔۔۔ین پنڈاری کا لفظ امیر خاں کے نام سے منسوب کرنا قطعاً غلط ہے، اس میں شک نہیں کہ کچھ پنڈاری امیر خاں کے ملازم تھے، اور ۱۸۱۱ء میں امیر خاں نے پنڈاری سردار کریم خاں کو دولت راؤ سندھیا کے مقابلہ میں پناہ دی تھی، نواب امیر خاں کا طرز عمل بڑی حد تک پنڈاریوں سے مشابہ تھا، لیکن وہ ایک روہیلہ افغان تھا جس کا پنڈاریوں سے کوئی تعلق نہیں، وہ ایک خود ساختہ جنگجو سردار تھا جس نے اپنی بہادری کے جوہر بار بار میدان جنگ میں دکھائے تھے۔

ٹونک کے ولیعہد محمد وزیر خاں ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ کے بعد جب دہلی گئے تو مغل شہنشاہ اکبر ثانی نے ان کو وزیر الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا، یہ دونوں قریبی رشتہ دار بھی تھے، ہماری جمہوریہ ہند کے آنجہانی صدر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا تعلق بھی نواب امیر خاں کے خاندان سے تھا، نواب امیر خاں کے ہمعصر انگریز اہل قلم دانوں نے

نسپ، ملکم، ڈف، منٹکالف اور کمپنی کے سرکاری مورخوں مل اور ولسن نے نواب امیر خاں کو ظالم پٹھان اور ہولناک لٹیرا تک کہا ہے لیکن پنڈاری لفظ استعمال نہیں کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب امیر خاں کو پنڈاری کہنا تاریخ کو غلط طریقہ سے پیش کرنا ہے۔ پروفیسر قانون گو کی رائے میں "ہماری تاریخ نے ابھی تک ہندوستان کے آخری آزمودہ جنگجو پٹھان مدبر کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، یہ ہماری تاریخ کا تاریک پہلو ہے۔

اگر مرہٹہ اس ملک میں قومی جذبہ کے آخری علمبردار تھے تو نواب امیر خاں بلاشبہ و بلا مبالغہ آخری فوجی مدبر تھے، انھوں نے پورے ملک میں اپنی فوجی قابلیت اور تدبیر کا سکہ بٹھا دیا تھا، لاوہ راسا جو شروع سے آخر تک ٹونک کے نوابوں کے خلاف ہے مگر نواب امیر خاں کو پنڈاری نہیں مانتی، اس کے نزدیک اپنے افعال اور کردار میں پنڈاریوں کی مشابہت کی وجہ سے عوام میں پنڈاری مشہور ہوئے، پنڈاری کبھی ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ نہیں کرتے تھے، مگر نواب امیر خاں ہر نشیب و فراز میں فوج کی رہنمائی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی شجاعت اور ہمت کا لوہا مخالفوں سے منواتے تھے، اسی بنا پر نہ صرف جسونت راؤ ہلکر بلکہ جودھپور کے مان سنگھ راٹھور اور اودے پور کے مہارانا بھیم سنگھ نے بھی ان کو پگڑی بدل بھائی بنایا تھا، نواب امیر خاں کی فوج اپنے دور عروج میں باون سرداروں پر مشتمل تھی جن میں راجہ بہادر لال سنگھ اور کرنل موہن سنگھ بھی شامل تھے۔

ہندو مسلم اختلاف کے اس دور میں نواب امیر خاں کی زندگی ہندو مسلم اتحاد کا ایک قابل تقلید نمونہ بن سکتی ہے، ہمارے مورخوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تاریخ کو اس کی صحیح شکل میں پیش کریں، ۱۸۳۲ء میں اجمیر دربار کے موقع پر لارڈ ولیم بنٹنگ نواب صاحب کی ہمہ گیر شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے امیر نامہ کا

ترجمہ اپنے سکریٹری پرنسپ سے انگریزی میں کرایا، ہمارے مورخوں نے شیر شاہ سوری، شیواجی، نواب حیدر علی والیٔ میسور اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کارناموں کو تو دکھایا ہے، مگر نواب امیر خاں جیسے مرد میدان کو اس سے محروم رکھا ہے، اور پنڈاری کہہ کر ان کو بدنام کیا ہے جو بڑا ظلم ہے، سر جادو ناتھ سرکار نے امیر خاں کو صرف Condohilve کہا ہے، نواب امیر خاں جس ستایش کے مستحق ہیں وہ ان کو ملنی چاہیے۔ اس سے غفلت ہمارے مورخین کی کوتاہی ہوگی، اس کے بغیر وہ غیر جانبدار نہیں کہلا سکتے۔

کتابیات

(۱) امیر نامہ:۔ منشی بساون لال شاداں (۲) شیر شاہ:۔ پروفیسر قانون گو۔
(۳) ہسٹوریکل ایسز:۔ پروفیسر قانون گو (۴) ہسٹری آف مرہٹاز۔ ڈف
(۵) فال آف مغل امپائر:۔ سرکار

تلخیص وتبصرہ

مشرق وسطیٰ کا موجودہ تنازعہ

اور

اس کا مستقبل

مذکورۂ بالا عنوان سے بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر نابیح امین فارس نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد ایک لکچر انگریزی زبان میں دیا تھا، جو دارالمصنفین کے بڑے دیرینہ ہمدرد اور کرم فرما جناب آصف علی اصغر فیضی صاحب کی عنایت سے ہم کو موصول ہوا ہے، اس میں عرب اسرائیل جھگڑے پر جو روشنی ڈالی گئی ہے، وہ جنگی، سیاسی اور صحافتی رنگ سے بالکل مختلف ہے، اس لیے ہم معارف کے ناظرین کے لیے اس کی تلخیص درج کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نابیح امین فارس عیسائی ہیں اور بیروت یونیورسٹی میں تاریخ عرب کے استاد ہیں

خواتین و معزز حاضرین!

میں اپنی گفتگو شروع کرنے سے پہلے دو باتوں کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں، ایک تو یہ کہ میں اپنے پیغمبر کے شہر ناصرہ میں پیدا ہوا، اس لیے مجھ کو اس موضوع سے جذباتی لگاؤ ہے، لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا اس میں پورا فکری رنگ ہوگا، دوسرے یہ کہ اس میں رائے بالکل میری ذاتی ہوگی، کسی ادارہ، کسی حکومت، کسی تنظیم حتی کہ میرے خاندان کے خیالات

کی نمایندگی نہ ہوگی،

سوال یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے بحران کی نوعیت کیا ہے ؟ اس کی وضاحت ضروری ہے، خصوصاً میں ذاتی طور پر اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں، اس مسئلہ میں بڑا انتشار پیدا ہوگیا ہے، لیکن اس کی اصلی نوعیت بالکل بھلادی گئی ہے جس کا ذکر تک اقوام متحدہ میں نہیں آتا ہے، اس کی وضاحت اس کے اصلی تجزیہ سے ہوسکتی ہے،

یہ موجودہ جھگڑا دراصل عقبہ اور طیران کی بندرگاہوں کا نہیں ہے، ان دونوں بندرگاہوں کا فیصلہ بین الاقوامی عدالت میں ہوسکتا تھا، جہاں یہ بات متعین ہوسکتی تھی کہ یہ علاقائی بندرگاہیں ہیں یا بین الاقوامی بحری راستے ہیں، میرے ایک طالب علم جنھوں نے ایک وکیل کی حیثیت سے ٹریننگ بھی پائی ہے، اپنے ایم، اے کے ایک مقالہ میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خلیج عقبہ کا پانی علاقائی ہے لیکن اس بحث کو نظرانداز کیجئے، کیونکہ موجودہ بحران کا تعلق خلیج عقبہ اور طیران سے نہیں ہے،

یہ جھگڑا نہر سویز کا بھی نہیں، کیونکہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۸۸ء کے معاہدہ کی رو سے اس میں امن اور جنگ کے زمانہ میں دنیا کے تمام لوگوں کو پُرامن جہازرانی کی اجازت ہے، لیکن اس معاہدہ کی خلاف ورزی برطانیہ نے ایک مرتبہ پہلی جنگ عظیم اور دوسری مرتبہ دوسری جنگ عظیم میں کی، اس وقت مصر درحقیقت اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے، اسرائیل کے علاوہ تمام ریاستوں کے جہاز اس راستہ سے گذر سکتے ہیں، ۱۹۵۶ء میں مصر نے اس نہر کو اپنی قومی ملکیت میں ضرور لے لیا لیکن اس نے اس لیے لیا کہ کسی زمانہ میں وہ اس کے حق سے دست بردار نہیں ہوا تھا، گو یہ ایک بین الاقوامی کمپنی کے ماتحت رہی،

یہ جھگڑا ناصر کی وجہ سے بھی نہیں ہے، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ معلوم نہیں کب اس

شخص سے نجات حاصل ہوگی جس کی ذات سے سارے جھگڑے ہیں، ایسے لوگ ناصر کی حکمت عملی سے چیں بجبیں ضرور رہیں، لیکن درحقیقت جھگڑے ناصر کی وجہ سے نہیں، ناصر مصر کے ساتھ عربوں کی کی اکثریت کے جذبات کی بھی نمایندگی کر رہے ہیں، دوسرے رہنما کی طرح ان سے غلطی ہوتی رہتی ہے، اور ان سے یقیناً چند غلطیاں سرزد ہوئیں، وہ انسان ہیں، اور انسان ہی سے خطائیں ہوتی ہیں، وہ مسلمان ہیں، اور صرف ایک ہی مسلمان سے کوئی غلطی نہیں ہوتی، وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں،

جھگڑا اسرائیل کی مصنوعی ریاست اور عرب ممالک کا بھی نہیں، پرانے اور نئے پناہ گزینوں کا بھی جھگڑا نہیں ہے، ۱۹۴۹ء میں ان کی تعداد نو لاکھ تین ہزار تھی، جون ۱۹۶۷ء سے پہلے ان کی تعداد تیرہ لاکھ پچاس ہزار ہوگئی، اس میں ساڑھے تین لاکھ ان لوگوں کا اور اضافہ ہوگیا ہے، جو جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیلیوں کی وجہ سے بے گھر ہوگئے، لیکن یہ بھی کوئی حقیقی مسئلہ نہیں، یہ پناہ گزیں کسی اور مسئلہ کے شکار ہوکر رہ گئے ہیں۔

اصل مسئلہ خود اسرائیل ہے جس کو ایک قانونی اور اخلاقی حیثیت دیدی گئی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور مسئلہ نہیں، یہ مسئلہ صیہونیت اور صیہونیت کے متعلقات کا ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ جب میں صیہونیت کہتا ہوں تو اس سے یہودیت مراد نہیں ہوتی، میں سامی النسل ہوں اور عیسائی بھی ہوں، اور عیسائی بھی جدید دنیا اور اسلام سے پہلے کا ہوں، عیسائی کی حیثیت سے اس پر یقین رکھتا ہوں کہ دنیا میں وہی باقی رہ سکتے ہیں جو سب سے اچھے ہیں، صیہونیت سے میری مراد یہودیت نہیں، کیونکہ یہودیت تو میرے مذہب کا ایک حصہ ہے، صیہونیت تو یہودیت کو نفی کرتی ہے۔

صیہونیت کا آغاز پانچویں صدی قبل مسیح سے ہوتا ہے، اس سے پہلے ان کی تاریخ کا

پتہ نہیں، اگر کسی کو شبہہ ہو تو وہ انجیل میں عذرا کے نویں اور دسویں باب کا مطالعہ کرے، ان ابواب میں ہٹلر ہی کی طرح نسلی نظریہ کی تنگ نظری اور مجنونانہ تعصب کی تعلیم ہے صیہونیت کی اسپرٹ ان ہی دو ابواب اور Psalm یعنی مناجات ۱۳۷ پر مبنی ہے، ان ابواب اور مناجات کو منسوب حضرت داؤدؑ سے کیا جاتا ہے، حالانکہ ان سے ان کا کوئی تعلق نہیں، مناجات ۱۳۷ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ صیہونیت کس طرح اب تک اسی کی اسپرٹ سے چپکی ہوئی ہے، اسی لیے وہ شروع ہی سے تنگ نظر، الگ تھلگ اور اپنے ہی میں مرکوز رہنے والا فرقہ ہے۔

موجودہ دور میں صیہونیت انیسویں صدی میں ابھری، جب کہ یورپ کے عیسائیوں کے مجنونانہ تعصب سے مجبور ہو کر یہودیوں کے مفکرین نے سامی نسلوں کے خلاف ایک مذہبی اور نسلی قومیت کو ابھارا، عذرا اور Psalm ۱۳۷ کے مصنف یرمیاہ اور میکہ پر غالب آئے یرمیاہ نے باب ۲۹ : ۵ - ۷ میں جلاوطن یہودیوں کو تعلیم اس طرح دی ہے کہ تم اس شہر کی خیر مناؤ جس میں میں نے تم کو اسیر کرواکے بھیجا، اور اس کے لیے خداوند سے دعا مانگو کہ اسکی سلامتی میں تمھاری سلامتی ہوگی، میکہ نے ان کو نصیحت کی تھی کہ تمھارے خداوند تم سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم عدل پسند ہو، رحم سے محبت کرو، اور اپنے خدا کے ساتھ عجز سے چلو، لیکن یہ باتیں بھلادی گئیں، اور صرف Psalm ۱۳۷ اور عذرا کی باتیں انیسویں صدی کے مفکروں کے ذہن میں رہ گئیں، جو سامی النسل کی مخالفت کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

صیہونیت کو موزز ہس، لیو پنسکر، تھیوڈ ہرزل نے فلسفیانہ رنگ دیا جس کے بعد یورپ کے یہودیوں نے انفرادی آزادی کو سیاسی پروگرام بنا کر قومیت کی ایک خیالی دنیا بسائی، صیہونیت کی پہلی عالمگیر کانفرنس ۱۸۹۷ء میں ہوئی جس کے بعد سے جدید صیہونیت

دنیا میں چل نکلی، اور پھر یہی صہیونیت کے حامیوں نے یہ نقشہ بنایا کہ فلسطین کے وہ وارث ہیں اور یہاں سے عربوں کو بے دخل کرنا چاہیے۔

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کو اپنے مفادات سامنے تھے، اس کو خیال پیدا ہوا کہ اگر مصر اس کے اقتدار سے باہر ہوجائے گا تو نہر سویز پر اس کا قبضہ کس طرح رہ سکتا ہے، برطانیہ اسرائیلیوں کی طرف مائل ہوا جس کے بعد اعلان بالفور کیا گیا ہے، یہ پہلی بین الاقوامی دستاویز ہے جس سے جدید صیہونیت کو سہارا ملا، یہ اعلان ۲ رنومبر ۱۹۱۷ء میں ہوا، اس وقت فلسطین پر برطانیہ کا تو قبضہ نہیں تھا لیکن اس اعلان میں وعدہ کیا گیا کہ فلسطین یہودیوں کا ایک قومی وطن بنا دیا جائے گا، پہلی جنگ عظیم کے صلحنامہ کے زمانہ میں صیہونیت کے حامیوں نے یہ نقشہ بنایا کہ فلسطین کے عرب اپنی سرزمین اور جائداد سے کس طرح دربدر کیے جا سکتے ہیں، اس میں ان کو برطانیہ کی پوری حمایت حاصل ہوئی، عربوں نے اس کی مخالفت کی، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۹ء تک کا زمانہ بڑے ہیجان اور تشدد کا رہا، فلسطین میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے، بغاوتیں ہوئیں۔

ممکن تھا کہ اس کا کوئی حل نکل آتا، لیکن اسی زمانہ میں جنگ چھڑ گئی جس سے ساری دنیا مصیبت میں مبتلا ہوگئی، برطانیہ نے عربوں سے بہت کچھ وعدے کر رکھے تھے، جن کی روشنی ہی میں برطانوی حکمت عملی کی تشکیل ہونی چاہیے تھی، اور برطانیہ نے کوئی مصالحت کرانا بھی چاہا لیکن اس کی کوشش اس لیے بار آور نہیں ہو سکی کہ ہٹلر کی نازی ازم کی وجہ سے سارے یہودی جرمنی سے جلاوطن کر دیے گئے۔

دوسری جنگ عظیم میں مشرق وسطیٰ میں بھی نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے، صیہونیت کی سرگرمیاں یورپ سے منتقل ہو کر امریکہ میں منتقل ہوگئیں، امریکہ اس وقت تک

بین الاقوامی سیاست میں ناتجربہ کار تھا، اس کا بین الاقوامی شعور بھی خام تھا، اس کی خارجہ پالیسی پر جماعتوں اور امریکن ازم کا دباؤ پڑتا رہا، صیہونیت کے امریکہ میں منتقل ہو جانے سے یہ مسئلہ زیادہ سنجیدہ ہو گیا، وہاں صرف دو پارٹیاں ہیں جن کے رہنماؤں نے یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر اس مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ کر دیا،

امریکہ میں صیہونیت کو زیادہ فروغ ہوا، امریکی یہودی سب کے سب صیہونیت کے حامی نہیں ہیں، لیکن صیہونیت کے حامی ہی یہودیوں کے بھی رہنما بن گئے، اور یہ رہنما زیادہ تر روس اور مشرقی یورپ کے تھے، جو روسی اور مشرقی یورپی روایات کے پابند بن کر رہے، یورپ میں دوسری جنگ عظیم میں جو المناک واقعات ظہور پذیر ہوئے تو مذکورہ بالا صیہونی رہنماؤں کی قیادت میں ۱۹۴۲ء میں بلٹمور کانفرنس ہوئی، اور ان رہنماؤں نے عربوں سے مقاطعہ کی پالیسی اختیار کی، اور فلسطین کو یہودیوں کی ریاست بنانے کا مطالبہ کیا،

دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو پرانے امپائر کا خاتمہ ہو گیا، لیکن روس اور امریکہ کی دو بڑی قوتیں سامنے آئیں، جن پر دنیا کی ساری ذمہ داریاں آگئیں، دنیا کے جمہوری حصوں پر تو امریکہ اور کمیونسٹوں کے علاقوں پر روس کے اثرات ہو گئے، لیکن اسی کے ساتھ ادارۂ اقوام متحدہ بھی وجود میں اس لیے آیا کہ وہ تمام لوگوں میں مساوات، خود اختیاریت اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے احترام کا جذبہ پیدا کرے، اقوام متحدہ کو نسبتاً زیادہ کامیابیاں ہوئیں، اگر دنیا میں ایک طرف سرد جنگ شروع نہ ہوئی ہوتی اور دوسری طرف ماضی کے پرانے امپائر کو کچھ دنوں اور بڑھا کر باقی رکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہوتی، ادارۂ اقوام متحدہ ابھی بالکل ابتدائی دور ہی میں تھا کہ

اس کو فلسطین جیسے بہت بڑے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔

اس ادارہ نے اس مسئلہ کو ایک ناتجربہ کار مبتدی کی طرح نپٹایا، اور پھر اس پر ہر طرح کا دباؤ بھی پڑا، جیسا کہ صدر ہیری ایس۔ ٹرومین اور دوسرے امریکنوں کی خود نوشتہ سوانح عمریوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا، اس ادارہ کی سب سے پہلی لیکن عظیم ترین غلطی یہ ہوئی کہ اس کے ذریعہ فلسطین کی تقسیم ہوگئی، جو سراسر ناانصافی پر مبنی ہے، جب یہ تقسیم ہوئی تو عربوں کی آبادی ۶۶ فی صدی تھی، اور صیہونی صرف ۳۳ فی صدی تھے۔ یہ ۱۹۴۷ء کے اعداد و شمار ہیں، ۱۹۲۰ء میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب ۱۰ فیصدی تھا، اور عرب ۹۰ فی صدی تھے، ۱۹۴۷ء میں عربوں کی ۶۲ فی صدی آبادی کو ملک کا ۴۳ فی صدی حصہ ملا، اور ۳۳ فی صدی آبادی والوں کو ملک کا ۵۶ فی صدی دیا گیا، اور پھر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یہودیوں کی ریاست میں چار لاکھ نوے ہزار تو یہودی تھے، لیکن ان کے ساتھ چار لاکھ ستانوے ہزار عرب بھی کر دیے گئے، (ایک ہزار کا فرق دونوں میں رکھا گیا، پھر عرب کے حصہ میں آنے والی ریاست میں سات لاکھ چوبیس ہزار تو عرب تھے، لیکن دس ہزار یہودی تھے، اس طرح متمدن دنیا کی دعائے خیر کے ساتھ فلسطین سے عربوں کے اخراج کی مہم کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

اسرائیل کی ریاست ۱۵ ارمئی ۱۹۴۸ء کو وجود میں آئی، لیکن اسی زمانہ میں ساڑھے تین لاکھ عرب فلسطین سے باہر آتے ہوئے دکھائی دیے، قبل اس کے کہ ادارۂ اقوام متحدہ ان کی مدد کو پہنچے، راشن کارڈ کے حساب سے ان پناہ گزینوں کی تعداد نو لاکھ ۳ ہزار تین سو ہوگئی۔

اسرائیل ۵۶ فی صدی علاقہ لے کر قانع نہیں ہوا، یہ عربوں کو بے دخل کر کے

۴۰ فی صدی علاقہ اور چاہنے لگا، یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں عربوں نے اپنے گھر بار کو کیوں چھوڑ دیا؟ لیکن اس سوال کا جواب اس سوال سے ہو سکتا ہے کہ آخر وہ اپنے گھروں کو واپس کیوں نہیں گئے؟ اگر اس دوسرے سوال کا جواب مل جائے تو پہلے سوال کا جواب خود بخود مل جائے گا۔

ادارۂ اقوام متحدہ میں اسرائیل کے حامی کہتے ہیں کہ یہودیوں نے یورپ میں بڑی سختیاں جھیلیں، یہ بالکل صحیح ہے، میں بھی یہی کہتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ یورپ کے عیسائیوں نے ان پر مظالم کیے تو پھر ان کا بدلہ فلسطین کے عربوں سے کیوں لیا جائے؟ یہودیوں کو یورپ میں کس کس طرح نہ ستایا گیا، یہ کھلی ہوئی تاریخ ہے، ہٹلر کے زمانہ میں یہ مظالم انتہا کو پہنچ گئے، صیہونیت کی تحریک کا آغاز ہٹلر سے پہلے بھی ہو چکا تھا، اس لیے اس کے علمبرداروں کو یہ موقع مل گیا کہ یورپ سے یہودی نکالے گئے ہیں تو پھر فلسطین سے عرب نکالے جائیں، تاکہ جو یہودی یورپ کے مجنونانہ تعصب کے شکار ہوئے ہیں، وہ آباد ہو سکیں، اب مسئلہ ہے تو یہی ہے، سرحدوں کا جھگڑا در اصل نہیں ہے، اور نہ عقبہ، طیران، سویز اور ناصر کے تنازعے ہیں، مسئلہ عربوں کے بے دخل ہونے کا ہے، اور یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے، جو سیاست اور جنگ کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتا، اسرائیل جنگ کے ذریعہ فرات سے نیل تک ایک امپائر قائم کر لینے میں کامیاب ہو گیا، تو اسکی سامی نسلوں کی مخالفت جاری رہے گی، کیونکہ اس کے سکہ کے دوسرے رخ پر یہی مخالفت منقوش ہے، اور یہ صیہونیوں کی علوگی پسندی کا نتیجہ ہے۔

فلسطین میں امن قائم ہونے کے امکانات ابھی دور ہیں، صیہونیوں میں یہ رجحانات نہیں پائے جاتے ہیں کہ وہ عربوں کو ان کی سرزمین سے بے دخل نہ کریں، یہ مسئلہ ان بڑی طاقتوں

کی وجہ سے اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے، جو اسرائیل کے عزائم کو پورا ہونے سے روک سکتے ہیں، لیکن وہ جس قسم کے سیاسی اسباب کی بنا پر ان کو روکنا نہیں چاہتے ہیں، عرب کے ساتھ جو تھوڑا بہت انصاف کر دیا جاتا ہے، اس سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ عرب ابھی کمزور ہیں، ان میں اتفاق نہیں، وہ شکست کھا کر ذلیل اور پریشان ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بچھڑے ہوئے ہیں، لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایسے ہی برابر رہیں گے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دنیا کی رائے عامہ ان کے موافق نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عرب پناہ گزینوں کے زخم پر کتنا ہی پھایا رکھ دیا جائے۔ اور عرب اس انسانیت نوازی کو اچھی نظر سے دیکھنے بھی لگیں، ان کے پناہ گزینوں کی خواہ کتنی ہی مدد کی جائے عرب اس ناانصافی کو بھول نہیں سکتے جو ان کے ساتھ کی گئی ہے، میری رائے میں اس ناانصافی کو دور، اپنے زخم کو مندمل، اور ایک بڑی غلطی کی تلافی کرنے کی خاطر یہ عرب برابر جدوجہد کرتے اور لڑتے رہیں گے، اور مجھکو اس میں شبہہ نہیں کہ آخر میں وہ اس ناانصافی کو دور کرنے میں کامیاب ہو کر رہیں گے، گو میں اس وقت تک اس نتیجہ کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہوں، لیکن میری اولاد اور میری اولاد کی اولاد دنیا کے اس حصہ کی طویل تاریخ میں اسرائیل کی عبرتناک کہانی کا مطالعہ ضرور کر رہی ہوگی۔ "ص ع"

باب التقریظ والانتقاد

تدبر قرآن جلد اول

از مولانا امین احسن اصلاحی تقطیع بڑی ضخامت ۷۳۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت اعلیٰ، جلد خوشنما مطلّیٰ، قیمت تیس ۳۰ روپئے، پتہ: دار الاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور

ہمارے فاضل دوست مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے ارشد تلامذہ میں ہیں، تفسیر کے درس و تعلیم میں انھوں نے تمامتر ان ہی سے استفادہ اور برسوں خود بھی اس پر غور و فکر کیا ہے، اس لیے ان کو تفسیر لکھنے کا حق تھا، اور حق یہ ہے کہ انھوں نے اس کا پورا حق ادا کیا ہے، اور بڑی دقت و وسعت نظر اور ایمانی جذبہ سے یہ تفسیر لکھی گئی ہے، جو ان کی برسوں کی محنت اور غور و فکر کا نتیجہ اور ہر حیثیت سے جامع و مکمل ہے، یہ حصہ سورہ بقرہ اور آل عمران کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس میں آیات کے جملہ اہم تفسیری پہلوؤں اور ان کے متعلقات کا احاطہ اور ان کے مفہوم و منشا کو اس خوبی سے واضح کیا گیا ہے کہ ان کی روح سامنے آجاتی ہے،

اسلام، مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ سب کے لیے چیلنج تھا، یہودیوں کی دینی سیادت پر خاص طور سے اس کی زد پڑتی تھی، اس لیے دعوت اسلام کے آغاز میں ان سب کے ساتھ مسلمانوں کے اختلافات اور معرکے پیش آئے، بقرہ اور آل عمران میں ان کا ذکر ہے، فاضل مفسر نے ان آیات کی تفسیر اس انداز سے کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے نتائج، دین ابرہیمی اور اس میں یہود و نصاریٰ

کی تحریفات اور ان کی بداعمالیوں کی پوری سرگذشت سامنے آجاتی ہے، ان واقعات میں جابجا توراۃ و انجیل کے حوالے بھی ہیں اور کلام مجید کے بیان کی روشنی میں ان کی تحریفات کی تصحیح کی گئی ہے انداز بیان نہایت مؤثر و دلنشین ہے، البتہ کہیں کہیں تفصیل اطناب کی حد تک پہنچ گئی ہے لیکن طرز تحریر کی دلنشینی سے مل نہیں ہونے پائی ہے،

کلام مجید کی آیات اور سورتوں میں ربط مصنف کا خاص موضوع ہے، اس لیے اس تفسیر میں اس کا خاص طور سے اہتمام رکھا گیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ آیات کی گروپ بندی سے ایک گروپ کی آیات میں بڑی حد تک ربط پیدا ہو گیا ہے لیکن ہر جگہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، بعض آیات میں اتنا بعید ربط پیدا کیا گیا ہے کہ اس قسم کا ربط اضداد میں بھی پیدا کیا جا سکتا ہے، لیکن اردو تفسیر میں یہ پہلی کوشش ہے، اس لیے لائق تحسین ہے۔

لیکن کسی مصنف کے خیالات سے سو فیصدی اتفاق ضروری نہیں ہے، اور نہ کسی کتاب کے متعلق فروگذاشتوں سے یکسر پاک ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے، اس لیے اس تفسیر کی بعض چیزیں بھی نگاہ میں کھٹکتی ہیں، خاص طور سے جہاں فاضل مفسر نے عام مفسرین سے اختلاف کیا ہے یا کسی عام مفہوم کی تحدید کر دی ہے، مثلاً حضرت مریمؑ کے ذکر میں "كلما دخل عليها زكريا المحراب وجد عندها رزقا" میں رزق کو حکمت و معرفت کے معنی میں محدود کر دیا ہے، حالانکہ قدیم و جدید دونوں مفسرین کی اکثریت نے رزق کی تفسیر میووں سے کی ہے، چنانچہ ابن جریر نے تقریباً تمام روایتیں اسی معنی کی نقل کی ہیں (تفسیر ابن جریر، ج ۱ اول ص ۱۵۳ - ۱۵۲)، ابن کثیر نے دونوں قسم کی روایتیں نقل کر دی ہیں (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۰) اردو کے سب سے بڑے مترجم و مفسر قرآن شاہ عبدالقادر صاحب نے رزق کا ترجمہ "میوہ بے بہار" کیا ہے، (موضح القرآن ص ۷۵) اس لیے رزق کے معنی کو حکمت و معرفت کے معنی میں محدود کر دینا صحیح نہیں ہے بلکہ مادی اور روحانی دونوں رزق کے لیے عام رکھنا زیادہ مناسب ہے، اس سے حضرت مریمؑ کی عظمت زیادہ نمایاں ہوتی

اسی طریقہ سے "الا ان تتقوا منھم تقاۃ" کا ترجمہ کیا گیا ہے "ان (کفار کی موالات) سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے"۔ اور اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "اس سے جن لوگوں نے تقیہ کا جواز نکالا ہے انھوں نے لغت، نظائر قرآن اور سیاق و سباق ہر چیز کو نظر انداز کر دیا ہے"۔ مصنف کے ترجمہ پر اعتراض نہیں ہے، جو لوگ تقیہ کے جواز کے قائل نہیں ہیں، ان کے لیے یہ ترجمہ بھی صحیح ہو لیکن یہ کہنا کہ جن لوگوں نے اس آیت سے تقیہ کا جواز نکالا ہے، انھوں نے لغت، نظائر قرآن، اور سیاق و سباق ہر چیز کو نظر انداز کر دیا ہے، صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ابن جریر، ابن کثیر اور دوسرے قدیم و جدید مفسرین نے اس سے تقیہ کا جواز نکالا ہے، جن کے متعلق مذکورۂ بالا چیزوں کو نظر انداز کر دینے کا گمان صحیح نہ ہوگا، البتہ تقیہ کے مفہوم اور حدود میں اختلاف ہو سکتا ہے، ابن جریر اور ابن کثیر صرف اس صورت میں تقیہ کے جواز کے قائل ہیں جب کوئی مسلمان کفار کے قبضہ میں ہو، اور ان سے جانی یا کسی قسم کے بڑے نقصان کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں دل میں کفار کی نفرت و عداوت کو قائم رکھتے ہوئے، ان سے ظاہری مدارات کی اجازت ہے، اور اس کی تائید میں دونوں نے روایتیں نقل کی ہیں، ابن کثیر نے حضرت ابو درداؓ کی بخاری کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "ہم بعض لوگوں کی ظاہری مدارات کرتے ہیں لیکن ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے ہیں" (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن جریر ج ۳ ص ۱۴۱ و ابن کثیر ج ۱ ص ۳۵۷)۔ اردو مفسرین میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ انھوں نے اس آیت کا ترجمہ "مگر ایسی صورت میں کہ تم ان (کفار) سے کسی قسم کا اندیشہ رکھتے ہو" کیا ہے، اور اپنی تفسیر میں اس مسئلہ پر پوری بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار سے دلی موالات کسی حال میں بھی جائز نہیں لیکن ظاہری مدارات تین صورتوں میں درست ہے، ایک دفع ضرر کیلئے، دوسرے کافر کی مصلحت دینی توقع ہدایت کے لیے، تیسرے اکرام ضیف کے لیے، اس آیت (یعنی الا ان تتقوا منھم تقاۃ) میں اسی دفع ضرر کی حالت کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور اس سے مراد

مدارات ہے، جس کو صورۃ موالات میں داخل کرکے مستثنیٰ منہ قرار دیا گیا ہو (بیان القرآن ج ۲ ص ۱۱)
لیکن یہ جواز صرف مجبوری کی حالت کے لیے ہو جب کفار سے جانی یا کسی بڑے نقصان کا اندیشہ ہو،
اس سے مراد مروجہ تقیہ نہیں ہے کہ اس کو زندگی کا معمول بنا لیا جائے، مولانا اشرف علی صاحب نے
بھی اس شبہہ کو ان الفاظ میں دور کیا ہے، "بعض لوگوں کو اس آیت میں تقیہ متعارفہ شیعہ کے جواز
کا شبہہ ہوتا ہے، اس کا دفع یہ ہے کہ اس آیت کو اس تقیہ سے اصلاً مس نہیں ہے، کیونکہ آیت
ہذا میں خوف و ضرر کے وقت دوستی کے اظہار اور عداوت کے اخفا کا ذکر ہے اور تقیہ متعارفہ میں
کفر کا اظہار اور ایمان کا اخفا ہوتا ہے (ایضاً) البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اجازت اصحاب رخصت
کے لیے ہے، ارباب عزیمت کی ہمت خود اس کو گوارا نہ کرے گی،

بعض مقامات پر ترجمہ خلاف احتیاط نظر آیا، مثلاً لن یضروکم الا اذی کا ترجمہ کیا گیا ہے
"تمھیں تھوڑی سی زبان درازی کے سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے" مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ
غلط نہیں ہو لیکن محدود ہے، اس کا ترجمہ "چھوٹی چھوٹی تکلیفیں" زیادہ مناسب ہے جس میں کفار کی زبان درازی
بھی داخل ہے، اسکی وضاحت تفسیر میں کیجا سکتی تھی، یا قوسین میں اس کو لکھ دیا جاتا، جیسا کہ شاہ عبد القادر صاحب
نے کیا ہے، مولانا اشرف علی صاحب نے بھی اس کا ترجمہ "خفیف اذیت" کیا ہے، اور قوسین میں "برا بھلا کہہ کر
دل دکھانا" لکھکر اس کی وضاحت کردی ہے، (بیان القرآن ج ۱ ص ۸۳)، لیکن یہ کوئی غلطی نہیں ہے
بلکہ صرف خلاف احتیاط فروگذاشت ہو جس سے ترجمہ میں تحریف کا اندیشہ رہتا ہے، مثلاً اگر کوئی
شخص تدبر قرآن کے اس ترجمہ کا ترجمہ کسی زبان میں کرے تو لامحالہ زبان درازی کا ترجمہ کرے گا
جو اصل لفظ سے دور ہو جائے گا، اس لیے اس میں احتیاط کی ضرورت تھی، اس قسم کے بعض اور ترجمے
بھی ہیں؛ چنانچہ ایک سے زیادہ مقامات پر مفسر نے آیت کے کسی لفظ کا ایک خاص مفہوم لیکر ترجمہ کردیا ہے،
اور تفسیر میں اس کی وضاحت بھی کردی ہو کہ ہم نے ترجمہ میں اس مفہوم کا لحاظ رکھا ہے۔

مگر یہ خفیف فروگذاشتیں زیادہ لائق التفات نہیں، البتہ ایک مقام پر مصنف یا اپنا مفہوم و منشا واضح نہ کر سکے یا راقم سمجھنے سے قاصر رہا، وہ لکھتے ہیں :۔

ہماری نمازوں کے اندر یہ شان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی نمازوں کی شان) باقی نہیں ہے

اب نمازیں صرف رسم داری کی نوعیت کی چیز بن گئی ہے اور زندگی سے اسکا کوئی تعلق باقی نہیں رہا"

یہاں تک تو ٹھیک ہے، واقعی اب ہماری نمازیں محض ایک بے روح رسم بن گئی ہیں اور ہمارے اعمال پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے لیکن اس کے بعد کی اس عبارت کا منشا سمجھ میں نہیں آیا :۔

"اب ہم نمازیں تو بے جان اور بے روح پڑھتے ہیں اور لمبی لمبی دعائیں نمازوں سے فارغ ہو کر مانگتے ہیں، حالانکہ مانگنے کا اصل وقت نمازوں میں ہوتا ہے جبکہ بندہ اپنے رب کے حضور میں ہوتا ہے۔" (ص ۲۸۲)

اگر اس سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ نماز تو خود ہی دعا ہے اس لیے اس میں اخلاص و خشوع پیدا کرنا چاہیے تو یہ درست ہے۔ یہ بعض ائمہ کا مسلک بھی ہے کہ نماز خود دعا ہے، اس لیے فرض نماز کے بعد کسی اجتماعی دعا کی ضرورت نہیں لیکن دعا کو نماز کے اندر محدود کر دینے میں اس کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے، جس سے دعا کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ اس میں بعض اور پیچیدگیاں بھی ہیں مثلاً نماز میں افتتاح تشہد اور اختتام کی حدیث کی دعاؤں کے علاوہ اور کوئی چیز قرآن کے علاوہ نہیں پڑھی جا سکتی[1]، اس لیے نماز کے اندر دعا کی شکل صرف یہی ہے کہ کلام مجید کی دعائیہ آیات پڑھی جائیں، اور بعض آیات ایسی ہیں جن میں اجمالی طور پر دین و دنیا دونوں کی بھلائی کی دعا آجاتی ہے، مگر ان میں تفصیل سے ان تمام احتیاجوں اور ضرورتوں کا احاطہ نہیں ہے، جو انسانی زندگی میں پیش آتی ہیں یا ایک انسان جن کی جائز تمنا کر سکتا ہے، یہ کمی حدیثوں کی دعاؤں سے پوری ہوتی ہے، ان میں

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اندر جس قدر دعائیں منقول ہیں وہ سب افتتاح یا اختتام نماز کی ہیں، بعض روایتوں میں سجدہ کی بھی دعائیں ہیں لیکن محدثین کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ دعائیں آپ نفل نمازوں میں پڑھتے تھے۔ (زاد المعاد)

بکثرت ایسی دعائیں ہیں جن میں ان تمام چیزوں کا احاطہ ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دعاؤں کو نمازوں کے بعد مانگتے تھے، فرض نمازوں کے بعد کی دعائیں تو متواتر روایتوں سے منقول ہیں اور ان پر امت کا مسلسل عمل چلا آرہا ہے، اس لیے علما نے سہولت کے خیال سے ان دعاؤں کے مجموعے مرتب کر دیے ہیں،

یا اگر کوئی شخص اپنی زبان میں دعا مانگنا چاہے تو وہ نماز میں کس طرح مانگ سکتا ہے، یوں تو دعا کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے لیکن خاص خاص اوقات، مقامات، ایام اور حالات میں دعائیں زیادہ مقبول ہوتی ہیں، ان میں سے ایک وقت فرض نماز کے بعد کا بھی ہے، اس لیے یہ کہنا کہ "دعا کا اصل وقت نماز میں ہوتا ہے اور لوگ اس کے بعد لمبی لمبی دعائیں مانگتے ہیں" کہاں تک صحیح ہے، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری نمازوں کی طرح ہماری دعائیں بھی بے جان ہیں، اس لیے نماز میں اخلاص، حضور قلب اور خشوع و خضوع اور دعا میں حقیقی ابتہال و تضرع پیدا کرنے کی ضرورت ہے، دعا تو خود بڑی عبادت اور اس کی اصل روح ہے "الدعاء مخ العبادۃ"، عبادت بھی درحقیقت دعا ہی ہے، اس لیے سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ انسان ہمہ تن دعا بن جائے۔

اس تحریر کا مقصد خوردہ گیری نہیں بلکہ جو چیزیں نگاہ میں کھٹکیں ان کو بیان کر دینا مناسب معلوم ہوا، مگر اس قسم کی فروگذاشتوں سے کتاب کی خوبی میں فرق نہیں آتا، وہ اپنی جگہ پر مسلم اور مصنف کا بڑا کارنامہ ہے، اس سے اردو تفسیر کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہوا اور وہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

ہندوستان کی کہانی

ہندوستان کی یہ مختصر تاریخ نہایت آسان اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے، تاکہ ہمارے مکتبوں اور ابتدائی مدرسوں کے طلبہ اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکیں۔

قیمت: ۶ ... منیجر

مطبوعات جدیدہ

العطایا النبویۃ فی الفتاوی الرضویۃ

از مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۴، قیمت تحریر نہیں۔

پتہ :- سنی دار الاشاعت مبارک پور، اعظم گڈھ۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی مرحوم اس دور کے صاحب علم و نظر علما، ومصنفین میں تھے، دینی علوم خصوصاً فقہ وحدیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، چند سال پہلے انکے فتاوی کی تیسری جلد پر معارف میں تبصرہ شائع ہوچکا ہے، یہ چوتھی جلد ہے، جو جنائز، زکوۃ، صوم اور حج کے متعلق تقریباً ساڑھے چار سو مسائل پر مشتمل ہے، ان ابواب کے متعلق مولانا کے بعض مستقل رسالے اور کئی کئی صفحے کے طویل فتوے بھی اس میں شامل ہیں، مولانا نے جس وقت نظر اور تحقیق کے ساتھ جواب تحریر فرمائے ہیں اس سے ان کی جامعیت، علمی بصیرت، فقہی جزرسی، استحضار، ذہانت اور طباعی کا پورا اندازہ ہوتا ہے، مگر اس جلد کا نصف حصہ جنائز پر مشتمل ہے جس کے متعدد مسائل میں دوسرے طبقہ کے لوگوں کو مولانا کے فتاوی سے کلی اتفاق نہیں ہوسکتا، اور انھوں نے خود اس قسم کے جزئی اور فرعی مسائل کے سلسلہ میں دوسروں کی تفسیق وتکفیر کی ہے، ایک طرف انکی شدت پسندی کا یہ حال ہے کہ شافعی المذہب امام کی اقتدا یا جہریہ دوبارہ یا غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کو وہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللہ کے تحت معصیت قرار دیتے ہیں، دوسری طرف توسع کا یہ حال ہے کہ جن چیزوں کے بارہ میں کوئی صراحت موجود نہیں ہے، ان کے جواز پر اصرار کرتے ہیں، مثلاً جنازہ کے ساتھ

ذکر جہر کو جو خود ان کی تصریح کے مطابق حنفی مذہب میں بھی مکروہ ہے، یا ممنوع اوقات میں عوام کو نماز پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں (ص ۵) تاہم ان کے بعض فتووں سے انکی انصاف پسندی بھی ظاہر ہوتی ہے، مثلاً ص ۲۰۰ پر اس طبقہ میں جس کے وہ نمائندہ ہیں، بعض مروج چیزوں کو شرعاً لازم سمجھنے کو عقیدۂ فاسد اور بعض کو ممنوع قرار دیتے ہیں، کتاب کی ترتیب و تبویب کا انداز قدیم ہے، نہ حوالوں کی تخریج کی گئی ہے اور نہ مکررات کو حذف کیا گیا ہے، مولانا کے تکفیری آراء و اقوال سے قطع نظر انکے یہ عالمانہ و محققانہ فتاوے مخالف و موافق ہر طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہیں، اس ضخیم مجموعہ کی اشاعت پر ناشر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

فتاویٰ رحیمیہ جلد اول:- افادہ مولانا حافظ قاری مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۰۰ مجلد قیمت دس روپئے۔
پتہ: عطرستان، چوک بازار، سورت، گجرات۔

یہ مجموعہ حضرت مولانا سید عبدالرحیم صاحب خطیب بڑی جامع مسجد راندیر ضلع سورت کے فتاویٰ پر مشتمل اور گجراتی زبان سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے، اسکی دوسری جلد ابھی زیر طبع ہے، پیش نظر جلد اول میں کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ (عیدین، تراویح اور جنائز) شامل ہیں، اردو زبان میں فتووں کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اس مجموعہ کی اشاعت سے اس ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے، فاضل مفتی نے ہر ہر مسئلہ کا مدلل اور محققانہ جواب تحریر کیا ہے، حوالہ کے ساتھ عبارت بھی نقل کی ہے اور صرف فقہ کی کتابوں ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اکثر جوابات میں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کی طرح قرآن و سنت اور صحابہ کا تعامل بھی بیان کیا ہے، اور اس کے نظائر پیش کیے ہیں، جوابات میں اتنی تفصیل اور تنقیح کی گئی ہے کہ مسئلہ کے تمام متعلقات سامنے آجاتے ہیں، عموماً فتاویٰ کی زبان خشک اور مصطلحاتِ فن سے بوجھل ہوتی ہے، لیکن اس مجموعہ

زبان نہایت سلیس ہے، اور اس کے مطالعہ سے ایک لذت وحلاوت اور روحانی کیفیت محسوس ہوتی ہے، جو غالبًا مصنف کی باطنی کیفیت کا اثر ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اتنے مسائل میں ہر شخص کا مجیب کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے، جہاں غیر مقلدین اور علمائے بریلی کے فتووں پر رد وقدح کی گئی ہے وہاں لب ولہجہ میں شدت آگئی ہے،

گل نو:۔ مرتبہ جناب واحد پریمی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴ مجلد مع گرد پوش قیمت ۶ر پتہ: مکتبہ صبح ادب نزد مسجد ٹولوالی بھوپال ۱۱

جناب واحد پریمی بھوپال کے نوجوان اور خوشگو شاعر ہیں، یہ مجموعہ انکی غزلیات پر مشتمل ہے، مصنف میں شعر وسخن کا ذوق ستھرا ہے، اور انکے خیالات میں تازگی اور طرز ادا میں سادگی ودلکشی ہے، انھوں نے کہیں کہیں سیاسی حقایق اور موجودہ زمانہ کے حالات کی عکاسی اور غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کی حکایت کی ہے لیکن یہ مصنف کا پہلا مجموعہ ہے، اسلیے بعض خیالات میں عدم پختگی اور زبان و بیان کی معمولی خامیاں بھی ہیں، جو مشق وریاض اور مطالعہ سے دور ہو جائیں گی۔

کفاک علما بالعربیۃ حصہ دوم وسوم:۔ مرتبہ مولانا عبدالحمید نعمانی متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۳۰ قیمت ۶۲ پیسے و ۲۵ ر ۲ پیسے۔ پتہ مدرسہ طت مالیگاؤں ضلع ناسک و کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار دہلی ۱۱

مولانا عبدالحمید نعمانی نے عربی کے مبتدی طلبہ کے لیے ایک مفید عربی ریڈر لکھی ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ کا ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، یہ دوسرا اور تیسرا حصہ ہے، مصنف کو تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف دونوں کا اچھا سلیقہ اور پورا تجربہ ہے، اس لیے طلبہ کے ذوق واستعداد کے مطابق ان میں مشق وتمرین کے ساتھ عربی کے مبادیات اور ضروری قواعد مفید انداز میں لکھے ہیں، یہ عربی ریڈر عربی مدارس کے نصاب میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔

"ض"

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: عہ؍

۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) " ہے؍

۳۔ اسوۂ صحابیات: " عاؔ؍

۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کے خصوصیات کی تفصیل: قیمت: غلہ؍

۵۔ حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: غلہ؍

۶۔ حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: سعہ؍

۷۔ شعرالہند (حصہ اول) " غلہ؍

۸۔ شعرالہند (حصہ دوم) " لعہ؍

۹۔ انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ؍

۱۰۔ سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیر طبع)

۱۱۔ امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور ان کی تصنیفات: قیمت عہ؍

۱۲۔ ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی فلسفۂ خودی کی تشریح، اور ان کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ہے؍

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی و تاریخی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ان کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات: ۲۴۶ قیمت: عہ؍ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(ایڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ ازاد و بوم سرتاپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اُن کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اُس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور اُن کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخِ اسلام میں اُن کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور اُن کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، اُن کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون اُن کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۲۳۰ صفحے، قیمت :- ۵ر

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتابت اقبال احمد

جلد ۱۰۴ - ماہ رجب المرجب ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء - عدد ۴

مضامین

مقالات

اثار علمیہ

شذرات

گاندھی جی کی ولادت کی صد سالہ یادگار مختلف ملکوں میں منائی جائے گی، ہندستان میں ان کی یادگار میں بڑے بڑے جلسے ہوں گے ان میں لمبی چوڑی تقریریں ہوں گی، ان پر مضامین اور کتابیں لکھی جائیں گی، اخبارات اور رسالے خاص نمبر نکالیں گے، گاندھی جی کے مجسمے نصب کیے جائیں گے، ان کے یادگاری ٹکٹ جاری ہوں گے، اور مختلف قسم کی یادگاریں قائم کیجائیں گی، گاندھی جی کی عظمت اور انکے کارنامے بلاشبہہ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں مگر یہ یادگار منانا اس وقت زیب دیتا جب گاندھی جی کی تعلیمات پر عمل اور ان کا کچھ بھی پاس و لحاظ ہوتا، وہ اخلاق و روحانیت، حق و صداقت اور عدل و مساوات کے بہت بڑے مبلغ تھے، ان کی نگاہ میں بلا تفریق مذہب و ملت ہندوستان کے سارے باشندے برابر تھے، وہ ہر قسم کے تعصب و تنگ نظری کے خلاف تھے، اور عمر بھر ان سے جنگ کرتے رہے، اور اس راہ میں جان تک دیدی، وہ ہندوستان کو صحیح معنوں میں جنت نشان بنانا چاہتے تھے جس میں ہر فرد کو امن و خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں،

لیکن ان کے اس خواب کی تعبیر الٹی نکلی، ان کے نام لیواؤں تک نے انکی تعلیمات کو بھلا دیا، پورا ملک صوبائی، لسانی اور مذہبی تعصب و تنگ نظری میں مبتلا ہے، آئے دن کے ہنگاموں نے ملک کا امن و سکون غارت کر دیا ہے، اچھوتوں کی پستی اور درماندگی کا وہی حال ہے، اقلیتوں کا

جان و مال محفوظ نہیں، فسادوں کا ایک سلسلہ قائم ہے جن میں ہزاروں قیمتی جانیں ضائع اور کروڑوں کی املاک تباہ و برباد ہوتی ہیں، ہر پارٹی حکومت و اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہے، ملک کے مفاد کی کسی کو فکر نہیں، حکومت اور کانگریس دونوں ان حالات پر قابو پانے سے قاصر ہیں، اور اس کے خلاف صرف زبانی بیان دیدینا کافی سمجھتے ہیں، ان حالات میں ہم کو گاندھی جی کی یادگار منانے کا کیا حق ہے، اور ہمارے پاس انکی یادگار میں پیش کرنے کے لیے بیگناہوں کے قتل و خونریزی، انکی تباہی و بربادی اور یتیموں اور بیواؤں کے آنسوؤں کے سوا کیا ہے، ہم ساری دنیا کو تو امن اور شانتی کا پیام سناتے ہیں اور اپنے گھر کی خبر نہیں۔ ع

تو درون درچہ کردی کہ برون خانہ آئی

اس سے نہ صرف ملک کا نقصان ہوتا ہے، بلکہ پوری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہوتی ہے۔ رباط کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ساتھ جو نازیبا سلوک ہوا وہ اگرچہ پاکستان کی مخالفت کا نتیجہ ہے لیکن اگر احمد آباد کا واقعہ تازہ نہ ہوتا تو شاید اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوتی، ہم نے خان عبدالغفار خاں کو بڑے ذوق و شوق سے بلایا تھا، اور انکی آمد پر بڑے بڑے منصوبے ذہن میں تھے، لیکن احمد آباد اور دوسرے فسادات نے انکا رخ ہی بدل دیا، اور سرحدی گاندھی پر اس کا وہی اثر ہوا جو ایک سچے گاندھیائی پر ہونا چاہیے، جس پر ان کے بیانات اور ان کا ہر بات شاہد ہے، فرقہ پرست جب گاندھی جی کو نہیں مانتے تو خان عبدالغفار خاں کو کیا خاطر میں لائیں گے، لیکن کم سے کم کانگریس اور حکومت کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اگر ان کی آمد سے یہی فائدہ حاصل ہو جائے تو بہت بڑا فائدہ ہے، احمد آباد میں جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ ہوا ہے، اس کی مثال درندوں میں بھی نہ ملے گی، اس نے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھدیا ہے، کاش فتنہ پرستوں پر بھی اس کا اثر ہوتا،

گاندھی جی کی سب سے بڑی یادگار اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ گاندھی جی کی تعلیمات کو زندہ اور ان کے مشن کو پورا کیا جائے، وہ جن چیزوں کے خلاف عمر بھر جنگ کرتے رہے، پورے عزم و ہمت سے ان کو مٹانے کی کوشش کیجائے، انھوں نے آزاد ہندوستان کا جو نقشہ بنایا تھا، اس کے مطابق اس کی تعمیر کیجائے، گاندھی جی نے جن اصولوں پر عمل کرکے ہندوستان کا نام بلند کیا تھا، ان ہی کے ذریعہ اس کا نام اب بھی اونچا ہوسکتا ہے، ورنہ محض ان کا نام لینے اور ان کی یادگار منانے سے کچھ حاصل نہیں،

رباط کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ساتھ جو نازیبا سلوک ہوا، اُس سے ہر ہندوستانی کو تکلیف پہنچی، اور وہ مہمانی اور میزبانی کے اسلامی آداب و تہذیب کے سراسر خلاف ہے، اس کانفرنس سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں، وہ بھی پوری نہ ہوئیں، اور اس نے رسمی تجویزوں کے آگے قدم نہیں بڑھایا جس کا کچھ حاصل نہیں، لیکن اس حیثیت سے کامیاب رہی کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک مقصد کے لیے اتنے اسلامی ملکوں کے نمایندوں کا اجتماع ہوا، اگر اس سے فائدہ اٹھایا جائے تو اس سے اسلامی ملکوں میں وحدت کی بنیاد پڑ سکتی ہے، یہ صحیح ہے کہ ہر ملک کے سیاسی حالات الگ الگ ہیں، لیکن ان کے علاوہ بہت سے مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل مشترک ہیں ان میں اس وحدت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس کانفرنس کو مستقل حیثیت دے دیجائے، اسلامی ملکوں کے مشترک مسائل پر غور و فکر اور تبادلۂ خیالات سب کے لیے مفید ہوگا۔

مقالات

عصامی اور اسکی تاریخ فتوح السلاطین

از جناب ڈاکٹر محمد عبدالمنان صاحب ریڈر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، دکن

عصامی علاء الدین حسن بہمن شاہ بانی سلطنت بہمنیہ کے عہد کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے مصنف اور اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر اور وسیع النظر مورخ تھے، فارسی کے قدیم تذکرے اس شاعر شیوا بیان کے ذکر سے خالی ہیں۔ مولف برہان مآثر نے بہمنیہ سلطنت کے ابتدائی واقعات کے بیان میں انکی منظوم تاریخ سے استفادہ کیا ہے[1]، اسی طرح صاحب تاریخ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں دو تین مقامات پر ان کی تصنیف کا حوالہ دیا ہے[2]، لیکن دونوں مورخوں نے نہ کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، اور نہ مصنف کے حالات پر اور نہ اپنی تاریخ کے مآخذ کی فہرست میں اس کو مقام دینا ضروری سمجھا، ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایسی اہم تاریخ اور اس دور کے فارسی ادب کی ایسی بے مثال ادبی تصنیف سے قدیم تذکروں اور تاریخوں کی غفلت اور کوتاہی بڑی افسوسناک ہے، شمال کے مورخوں میں تنہا نظام الدین احمد الہروی نے اپنی تاریخ "طبقاتِ اکبری" کے مآخذ کی فہرست میں اس کا نام لیا ہے، ان حالات میں ان کی زندگی اور اخلاق و عادات کے حالات میں ہمارا تنہا ماخذ ان کی تصنیف "فتوح السلاطین" ہی ہے۔

---

[1] برہان مآثر۔ ص ۲۵ [2] فرشتہ ۔ ج اول، مقالہ دوم، ص ۸۴

نام کی تحقیق "فتوح السلاطین" کے مصنف کے پورے نام سے ادبی دنیا ناواقف ہے، ان کے نام کے متعلق محققین کے بیانات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

(۱) ہرمن ایتھے[۱] نے اسپرنگر[۲] کے حوالے سے ان کا خواجہ عبدالملک عصامی نام ہونے کے امکان ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:-

"........ is probably identical with Khwaja Abdul Malik Isami mentioned by Sprenger"

ایک اور جگہ اس طرح کہا ہے:-

"فتوح السلاطین تالیف خواجہ عبدالملک عصامی"۔[۳]

ایتھے کی پیروی میں مہدی حسن[۴] نے بھی ان کا نام خواجہ عبدالملک عصامی بتلایا ہے،

(۲) عبدالغنی[۵] نے مجمع التذکار کے بیان کی بنیاد پر ان کا نام عصام الدین لکھا ہے:-

---

[۱] Catalogue of Persian Manuscripts in The Library of India office volume I P.(559

[۲] اسپرنگر نے کتب خانۂ شاہان اودھ کی فہرست میں عماد الدین محمود الٰہی حسینی کے تذکرۂ شعرا "خزینۂ گنج الٰہی" کے شعرا کے نام اور تخلص تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس کے بیان سے مذکورۂ بالا تذکرہ کے ورق (۸) پر خواجہ عبدالملک عصامی نام کے ایک شاعر کا ذکر ملتا ہے Sprenger's Oudh Catalogue No (11) P. 66

[۳] تاریخ ادبیات فارسی، تالیف ہرمن ایتھے، ترجمہ ڈکتر رضا زادہ شفق، صفحہ (۹۲)

[۴] The Muslim culture of Medieval India by Mahdi Hasan. Islamic culture. 1950 P 75

[۵] Pre-Mughal Persian in Hindustan by A. Ghani. P.294

[۶] فتوح السلاطین: مرتبہ سید یوشع (مدراس یونیورسٹی، مطبوعہ ۱۹۴۸ء، مقدمہ صفحہ[illegible]

(۴) پروفیسر سید یوشع مرتب "فتوح السلاطین" نے "النجوم العوالی فی ابناء الاوائل والتوالی" کے مصنف شیخ عبدالملک عصامی اور ایتھے کے بیان کردہ عبدالملک عصامی کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے، اس طرح فتوح السلاطین کو ان سے متعلق کرنے کی کوشش کی ہے:-

"گذشتہ ازیں یکے دیگرے باند کہ تغیر اسم شیخ عبدالملک عصامی است کہ تاریخی موسوم بہ "النجوم العوالی فی ابناء الاوائل والتوالی" در زبان عربی تالیف کردہ و یک نسخہ ازیں تاریخ در کتب خانہ آصفیہ محفوظ است، ممکن است کہ ہم آں خواجہ و ہم ایں شیخ یکے باشد، بلکہ عجب نیست کہ ایں عبدالملک عصامی از اولاد آں بنی عصام باشد کہ در ملتان توطن گزیدہ"

مذکورۂ بالا بیانات سے ہم صاحب فتوح السلاطین کے نام کے بارہ میں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے ہیں، ایتھے نے اسپرنگر کے حوالے سے جس "خزینۂ گنج الٰہی" کا ذکر کیا ہے، وہ تذکرہ اب ناپید ہے، ورنہ اس کے دیے ہوئے نمونۂ اشعار کی مدد سے "فتوح السلاطین" کے مصنف کا نام خواجہ عبدالملک عصامی قرار دینے میں مدد مل سکتی تھی، اس سلسلے میں دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سراج الدین علی خاں آرزو نے مجمع النفائس[۱] میں ایک شاعر خواجہ عبدالملک عصامی کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام دیا ہے، مگر اس کو انھوں نے اکابرِ سمرقند میں شمار کیا ہے، اور امیر تیمور کے زمانہ میں شیخ الاسلام اور مقتدائے انام کے لقب کے ساتھ ذکر کیا ہے، "خزینۂ گنج الٰہی" آٹھویں نویں اور دسویں صدی کے شعراء کا تذکرہ ہے، اسی طرح مجمع النفائس میں بھی آغاز سے معاصرین کا تذکرہ ہے، اس لیے اس کا قوی امکان ہے کہ "خزینۂ گنج الٰہی" کے خواجہ عبدالملک عصامی اور مجمع النفائس کے خواجہ عبدالملک عصامی دونوں ایک ہی ہوں، اسی طرح ایتھے کا یہ مفروضہ رد ہو جاتا ہے کہ "فتوح السلاطین" کا مصنف

---

[۱] مجمع النفائس (سنہ تصنیف ۱۱۶۴ھ) قلمی کتابخانہ مشرقی سالار جنگ ص ۳۰۸)

خواجہ عبد الملک عصامی ہے، عبد الغنی نے جس تذکرہ کا حوالہ دیا ہے اُس میں اتفاقی طور پر دہلی کے ایک شاعر عصام الدین کا ذکر ہے، جس کی تصدیق فتوح السلاطین کی داخلی شہادت سے نہیں ہوتی، اور یہ تذکرہ بھی "خزینۂ گنج الٰہی" کی طرح ناپید ہے۔ ان وجوہ کی بناپر عبد الغنی کا بیان بھی وقیع نہیں رہ جاتا۔

پروفیسر سید یوشع نے "النجوم العوالی فی ابناء الاوائل والتوالی" کے مصنف شیخ عبد الملک عصامی کو فتوح السلاطین کے مصنف ہونے کے قیاس کا اظہار کیا ہے، مذکورہ بالا کتاب کے مصنف کا پورا نام[1] عبد الملک بن حسین بن عبد الملک تھا جس نے ۱۰۹۴ھ تا ۱۰۹۶ھ کے درمیان دنیا کی عام تاریخ لکھی، فتوح السلاطین کے مصنف کے دادا کا نام اعزالدین تھا، اور "النجوم العوالی فی ابناء الاوائل والتوالی" کے مصنف کے دادا کا نام عبد الملک تھا، دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ "فتوح السلاطین کا زمانۂ تصنیف ۷۵۱ھ ہے، اس طرح ان دونوں کتابوں کے زمانۂ تصنیف میں اس قدر بُعد پایا جاتا ہے کہ النجوم العوالی کے مصنف عبد الملک عصامی کو "فتوح السلاطین" کا مصنف قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں خواجہ عبد الملک عصامی نام کے دو ہی اشخاص گذرے ہیں، جس کے بنا پر مورخوں کو التباس ہوگیا ہے، چنانچہ محبی[2] نے

---

(۱) Catalogue Des Manuscripts Arabes Dela The que Nationale Paris. P 294 (۲) A hand list of The Muhammaden manuscripts prese in The library of The U

ج ۲ (۱) خلاصۃ الاثر ج ۳ ص ۸۶، (۲) الاعلام ج ۴ ص ۳۰۲

بھی اپنی تاریخ میں ایک عبد الملک بن جمال العصامی بن صدر الدین بن عصام الدین اسفرائنی المعروف بہ ملا عصام کا ذکر کیا ہے جو ۹۰۶ھ میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے،

غرض عبد الملک عصامی نام کے مختلف اشخاص آٹھویں صدی سے دسویں صدی کے دوران میں گذرے ہیں، جنھوں نے اپنے علم و فضل سے اپنے زمانہ میں شہرت حاصل کی، لیکن ان میں سے کسی شخص کو بھی "فتوح السلاطین" کا مصنف قرار نہیں دیا جا سکتا، ان حالات میں ان کا نام "عصامی" ہی قرار دینا درست ہے،

تاریخ پیدائش عصامی نے "فتوح السلاطین" میں اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق تصریح سے کچھ نہیں لکھا ہے، البتہ کتاب کی بعض اندرونی شہادتوں سے ان کی تاریخ پیدائش متعین کی جا سکتی ہے۔

عصامی نے "فتوح السلاطین" کے آخری باب "مختتم این کتاب متضمن نکوہش نفس و امید داری از حضرت کردگار" کی تصنیف کے دوران میں اپنی عمر چالیس سال بتلائی ہے۔[۱] اور اسی کے آخر میں اتمام تصنیف کا ۷۵۱ھ لکھا ہے،[۲] اس حساب سے ان کی تاریخ پیدائش ۷۱۱ھ مطابق ۱۳۱۱ء ہوتی ہے

خاندانی حالات عصامی کے جد اعلیٰ "ابو عصام" عراق عرب کے باشندے اور حیرہ کے والی لنعمان بن منذر کے حاجب تھے،[۳] ان کی اولاد میں فخر الملک عصامی ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں عباسی خلفاء کے دربار میں منصب وزارت پر مامور تھے اور تخمیناً ۶۲۰ھ میں خلیفۂ وقت کی خود رائی کے سبب سے انھوں نے وزارت سے استعفا دیدیا، اور بغداد سے مع اہل و عیال اور اہل خاندان ہندوستان کا رخ کیا، ملتان پہنچکر ان کے خاندان کے

---

[۱] فتوح السلاطین، ص ۶۱۶ [۲] ایضاً ص ۶۱۸ [۳] لسان العرب ج ۱۲ ص ۴۰۸ [۴] فتوح السلاطین ص ۱۲۶

بعض افراد نے پہلے وہیں طرحِ اقامت ڈالی، پھر چند دنوں کے بعد ملتان سے دہلی روانہ ہوئے، دہلی کے قریب پہنچے تو سلطانِ وقت شمس الدین التتمش نے دہلی سے چند فرسنگ آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، اور ان کو اپنا وزیر بنا کر دہلی لایا۔ فخر الملک عصامی کے فرزند صدر الکرام[1] جو سلطان ناصر الدین بن ناصر الدین بن شمس الدین التتمش (۶۴۴ھ-۶۶۵ھ مطابق ۱۲۴۱ء-۱۲۶۶ء) کے عہد میں ظہیر الممالک کے خطاب سے سرفراز ہوئے، اور وکیلدَر کے منصب پر مامور ہوئے، اس خاندان نے اپنی نیک دلی اور پاک طینتی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی، ان کے بیٹے[2] اعز الدین عصامی یا عز الدین عصامی ۱۲۳۶ء میں سلطانہ رضیہ کے دور میں پیدا ہوئے۔ اور سلطان بلبن کے عہد حکومت میں شاہی لشکر کے سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ یہ اعز الدین عصامی، عصامی مصنفِ فتوح السلاطین کے دادا تھے، عصامی نے اپنی تصنیف میں اپنے والد کا ذکر نہیں کیا ہے، ممکن ہے ان کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا ہو اور عصامی کی تعلیم و تربیت شفیق دادا ہی کی نگرانی میں ہوئی ہو، وہ سلطان محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں بہ قید حیات تھے۔ اس وقت ان کی عمر نوے سال کی تھی، ۷۲۶ھ میں سلطان کے حکم سے وہ بھی باشندگانِ دہلی کے ہمراہ دولت آباد روانہ ہوئے، ان پر وطن اور گھربار چھوڑنا بے حد شاق گذرا، چنانچہ دہلی سے چند میل آگے تلپت پہنچکر وطن کی یاد میں جان دیدی، عصامی مصنف فتوح السلاطین بھی اس سفر میں اپنے دادا کے ساتھ تھے، اس وقت ان کی عمر تقریباً سولہ سترہ برس کی تھی، یہ اس خانماں برباد قافلہ کے ساتھ دولت آباد پہنچے اور وہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی،

عصامی کے حالات زندگی | سولہ برس کی عمر سے ۴۰ برس کی عمر تک کا زمانہ (یعنی ۲۴ سال) ان کا دولت آباد میں گذرا، اس دوران میں وہ سلطان محمد بن تغلق کے عہد کی بغاوتوں کا مشاہدہ

---

[1] فتوح السلاطین ص ۱۴۷-۱۴۸ [2] ایضاً ص ۴۴۸

کرتے رہے، آخر زمانے میں ان مسلسل بغاوتوں نے سلطان کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا، اس کے مظالم اور ناروا سختیاں دیکھتے دیکھتے عصامی کا دل پک گیا، وہ ہندوستان سے دل برداشتہ ہوگئے، اور ۷۵۱ھ[1] میں حرمین شریفین ہجرت کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا، ہجرت کرنے سے پہلے[2] ایک یادگار چھوڑ جانے کا خیال پیدا ہوا، اس سے قبل ان کے دو دیوان تلف ہوگئے تھے، وہ صلبی یادگار کے مقابلے میں معنوی یادگار کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، اس یادگار کے لیے انھوں نے ایسا موضوع منتخب کیا جو شاعری اور تاریخ دونوں پر حاوی تھا جن سے ان کو طبعی لگاؤ تھا، اس مقصد[3] کی تکمیل کے لیے ان کو کسی بادشاہ یا امیر کی سرپرستی کی ضرورت تھی حسن اتفاق سے ایک دن قاضی بہاء الدین[4] نے انھیں بلاکر علاء الدین حسن بہمن شاہ کے دربار میں بڑی تعریف و توصیف کے ساتھ پیش کیا، غالباً اس وقت انھوں نے اپنی تصنیف کے ابتدائی لوازم یعنی حمد و نعت، مناقب خلفائے راشدین اور مدح سلطان کی پہلے ہی سے تکمیل کرلی تھی، جن کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرکے خوشنودی حاصل کی اور اس کی جانب سے ہندوستان کی منظوم تاریخ کی تصنیف پر مامور ہوئے اور اس کی تکمیل کے بعد اس کا نام فتوح السلاطین[5] رکھا، یہی عصامی کی آخری تصنیف ہے جو دستبرد زمانہ سے بچ گئی، اس ادبی و تاریخی شاہکار کی تکمیل کے وقت انکی عمر چالیس سال تھی، اس کی تکمیل کے بعد قاضی بہاؤ الدین نے اس کو خان سکندر اعظم کے توسط سے بارگاہ سلطانی میں پیش کیا، اور اسکے بعد عصامی ہندوستان سے ہجرت کرکے حرمین شریفین چلے گئے اور غالباً انکا

---

[1] فتوح السلاطین ص ۲۰ [2] ایضاً ص ۲۱ [3] ایضاً ص ۲۲ [4] قاضی بہاء الدین، سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے دربار میں حاجب قصہ کی خدمت جلیلہ پر مامور تھے، وہ بہت نیک آدمی تھے، علم و فضل کے ساتھ نظم و نثر کا اچھا سلیقہ رکھتے تھے، فتوح السلاطین ص ۲۳ [5] فتوح السلاطین ص ۶۱۵

اسی مقدس سرزمین میں انتقال ہوا،

اخلاق و عادات عصامی کی سیرت ان کی تصنیف میں جھلکتی ہے، وہ بڑے ذکی الحس، رقیق القلب اور انسان دوست تھے، ان میں خود نمائی، خود پسندی اور وجاہت خاندانی کا فخر و غرور نہ تھا، اپنے اسلاف میں انھوں نے صرف فخر الملک عصامی کی تعریف کی ہے، لغت میں[1] "عصامی" کے معنی ایسا شخص ہے جس نے اپنی ذات سے بڑائی حاصل کی ہو نہ کہ اپنے آبا و اجداد کی نسبت سے، اس معنی کی تصدیق "فتوح السلاطین" کے ہر شعر سے ہوتی ہے، اس میں انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی عظمت و کمال پر کہیں فخر و مباہات کا اظہار نہیں کیا ہے، خود داری اور شرافت ان کی قیمتی متاع تھی، خانہ نشینی اور عزلت گزینی کو دوست رکھتے تھے، مال و دولت اور جاہ و مرتبہ سے بے نیاز تھے، دنیاوی ساز و سامان سے نفرت کرتے تھے، اور دولتِ فقر کو دولت دنیا پر ترجیح دیتے تھے، چنانچہ فتوح السلاطین میں متعدد جگہ اپنے لیے فقر و تہید ستی کی دعا مانگی ہے، ان کا دماغ تاریخی واقعات کا خزانہ تھا لیکن "خمار غم" کی سرگرانی ان کو دم لینے نہیں دیتی تھی،

عشق و محبت کی چاشنی کے بھی لذت آشنا تھے، جس کے اشارات ان کے اشعار میں ملتے ہیں،[2]

مرا ہست در سر فسانہ بسے ۔۔۔ دریں ساز دارم ترانہ بسے

مرا ہست از غمِ دلبرے جاں رباز ۔۔۔ شبے ہمچو زلفش سیاہ و دراز

صاف باطن اور حق گو تھے، غرض مندی کی طرفداری اور غیر منصفانہ جانبداری سے دور رہتے تھے؛ سیاسی معاملات و مسائل میں آزادی اور بے باکی سے اظہار خیال کرتے تھے، اس لحاظ سے وہ دوسرے مورخوں، خاص طور سے ضیاء الدین برنی پر فوقیت رکھتے ہیں، وہ خود لکھتے ہیں:-[3]

چہ داند کسے قدر ایں داستاں ۔۔۔ مگر آں کہ ہادید راستاں

---

[1] لسان العرب جلد ۱۲ وفی المثل : کن عصامیا ولا تکن عظامیا [2] فتوح السلاطین ص ۴۴۳ و ۴۴۶

طبیعت میں شوخی، ظرافت اور بذلہ سنجی بھی تھی جس کی شائستہ اور پاکیزہ جھلک ان کی تصنیف میں جا بجا ملتی ہے، طبیعت دولتِ دنیا سے بے نیاز تھی، اور فتوح السلاطین کی تصنیف کا مقصد فردوسی کی طرح رے کی حکومت یا دولت کا حصول نہ تھا، بلکہ اپنے وطن ہندوستان میں ایک معنوی یادگار چھوڑنا اور تاریخ کی خدمت تھی،[۱]

فتوح السلاطین کا سنہ تصنیف | عصامی[۲] کے بیان کے مطابق کتاب کی تصنیف کا آغاز ۱۴ رمضان ۷۵۰ھ میں ہوا اور ۶ ربیع الاول ۷۵۱ھ میں اختتام کو پہنچا، اس طرح پانچ مہینے اور نو دن میں بارہ[۱۲] ہزار اشعار کی یہ تاریخ مکمل ہوئی، اس کا موجودہ نسخہ (۱۱۵۲۴) اشعار پر مشتمل ہے، اور بقیہ (۴۷۶) اشعار کی تکمیل اس کے ایک مرتب پروفیسر سید یوشع نے کی جو ایک قابل قدر اور مستحسن کوشش ہے۔

مآخذ | فتوح السلاطین پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مصنف نے اس کے مآخذ نہیں بتلائے ہیں، اسی بنا پر کرنل برگس[۳] نے اس کو غیر اہم کہانیوں کا مجموعہ قرار دیا ہے جو صحیح نہیں ہے، عصامی کا دماغ تاریخی واقعات کا گنجینہ تھا، ان کے بیان[۴] کے مطابق ان کی تاریخ کے مآخذ چشم دید واقعات، زبانی روایات اور وہ قصے ہیں جن کو انھوں نے عمر رسیدہ معتبر لوگوں سے سنا اور ان کی تمام روایات اور واقعات کی تحقیق اور صحت میں بڑی اور معتبر تاریخوں سے اس کا مقابلہ کرنے کے بعد ان کو نظم کا جامہ پہنایا،

مباحث کا اجمالی تجزیہ | فتوح السلاطین ہندوستان کی منظوم تاریخ ہے، جو ۳۵۰[۵] سال کے حالات پر مشتمل ہے، مصنف نے دنیا کے آغاز سے لیکر محمود غزنوی تک کے حالات سرسری بیان کیے ہیں، محمود غزنوی کے عہد سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے، اس سے پہلے انتالیس[۳۹]

---

۱ فتوح السلاطین ص ۱۲　۲ ایضاً ص ۶۱۸　۳ History of The rise of Mohamadan power in India Vol I. P. 406　۴ فتوح السلاطین ص ۶۱۴ - ۶۱۵　۵ ۱۰۰۰ء تا ۱۳۴۹ء

اشعار میں مسلمان سلاطین کی فتوحات کی مختصر کیفیت استفہامیہ انداز میں بیان کی ہے، ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملوں کا ذکر بھی سرسری انداز میں کیا ہے، غالباً اس کے لیے ان کو کافی مواد نہ مل سکا، سلطان معز الدین غوری کے حملوں اور اس دور کے بعض واقعات کو نسبتہً تفصیل سے بیان کیا ہے، جس سے نہ صرف ہندوستان کی تاریخ میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ بعض مورخوں کی فروگذاشتوں کی بھی تصحیح ہوتی ہے، مثلاً انھوں نے قطب[1] الدین ایبک کا پایۂ تخت لاہور بتلایا ہے، اور دہلی سب[2] سے پہلے سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں پایۂ تخت بنا، عصامی کا یہ بیان مختلف واقعات کی بنا پر صحیح معلوم ہوتا ہے، سلطان شمس الدین التمش اور اس کی اولاد کے دورِ حکومت کے واقعات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں، جن سے بعض نئے واقعات کا انکشاف ہوتا ہے، اور سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کی اولاد کے دورِ حکومت کے سلسلے میں بعض نئی اور دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں، عصامی کے بیانات خلجی سلاطین کے ذکر میں عام تاریخوں پر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں، خاص طور پر سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے جو حالات اور واقعات بیان کیے ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء الدین برنی نے سلطان فیروز تغلق کی خوشامد اور تغلق خاندان کی خوبیاں نمایاں کرنے میں سلطان علاء الدین خلجی کی شخصیت کو مسخ کرکے پیش کیا ہے، عصامی ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں میں سلطان علاء الدین خلجی کی بڑی تعریف کرتے ہیں، خسرو خاں[3] کا غدر[4] اور ملک غازی بیگ تغلق کی دہلی پر چڑھائی کے واقعات خسرو کے "تغلق نامہ" کی طرح مفصل تو نہیں ہیں، لیکن زیادہ تاریخی انداز میں نظم کیے گئے ہیں، غیاث الدین تغلق[5] کے نو تعمیر محل کی چھت کے گرنے کا واقعہ بھی دوسرے مورخوں کے مقابلے میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے،

---

[1] فتوح السلاطین ص ۱۰۳ [2] ایضاً ص ۱۰۸ [3] ایضاً ص ۳۰۳ [4] ایضاً ص ۳۸۱ [5] ایضاً ص ۴۱۸

اور اس کے بارہ میں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فیصلہ کیا گیا ہے، آخر میں سلطان محمد بن تغلق کے عہد کے واقعات بڑی شرح وبسط سے بیان کیے ہیں، اس کی خونریزیوں اور امرا کی بغاوتوں کے ذکر کے سلسلہ میں دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام کے حالات متاخر مورخین مثلاً فرشتہ اور سید علی طباطبا کے مقابلے میں زیادہ وضاحت سے بیان کیے ہیں، سلطان محمد بن تغلق نے ۲۱ محرم ۷۵۲ھ میں وفات پائی اور فتوح السلاطین اس کے ساڑھے دس مہینے قبل یعنی ۶ ربیع الاول ۷۵۱ھ میں تکمیل کو پہنچی،

فتوح السلاطین کی تاریخی اہمیت: فتوح السلاطین اپنے عام انداز کے اعتبار سے شاہنامہ کا جواب بھی ہے اور اس کا ضمیمہ بھی، فردوسی نے شاہنامہ میں حضرت آدمؑ سے لیکر محمود غزنوی کے عہد تک ایران قدیم اور اسلامی دور کے بادشاہوں کا ذکر کیا ہے، اور عصامی نے ایران باستان کے ان قومی کرداروں کا ذکر دیباچہ میں مختصر طور پر کیا ہے اور محمود غزنوی سے کتاب کی تصنیف کے زمانے تک تمام واقعات اور سلاطین کی فتوحات کو سنہ وار شاہنامہ کی بحر میں نظم کیا ہے، غنی[1] نے اس خصوصیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"یہ تصنیف اپنی کیفیت اور عمومی تاریخی پہلو کے لحاظ سے فردوسی کی شاہنامہ سے مشابہ ہے"

عصامی کو تاریخ نگاری سے طبعی لگاؤ تھا، اس لیے فتوح السلاطین شمال کی تاریخ کے ساتھ ابتدائی بہمنی دور کی تاریخ کا اچھا مرقع ہے، اسی بنا پر اس کو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا شاہنامہ[2] قرار دیا جاتا ہے، بہمنی عہد کی تاریخوں میں صرف یہی ایک تاریخ دستبرد زمانہ کا شکار ہونے سے بچ گئی، اس طرح اس کتاب کی معاصرانہ اہمیت بھی ہے، فتوح السلاطین بہمنیہ سلطنت

---

[1] Pre Mughal Persian in Hindustan P. 284.
[2] فتوح السلاطین: مرتبہ آغا مہدی حسن، مطبوعہ ۱۹۳۸ء، آگرہ، دیباچہ، صفحہ ۱

ابتدائی دور کا اہم اور مستند ترین ماخذ ہے، عصامی ان تمام عوامل اور حالات سے بخوبی واقف تھے، جو دکن میں رونما ہو رہے تھے، اور جو ایک خود مختار سلطنت کی تاسیس پر ختم ہوئے حسن اور اس کے ساتھی امیران صدہ نے سلطان محمد بن تغلق کی سختی اور جبر و تشدد سے تنگ آکر دکن میں مرکز کے علی الرغم ایک آزاد سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، عصامی کے تاریخی شعور کی صورت گری میں اس واقعہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اور اس کتاب سے دکن میں ایک آزاد حکومت کے قیام کے متعلق اہم مواد فراہم ہوتا ہے، اس بنا پر فتوح السلاطین ہندوستان کی تاریخی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

عصامی نے اس تاریخ میں واقعہ نگاری کا جوہر بھی دکھلایا ہے، کہیں کہیں مبالغہ اور رنگین بیانی سے بھی کام لیا ہے، لیکن دروغ گوئی کو جگہ نہیں دی ہے، اور قادر الکلامی اور شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے عصامی کو بجا طور پر "فردوسی ہند" قرار دیا جا سکتا ہے، ہندوستان کے عہد وسطی کے تاریخ نگاروں میں حسن نظامی مصنف تاج المآثر (۶۱۴ھ) اور منہاج السراج صاحب طبقات ناصری (۶۵۸ھ) ان کے حریف مقابل ہیں، مگر فتوح السلاطین کو صوری اور معنوی محاسن کے اعتبار سے ان دونوں تاریخوں پر ترجیح حاصل ہے، اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر بہمنیہ دور کے آخر میں آذری اسفرائینی کو خاندان بہمنیہ کی منظوم تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا، جس نے "بہمن نامہ" کا قالب اختیار کیا، لیکن یہ فن اور شاعری کے اعتبار سے اس کے مقابلے میں ثانوی درجہ رکھتا ہے۔

عصامی تغلق عہد کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی کے ہم عصر تھے، تاریخ فیروز شاہی فتوح السلاطین کی تصنیف کے سات یا آٹھ سال بعد لکھی گئی، گو فتوح السلاطین، تاریخ فیروز شاہی کے مقابلے میں مبسوط نہیں ہے، لیکن تاریخی واقعات کے خلاء کو پر کرنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے، چودھویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی حالات اور نفسیاتی مزاج کو عصامی نے ایک

نئے انداز میں پیش کیا ہے جس سے اس عہد کے روح کی ترجمانی ہوتی ہے، جیسا کہ ایک مبصر کا خیال ہے

"وہ اپنے عہد کی تصویر کسی کوشش کے بغیر پیش کرتا رہتا ہے، اس کے تصوں، مکالمو اور شاہدوں میں ایسی فضا ہے جس میں اس عہد کی روح پائی جاتی ہے۔"[1]

اس میں شبہ نہیں کہ ضیاء الدین برنی ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے نامور مورخ ہیں لیکن ان کی تاریخ خامیوں سے خالی نہیں ہے، اس میں عصبیت اور تنگ نظری پائی جاتی ہے، انھوں نے تاریخ فیروز شاہی ضعیف العمری میں لکھی جب انسان کا حافظہ جواب دینے لگتا ہے۔ اس لیے ان کی تاریخ میں ترتیب اور تنظیم کے بجائے انتشار کی کیفیت پائی جاتی ہے اس کو سلطان محمد تغلق کی شخصیت کے پہچاننے میں بھی ناکامی ہوئی، حالانکہ ایک طویل مدت تک اس کو سلطان کا ندیم رہنے کا شرف حاصل تھا، اس کی تاریخ سلطان غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی (۶۶۲ھ) سے شروع ہوتی ہے، اور سلطان فیروز تغلق کے چھٹے سال جلوس (۷۵۸ھ) کے واقعات پر ختم ہوتی ہے۔ تاریخی واقعات کے اعتبار سے بھی فتوح السلاطین کا افق تاریخ فیروز شاہی کے مقابلے میں وسیع ہے، عصامی کو تاریخی واقعات کے احاطہ اور اس کے تجزیہ میں غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اس میں حکمرانوں کے طرز حکومت کے علاوہ اس دور کے علمی اور مذہبی حالات بھی جستہ جستہ ملتے ہیں، چنانچہ کہیں دہلی کی آبادی اور وہاں کے علماء اور فضلا کا ذکر ہے، کہیں تمدنی اور معاشرتی حالات کی جھلک ہے،

ان محاسن کے ساتھ فتوح السلاطین میں کچھ خامیاں اور فنی معائب بھی پائے جاتے ہیں، مگر ایسی خامیوں سے ہندوستان اور یورپ کے عہد وسطیٰ کی تاریخیں بھی خالی نہیں ہیں، عہد وسطیٰ کے مورخین بیشتر شاہی دربار سے وابستہ تھے، اور وہ واقعات کو اپنے مربیوں

---

[1] The rise of muslim power in Gujrat P 7

نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ بسا اوقات ان جنگوں کو جو ملک گیری اور توسیع مملکت کے لیے ہوتی تھیں، جہاد کا نام دیتے تھے، اسی جذبۂ مذہبی کی بنا پر عصامی نے بھی فتوح السلاطین کو عرفانِ توحید کا تذکرہ کہا ہے، اور شاہنامہ کو بدمذہبوں کی تاریخ قرار دیا ہے،

ان مورخین کے انداز بیان میں روایتی اسلوب کی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں، وہ تاریخ کو اپنے نقطۂ نظر کے تابع بنا لیتے ہیں، اور واقعات کے بیان میں شاعرانہ خیال آرائی سے کام لیتے ہیں، جیسا کہ فلپس نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:-

"Since Hasan Nizami, Amir Khusrow and Isami subordinate history to art and treat the past as raw material for their poetic imagination."[1]

اس سے تاریخ کی حقیقت نگاری متاثر ہو جاتی ہے، عصامی نے بھی اپنی تاریخ کو مسلمان سلاطین اور امرا کے جاہ و جلال اور اقتدار کا تماشا گاہ بنایا ہے، لیکن عصامی کا ذوق[2] اخلاقی اور حکیمانہ ہے، اس کا اثر فتوح السلاطین میں نمایاں ہے، چنانچہ اس میں ایسے بادشاہوں اور امیروں کو بلند مقام حاصل ہے جو اخلاقی اوصاف سے آراستہ تھے، اسی ذوق کی بنا پر وہ ہر اہم تاریخی واقعہ (بادشاہوں کی تخت نشینی، وفات اور لڑائیوں) کے بعد ناظرین کو اخلاقی تعلیم دیتے ہیں،[3] جس سے ان کے اخلاقی رجحان کا پتہ چلتا ہے،

---

[1] Historians of India, Pakistan & Ceylon Philips (School of Oriental & African Studies)-1961. P.12.

[2] فتوح السلاطین: ص ۱۰۰ [3] ایضاً ص ۲۲۴ - ۲۴۸ - ۲۹۹ - ۳۹۱

بعض اوقات وہ اصل واقعات کو ضمنی اور ذیلی واقعات سے اس لیے ملا دیتے ہیں کہ ان سے اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے، ان کے نزدیک تاریخ کا فلسفہ یہ ہے کہ لوگ پچھلے واقعات سے سبق حاصل کیا کریں، اور آیندہ کے لیے ہوشیار ہو جائیں، ایک مبصرؔ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

"Episodes are inter spread with anecdotes and moralizing on the dangers of worldly vanity."

بحیثیت مجموعی عہد وسطیٰ کی تمام تاریخوں کا خواہ ہندوستان کی ہوں یا یورپ کی لب ولہجہ مذہبی ہے، اس سے فتوح السلاطین بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔

فتوح السلاطین سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے بعض اہم واقعات پر مفید روشنی پڑتی ہے، ذیل میں چند واقعات اجمالی طور پر بیان کیے جاتے ہیں، ان سے اسکی تاریخی قدر وقیمت کے تعین میں مدد ملتی ہے:۔

(۱) عہد وسطیٰ کے مورخین میں عصامی پہلے مورخ ہیں، جنھوں نے ان حالات پر روشنی ڈالی ہے، جن کے تحت غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا، منہاج السراج کی حیثیت معاصر مورخ کی ہے لیکن ان کی تاریخ طبقات ناصری میں ۶۵۸ھ تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور غیاث الدین بلبن ۶۶۴ھ میں تخت نشین ہوا۔ اگر وہ اپنی تاریخ بلبن کی تخت نشینی پر بھی ختم کرتے تو ایسے واقعات کے بیان کرنے سے احتراز کرتے جن سے ان کے مربی الغ خاں اعظم (سلطان غیاث الدین بلبن) کی شہرت اور نیک نامی کو نقصان پہنچتا، دوسرا مورخ ضیاء الدین برنی اپنی تاریخ بلبن کی

History of India; Pakistan and Ceylon, P. 124. ؎

تخت نشینی (۶۶۴ھ) سے شروع کرتا ہے، اس طرح ان دونوں کے بیانات میں چھ سال کا وقفہ ہو جاتا ہے، عصامی ہی وہ مورخ ہیں جنھوں نے اس تاریخی خلا کو پر کیا ہے، اور اس درمیانی وقفہ کے اہم واقعات لکھے ہیں[1]، اور قطعیت کے ساتھ بلبن کو سلطان ناصر الدین محمود کو زہر دے کر ختم کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے، عصامی کے اس بیان کی تصدیق ابن بطوطہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ثم ان نائبہ غیاث الدین بلبن قتلہ وملک بعدہ[2]"

بعض مورخین نے اس بیان کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے لیکن عصامی اور ابن بطوطہ کے بیان کو رد کرنے سے پہلے چند حقائق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، عصامی کا تعلق سلاطین دہلی سے زمانۂ قدیم سے تھا، اور ان کے اسلاف دربار میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے، اس لیے ان کے بیانات کا ماخذ ان کے بزرگ ہیں، دوسرے اس قضیہ میں بلبن کی ابتدائی زندگی اور کردار سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے، بلبن، سلطان شمس الدین التمش کا ایک ترک غلام زادہ تھا، جس کو بخارا میں ایک فقیر نے خراب وخستہ حالت میں دیکھ کر بادشاہت کی پیشین گوئی کی تھی[3]، اس طرح ابتدا ہی سے بادشاہت کا خیال اس کے دل و دماغ پر مسلط تھا۔

(۲) معاصرت کی بنا پر محمد بن تغلق کے دور حکومت کے واقعات میں فتوح السلاطین کا بیان زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے، اور اہل ملک پر اس حکومت کے اثرات، چودھویں صدی کے عام نفسیاتی مزاج اور سیاسی رجحانات پر اس کتاب سے اچھی روشنی پڑتی ہے، مہدی حسن[4] اس کی اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں:-

---

[1] فتوح السلاطین، ص ۱۴۳ [2] رحلہ - ۲ ص ۲۶ [3] ایضاً ج ۲ صفحہ ۲۷

[4] Critical Study of the sources for the history of India - Islamic cultur - 1957. P. 317

"درحقیقت فتوح السلاطین کی دریافت سے محمد بن تغلق کی تاریخ کی تحقیقات کی دولت میں اضافہ ہوا ہے"

سلطان محمد بن تغلق کی شخصیت اور بادشاہت کے متعلق صحیح اور متوازن نقطۂ نگاہ قائم کرنے کے لیے فتوح السلاطین، رحلۂ ابن بطوطہ اور تاریخ فیروز شاہی کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے، اس کی تصدیق واقعات ذیل سے ہوتی ہے،

(الف) سلطان غیاث الدین تغلق نے تخت نشینی کے بعد شہزادہ جونا خاں (سلطان محمد بن تغلق) کو ورنگل کی مہم پر ۱۳۲۱ء میں روانہ کیا پہلی دفعہ شاہی فوج کو شکست اٹھانی پڑی، اس شکست کے اسباب میں ابن بطوطہ، ضیاء الدین برنی اور عصامی کے بیانات مختلف ہیں، ضیاء الدین برنی نے رسل و رسائل کے سامان ختم اور غیاث الدین کی موت کی غلط خبر مشہور ہو جانے کو شکست کا سبب قرار دیا ہے،[۱] ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ شہزادہ جونا خاں نے ملا عبید کو اپنے باپ کے انتقال کی غلط خبر مشتہر کرنے کے لیے آمادہ کیا تاکہ اس کی بادشاہت کے لیے راستہ ہموار ہو جائے،[۲] ان دو معاصر مورخوں کے بیانات کا مطالعہ فتوح السلاطین کی روشنی میں کرنے سے اصل حقیقت بے نقاب اور عصامی کی حق پسندی اور مورخانہ دیانت ظاہر ہو جاتی ہے، عصامی[۳] نے ورنگل کی مہم کی ناکامی کا سبب ملا عبید کی دخل اندازی کی بنا پر فوجی سرداروں تگین اور تمر کی شہزادے سے بغاوت اور دیو رائے (ورنگل کا راجہ) سے سازش کو قرار دیا ہے،

(ب) سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال کے بارہ میں ضیاء الدین برنی ابن بطوطہ اور عصامی کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے، سلطان غیاث الدین تغلق بنگال کی مہم سے کامیاب واپسی پر شہزادہ جونا خاں نے تغلق آباد (دہلی) سے پانچ میل کے فاصلے پر (یعنی افغان پور)

---

۱ تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۴۷ - ۴۴۸ ۲ رحلہ ج ۲ ص ۴۸ ۳ فتوح السلاطین ص ۴۱۲

لکڑی کا ایک شاندار محل باپ کے استقبال کے لیے تعمیر کرایا، ضیاء الدین برنی[1] کے بیان کے مطابق محل پر بجلی گرنے سے سلطان غیاث الدین تغلق ۵ پانچ چھ آدمیوں کے چھت کے نیچے دب کر مرگیا، ابن بطوطہ[2] نے سلطان کی موت کو شہزادہ اور ملک احمد بن ایاز کی سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے، عصامی[3] نے ابن بطوطہ کے بیان کو ایک بوڑھے شخص کا قیاس قرار دیکر اپنی مورخانہ دیانت اور غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے،

(ج) فتوح السلاطین کے بیانات سے سلطان محمد بن تغلق سے ابن بطوطہ کے عناد کی وجہ سمجھ میں آتی ہے، سلطان دوسرے مذاہب کے علماء کی زیادہ سرپرستی کرتا تھا، خاص طور پر ایسے علماء جو یونانی علم کلام یا فلسفہ میں درک رکھتے تھے، وہ مسلمان علماء کی خونریزی کو مباح سمجھتا تھا، اسی بنا پر پایہ تخت کے قاضیوں نے اس کے قتل کی منظوری دیدی تھی، فتوح السلاطین کی دریافت سے ابن بطوطہ کے سلطان پر عائد کردہ الزامات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، بہاء الدین گرشاسپ حاکم ساگر کی عبرت ناک سزا کے متعلق ابن بطوطہ[4] نے مبالغہ آرائی سے کام لیا، اسکے بیان کے مطابق اس کو قتل کر دینے کے بعد اس کے جسم کو چاول میں پکا کر اس کے بیوی بچوں کے پاس بھیجا گیا، اور اس کے جسم کی کھال میں بھس بھروا کر دوسرے امراء کی عبرت کی خاطر تمام صوبوں میں گشت کروایا، فتوح السلاطین[5] میں گرشاسب کی سزا کے تعلق[6] صرف دو سطر کے کا ذکر پایا جاتا ہے اسی طرح ابن بطوطہ[7] نے دہلی سے دولت آباد کو آبادی کے تخلیہ کے موقع پر ایک اندھے اور لنگڑے کی اذیت ناک سزا کا ذکر کیا ہے، فتوح السلاطین[8] میں بھی باشندگان دہلی کی دولت آباد منتقلی کی دردناک داستان بیان کی گئی ہے لیکن اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ عصامی خود اس ہجرت کرنے والے کاروان کے ساتھ تھے، اور ترک وطن کے صدمے سے ان کے دادا

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۵۲ [2] رحلہ ج ۲ ص ۴۰ [3] فتوح السلاطین ص ۴۲۰ [4] رحلہ ج ۲ ص ۱۳، ۱۴
[5] فتوح السلاطین ص ۴۳۱ [6] رحلہ ج ۲ ص ۱۷ [7] فتوح السلاطین ۴۴۶ - ۴۵۳

جاں بر نہ ہو سکے، اس سانحہ کے باوجود عصامی نے اپنی طبعی شرافت اور حق پسندی کی بنا پر سلطان کے کردار کو ابن بطوطہ کے مقابلے میں نسبتاً "ہلکے رنگ میں پیش کیا ہے،

(د) فتوح السلاطین کے بیانات پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کی کردارکشی کے بارہ میں ان کے بیانات ذاتی بغض وعناد کا نتیجہ ہیں، چنانچہ مہدی حسن[۱] لکھتے ہیں :-

"I can not concur with the views expressed in the Isami-Nama about Isami's portraiture of Mohammad bin Tughluq."

پروفیسر ہارون خاں شروانی[۲] نے بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے :-

"...... is on the whole reliable except in regard to the character of Mohammad bin Tughluq."

اس میں کچھ شک نہیں سلطان محمد بن تغلق کے کردار کے بیان میں طنز اور ندامت کا پہلو نمایاں ہے، عصامی نے سلطان کو ظالم، دون پرست، نا ہمایوں سیر، مخرب سیر اور ضحاک کے القاب سے یاد کیا ہے،[۳] اور سلطان غیاث الدین تغلق کی موت پر اس کے رنج وغم کو مصنوعی قرار دیا ہے۔ دہلی میں ایک ضیافت کے موقع پر رعایا کو سلطان نے جو نصیحت کی ہے۔ اس کے بیان[۴] میں بھی طنز کا زہر ہے، عصامی کے ان بیانات میں ان کے طبعی میلان اور ذاتی واقعات کو بڑا دخل ہے، عصامی پر مذہبی رنگ غالب تھا، سلطان[۵] نے پایۂ تخت کے قاضیوں

---

[۱] فتوح السلاطین : مرتبہ آغا مہدی حسین - انگریزی مقدمہ [۲] The Bahmani's of The Deccan ..... P. 34 [۳] فتوح السلاطین ص ۴۲۱ [۴] ایضاً ص ۴۲۳ [۵] ایضاً ص ۵۱۵

کے اختیارات سلب کر لیے تھے۔ وہ مسلمان علماء کے مقابلے میں دوسرے مذاہب کے علماء کی بڑی قدر کرتا تھا، اسلامی قوانین سے سلطان کا انحراف، غیر مسلموں کی دلداری اور ان کے تہواروں میں شرکت عصامی کو ناپسند تھی، اس لیے وہ اسکی مذمت کرتا تھا، دوسری قابل لحاظ بات یہ ہو کہ وہ دہلی کے تخلیۂ آبادی سے لیکر دولت آباد میں قیام اور دکن میں ایک آزاد حکومت کی تشکیل تک تمام حالات کے عینی شاہد تھے، عصامی کا خاندان بھی سلطان کی نار واسختی کا شکار تھا، چنانچہ دہلی سے دولت آباد کے سفر کی پہلی منزل میں انکے دادا کا سایۂ عاطفت انکے سر سے اٹھ گیا، اس سانحہ نے انکے حساس دل پر گہرا اثر کیا، اسکے بعد اپنے قیام دولت آباد کے زمانے میں باغی امراء کے ساتھ سلطان کی ناروا سختیاں دیکھتے رہے، فتوح السلاطین[1] کے بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دولت آباد میں ان کے قیام کا زمانہ سخت مصائب میں گذرا، اس ہنگامۂ دار وگیر میں انکے دو دیوان تلف ہو گئے، سلطان محمد بن تغلق کی کردارکشی کے وقت یہ تمام واقعات انکے تحت الشعور میں موجود تھے جنھوں نے سلطان کے متعلق ان کے خیالات پر اثر ڈالا، ان سب باتوں کے باوجود عصامی نے اپنے معاصر سیاح ابن بطوطہ کے مقابلے میں سلطان کے کردار کو ہلکے رنگ میں پیش کیا ہو، عصامی کے دوسرے ہم عصر مورخ ضیاء الدین برنی کے بیانات سلطان محمد بن تغلق کے متعلق زیادہ بھروسے کے قابل نہیں ہیں، ان دونوں معاصرین کے مقابلے میں عصامی نے ایک حد تک متوازن نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہو، ان حالات میں فتوح السلاطین کے بیانات کو مصنف کے ذاتی بغض وعناد پر محمول کرکے بالکلیہ رد کر دینا عصامی کے ساتھ انصاف نہیں ہو، بعض جگہ بیانات میں لہجہ کی تلخی اور طنز کی نشتریت میں ان کے ذاتی حالات اور مصائب کو بھی دخل ہو، بحیثیت مجموعی عصامی چودہویں صدی کا واحد مورخ ہے، جس نے سلطان محمد بن تغلق کے خوف اور مہربانی سے بلند ہوکر اس عہد کی تاریخ لکھی۔

(باقی)

---

[1] فتوح السلاطین، ص ۱۲ - ۱۳

ابو الفرج الاصبہانی

اور

کتاب الاغانی

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب ایم اے لاہور

ابو الفرج الاصبہانی چوتھی صدی ہجری کے مشہور امام ادب اور عربی زبان کے بے مثل نثر نگار ہیں، ان کی زندہ جاوید کتاب کتاب الاغانی ایک ہزار برس سے ہر زمانہ کے ادیبوں اور انشاء پردازوں کی مونس وہمدم چلی آرہی ہے،

ابتدائی حالات | ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: علی بن الحسین بن محمد بن الہیثم بن عبد الرحمان ابن مروان بن عبد اللہ بن مروان بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف ۲۸۴ھ میں اصبہان میں پیدا ہوئے، لیکن بچپن میں بغداد چلے آئے اور یہیں پرورش پائی، ان کے والد اور چچا دونوں صاحب علم و فضل اور موسیقی و غنا کے دلدادہ تھے، اسوقت بغداد متمدن دنیا کا مرکز اور خلافت عباسیہ کا مستقر تھا، خطیب بغدادی نے لکھا ہے:-

"جلالت قدر اور عظمت و شان کے لحاظ سے بغداد کی دنیا میں نظیر نہ تھی، علماء و اولیاء، صلحاء کا شمار نہ تھا، خانقاہیں اور سرائیں لاتعداد تھیں، ملک میں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا، ہوا معتدل تھی، سبزے اور پانی کی فراوانی تھی، ہارون الرشید کے زمانے میں شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی" (تاریخ بغداد خطیب بغدادی ج ۱ ص ۱۱۹)

ابو الفرج الاصبہانی جب بغداد پہنچے تو علماء کی مجالس درس طلباء سے معمور اور صوفیا کی خانقاہیں ذکر و فکر سے آباد تھیں، اس کے باشندے خوش حال، خوش اطوار اور خوش پوش تھے، امراء، وزراء علوم و فنون کے مربی اور سرپرست تھے، جن کے دامن سے بیسیوں شاعر، ادیب اور صاحب علم وابستہ رہتے تھے۔

اساتذہ | ابو الفرج کے زمانے میں یوں تو بہت سے علماء صاحب درس و تدریس تھے، ان میں چار کا طوطی بول رہا تھا، یہ ابوبکر بن درید، ابوبکر بن الانباری، علی بن سلیمان الاخفش اور ابراہیم بن محمد بن عرفہ نفطویہ تھے۔ ابوبکر محمد بن الحسن بن درید الازدی اپنے زمانے میں لغت، ادب، شعر اور انساب کے امام اور خوش فکر شاعر تھے، نحو اور ادب کا درس دیتے تھے، نوے (۹۰) سال کی عمر میں وفات پائی، موسیقی اور غنا سے بھی شغف رکھتے تھے، جمہرہ فی اللغہ اور الاشتقاق ان کی مشہور کتابیں ہیں، شراب کی تعریف میں ان کے یہ آبدار شعر ہیں :-

حمراء قبل المزج صفراء بعده　　اتت بین ثوبی نرجس و شقائق

حکت وجنۃ المعشوق صرفاً فسلطوا　　علیہا مزاجاً فاکتست لون عاشق

خالص شراب سرخ ہوتی ہے اور آمیزش کے بعد زرد نظر آتی ہے، گویا وہ نرگس اور شقائق کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔

خالص ہونے کی صورت میں وہ معشوق کے رخسار جیسی نظر آتی ہے اور آمیزش کے بعد عاشق نامراد کا رنگ (زرد) اختیار کر لیتی ہے۔[1]

(۲) ابوبکر بن الانباری۔ تاریخ، اشعار، انساب کے ماہر، حدیث کے عالم اور شعر و شاعری اور علم لغت میں بلند پایہ رکھتے تھے، عمر بھر بصرہ کے قاضی رہے، حدیث اور لغت کا سبق

---

[1] بغیۃ الوعاۃ للسیوطی۔ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۰۹-۱۳۰۔

یکساں مہارت سے دیتے تھے، ۳۰۳ھ میں وفات پائی[1]

(۳) علی بن سلیمان الاخفش۔ ان کا افاضل علمائے عربیت میں شمار ہے، ۳۱۵ھ میں انتقال کیا[2]

(۴) ابوعبد اللہ ابراہیم بن محمد بن عرفہ المعروف بہ نفطویہ عربیت لغت اور حدیث کے عالم، قرآن پاک، سیرت، ایام عرب، تاریخ اور وفیات کے حافظ تھے، بغداد میں نحو اور ادب کا درس دیتے تھے۔ پرہیزگار اور پاکدامن تھے، ان کی مجالس پاکیزگی، صفائی اور خوش اخلاقی کا نمونہ تھیں، ۳۲۳ھ میں بغداد میں وفات پائی[3]

ابوالفرج نے ان ائمۂ اعلام سے اکتساب علم کیا اور ان کے فیض تربیت سے حدیث، اشعار، لغت اور نحو میں اتنا کمال حاصل کیا، کہ ان علوم کے استادوں میں ان کا شمار ہونے لگا، وہ بے حد ذہین و فطین تھے، ہزاروں اشعار ازبر تھے، اخبار عرب، ایام عرب اور انساب عرب کے حافظ تھے، ان علوم کے علاوہ علم الجوارح، بیطاری، طب اور نجوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، ادب اور انشاء کے تو امام تھے، ان کی عبقریت اور مہارت انشاءپردازی پر کتاب الاغانی شاہد ناطق ہے، جو ایک ہزار برس سے تمام ادیبوں اور انشاپردازوں کے لیے ادبی سرچشمہ رہی ہے، ابوالفرج شیریں مقال اور ظریف الطبع بھی تھے، باتیں کرتے تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، علم مجلسی کے ماہر تھے، ان کے علم و فضل، گفتگو اور شیریں بیانی کی وجہ سے امراء اور وزراء انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے اور ان کی صحبت اور مجالست کے جویا رہتے۔

ابوالفرج کے قدردان اور مربی — ابوالفرج کے پہلے مربی اور قدردان بنو حمدان تھے، جن کی

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۲۷ [2] معجم الادباء یاقوت ج ۵ ص ۲۲۰-۲۲۵ [3] ایضاً ج ۱ ص ۳۰۷-۳۱۵

نسبت امام ابو منصور الثعالبی رقم طراز ہیں :۔

"بنو حمدان ملوک اور وزراء تھے، ان کی خوبروئی، طلاقت لسانی، سخاوت اور عقل و دانش کا دور دور تک شہرہ تھا، سیف الدولہ اس خانوادے کا گل سرسبد تھا، جو ادباء اور شعراء کا ملجا و ماوٰی اور سائلوں کا کعبۂ مقصود تھا۔"[1]

۳۳۴ھ میں معزالدولہ کی سرکردگی میں آل بویہ نے بغداد پر قبضہ کر لیا، اور بنو حمدان کو جیل سے نکال کر عراق عرب اور عراق عجم پر قبضہ کر لیا، عباسی خلیفہ المستکفی باللہ برائے نام خلیفہ تھا، اصل طاقت معزالدولہ کے ہاتھوں میں تھی، گورنروں اور دوسرے عہدہ داروں کا عزل و نصب بھی اسی کے اختیار میں تھا، بنی بویہ شیعہ تھے، اس لیے ان کے عہد میں شیعیت کو بڑا فروغ ہوا،

معزالدولہ کا وزیر ابو محمد المہلبی علماء اور ادباء کا بڑا قدر دان تھا، اس لیے بنو حمدان کے زوال کے بعد ابو الفرج بھی وزیر ابو محمد المہلبی کی سرکار سے متعلق اور تاحیات ندیم رہے ابو محمد المہلبی کی نظافت طبع کے سلسلہ میں یاقوت نے لکھا ہے کہ وہ کھانے پینے میں نہایت نفاست پسند تھے، جب وہ چاول یا کھیر وغیرہ کھاتے تو ہر لقمہ کے لیے نیا چمچہ استعمال کرتے، ایک غلام ان کے دائیں جانب تیس کے قریب بلوری چمچے لیے کھڑا رہتا، چمچہ لے کر چاول کھاتے اور بائیں جانب کے دوسرے غلام کو دیتے جاتے، ایک ہی چمچے کو بار بار منہ میں نہیں ڈالتے تھے۔[2]

ابو الفرج کی عادات و اخلاق

ابو الفرج دوستوں کے دوست اور یاروں کے ہمدرد و غمخوار تھے، اپنے اساتذہ کی بے حد عزت و تکریم کرتے تھے، فارغ البالی اور دولتمندی کے باوجود انھیں زیب و زینت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، معمولی کپڑے پہنتے تھے، اور کئی کئی دن

---

[1] یتیمۃ الدہر ج ۱ ص ۸ طبع بیروت [2] یاقوت معجم الادباء ج ۳ ص ۱۹۰

ایک ہی کپڑے پہنے رہتے، کھانے پینے کے بڑے شائق اور پُرخور تھے، کھانے کے بعد ہاضمہ کیلئے پسی ہوئی کالی مرچیں پھانکتے تھے، ان خامیوں کے باوجود ان کے امرا، اور وزرا ان کو عزیز رکھتے،

شاعری | ابو الفرج شاعر بھی تھے، لیکن ہجو گو تھے، ان کا ایک مرغ مرگیا تھا، اس کا مرثیہ لکھا ہے، ایک نظم میں وزیر المہلبی سے گھر میں چوہوں کی کثرت کی شکایت کی ہے،

مذہب | مورخین نے ان کو بالاتفاق شیعہ لکھا ہے، لیکن استاد شفیق جبری استاد ادب جامعۂ دمشق نے کتاب الاغانی کی اندرونی شہادتوں سے اس کی تردید کی ہے[1]، ان کی تحقیق میں کتاب الاغانی میں بنو امیہ خصوصاً حضرت امیر معاویہؓ، ولید بن یزید، اور ہشام وغیرہ کے حلم، مکارم اخلاق اور جود وسخا کے متعلق بہت سی روایات ہیں، جن کو کوئی شیعہ مصنف نہیں لکھ سکتا، مشہور شیعہ شاعر دعبل کے متعلق ابو الفرج نے لکھا ہے کہ وہ بد زبان اور دریدہ دہن تھا، دوسرے شاعر السید الحمیری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ گندے کپڑے پہنا کرتا تھا، اور اس کی بغلوں سے بو آیا کرتی تھی، اس لیے کوئی شخص اس کو اپنے پاس نہ بٹھاتا تھا، کوئی شیعہ مصنف ان شاعروں کے متعلق اس قسم کی روایات نہیں بیان کرسکتا، ان روایات میں یہ تطبیق ہوسکتی ہے کہ ابو الفرج محب اہل بیت تھے جس پر انکی کتاب مقاتل الطالبین جو شہدائے اہل بیت کے حالات میں ہے، شاہد عدل ہے،

وفات | ان کے سنہ وفات میں مورخوں کا بیان مختلف ہے، تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) تاریخ ابن خلکان اور معجم الادباء (یاقوت) میں ان کا سنہ وفات ۳۵۶ھ مرقوم ہے اور یہی صحیح ہے[2]،

---

[1] دراسۃ الاغانی ص ۳۸ [2] ج ۳، ص تاریخ بغداد اور معجم الادباء۔ یاقوت

تلامذہ | ابو الفرج کے شاگردوں میں لغت، ادب اور حدیث کے بہت سے ائمہ پیدا ہوئے، ان میں امام دارقطنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امام دارقطنی اپنے زمانہ کے علوم حدیث کے امام، فقہ میں اختلاف فقہا کے بڑے عالم تھے، علوم قرآن کے ماہر اور دواوین عرب کے حافظ تھے، کتاب السنن اور المختلف والموتلف وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں، ۳۸۵ھ میں اس دارفنا سے دار بقا کی طرف کوچ کیا۔ ان کے علاوہ ابوزکریا الاندلسی، ابوالحسین علی بن محمد اور ابراہیم بن مخلد الباقری کا شمار بھی ان کے تلامذہ میں سے ہے،[1]

تصانیف | ابن الندیم نے الفہرست میں ان کی مندرجۂ ذیل کتابوں کی نشاندہی کی ہے،

کتاب الاغانی الکبیر (اس کتاب پر ہم مفصل تبصرہ کریں گے)، کتاب مجرد الاغانی، کتاب مقاتل آل ابی طالب (ایران اور مصر میں چھپ گئی ہے)۔ کتاب تفضیل ذی الحجہ، کتاب الاخبار والنوادر کتاب ادب السماع۔ کتاب الاخبار الطفیلیین، کتاب ادب الغربا من اہل الفضل والادب، کتاب مجموع الآثار والاخبار، کتاب الخمارین والخمارات، کتاب الدیارات، کتاب صفۃ ہارون، کتاب الفرق والمعیار،[2]

کتاب الاغانی | کتاب الاغانی ابو الفرج الاصبہانی کی پچاس سالہ محنت کا نچوڑ اور ثمرہ ہے، اس کتاب کی بنیاد ان سو سروں پر ہے جو خلیفہ ہارون الرشید کے لیے منتخب کیے گئے تھے، اور جن پر الواثق کے لیے اضافہ کیا گیا، اغانی میں ان راگوں کے موجد اور گانے والوں کے حالات بھی لکھے ہیں، اور ان وقائع کا بھی ذکر ہے، جن میں یہ راگ گائے گئے تھے، اس طرح کتاب الاغانی اخبار عرب، ایام عرب، انساب عرب کا خزینہ، اشعار عرب کا سفینہ، مشہور مغنیوں اور ارباب نشاط کا تذکرہ اور ملوک جاہلیت اور خلفائے اسلام کے قصص و

---

[1] تاریخ بغداد اور معجم الادبا، یاقوت [2] کتاب الفہرست، ابن الندیم ص ۱۱۵ طبع یورپ

حکایات کا دلآویز ذخیرہ ہے، اس زمانہ کے عوام کس طرح زندگی گذارتے تھے، کیا کھاتے تھے اور کیا پہنتے تھے، شادی اور غمی کی تقریبات کس طرح منائی جاتی تھیں، بے تکلف دوست واحباب سیر و تفریح کے مقامات سے کیسے لطف اندوز ہوتے تھے، امرا، اور وزرا کی محافل ادب میں کن علوم کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس قبیل کی تمام چیزوں کی تفصیل اس جلیل القدر کتاب میں ملتی ہے، گویا یہ کتاب عربوں کی حیات اجتماعیہ کا دلکش مرقع ہے، جس میں قوم کے مختلف طبقات اپنی اپنی خصوصیتوں کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں[1]۔

ابو الفرج الاصبہانی نے کتاب الاغانی کی تالیف کی غرض و غایت کتاب کے مقدمہ میں یہ بیان کی ہے :-

"یہ کتاب علی بن الحسین بن محمد القرشی المعروف بہ کاتب الاصبہانی کی تالیف ہے، اس میں امکان بھر قدیم و جدید عربی غنا و موسیقی کو جمع کر دیا گیا ہے، اور ہر شعر کو اس کے کہنے والے اس کے راگ مغنی اور اس کے طریقۂ غنا کی تفصیل بیان کر دگئی ہے، مشکل الفاظ کی تشریح اور وجوہ اعراب سے بحث کی گئی ہے[2]۔"

ابو الفرج نے کتاب الاغانی کی تالیف میں محدثین کے مسلک کا طریقہ اختیار کیا ہے اور ہر واقعہ کو سند کے ساتھ نقل کیا ہے، اور اس کی پوری سند تحریر کر دی ہے، اور اس کا ماخذ بھی لکھ دیا ہے، جا بجا تنقید بھی کی ہے، مثلاً میں نے اس واقعہ کو فلاں کتاب سے لیکر لکھا ہے، یا فلاں کتاب سے جمع کیا ہے۔

کتاب الاغانی کے متعلق محققین ادب کی رائیں | کتاب الاغانی ہمیشہ سے علما، اور ادبا، کے غور و فکر کا موضوع رہی ہے، اس کے متعلق ائمۂ ادب کی رائیں حسب ذیل ہیں :-

---

[1] کتاب الاغانی ج ۱ ص ۵۶ [2] مقدمہ کتاب الاغانی

۱۔ وزیر ابو محمد مہلبی لکھتے ہیں: " میں نے ابوالفرج سے پوچھا کہ اس کتاب کی تالیف میں کتنا عرصہ لگا ہے۔ جواب دیا کہ پچاس سال، لکھنے کے بعد اس کو سیف الدولہ بن حمدان کی خدمت میں پیش کیا، اس نے ایک ہزار درہم انعام میں عطا کیے، صاحب[۱] بن عباد کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ سیف الدولہ نے کتاب کی ناقدری کی ہے۔ یہ تو اس سے کہیں زیادہ انعام کی مستحق ہے۔ کیونکہ یہ کتاب گوناگوں محاسن اور عجیب و غریب واقعات پر مشتمل ہے، اس میں زاہد کے لیے سامان زہد، عالم کے لیے سرمایۂ علم، انشا پرداز اور طالب علم کے لیے خزانۂ ادب، بہادر کے لیے تذکرۂ شجاعت اور بادشاہوں کے لیے دلبستگی کا سامان موجود ہے، میرے کتب خانہ میں ایک لاکھ سترہزار کتابیں ہیں، لیکن اب یہ تنہا کتاب میری مونس و ہمدم ہے۔ وہ ایام اور اخبار عرب کا خزانہ ہے، جمع، ترتیب اور حسن تالیف میں یہ کتاب دوسری کتابوں سے سبقت لے گئی ہے"[۲]

(۲) ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ الرومی معجم الادباء میں لکھتے ہیں: " عمر عزیز کی قسم، یہ جلیل القدر اور مشہور کتاب گوناگوں فوائد پر مشتمل اور ظرافت و متانت دونوں کی جامع ہے، میں نے کئی بار ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا ہے، اور اس کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے تیرہ جلدوں میں لکھا ہے"[۳]

(۳) علامہ ابن خلدون تاریخ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: " کتاب الاغانی قاضی ابوالفرج الاصبہانی کی تالیف ہے، جو اخبار عرب، اشعار عرب، انساب عرب، ایام عرب اور وقائع عرب کی جامع ہے، اس کی بنا اُن سو راگوں پر رکھی گئی ہے جو مغنیوں نے ہارون الرشید کے لیے منتخب کیے تھے، اور ابوالفرج نے اس کو کمال تک

---

[۱] صاحب بن عباد آل بویہ کے مشہور ادب نواز وزیر تھے، مسجع اور مقفیٰ عبارت لکھنے کے شائق تھے ۳۸۵ھ میں وفات پائی۔
[۲] معجم الادباء، یاقوت ج ۵ ص ۱۵۱ [۳] ایضاً

پہنچایا، میری عمر کی قسم یہ کتاب علوم عرب، شعر، تاریخ، غنا، موسیقی اور دوسرے احوال پر مشتمل ہے، میرے علم میں اس کتاب کی دوسری نظیر نہیں۔[1]"

(۴) مشہور مورخ جرجی زیدان رقم طراز ہیں :- "کتاب الاغانی تعریف سے مستغنی اور اپنے باب میں بے مثل کتاب ہے، کہا جاتا ہے کہ ابو الفرج الاصبہانی نے اس کتاب کی تالیف میں اپنی عمر عزیز کے پچاس برس صرف کیے تھے، جب اس کی خبر الحکم بن الناصر والی قرطبہ تک پہنچی تو اس نے اصرار کیا کہ سب سے پہلے یہ کتاب اس کے دربار میں پیش کی جائے، اور اس کا انعام ایک ہزار دینار مقرر کیا، مگر جب یہ کتاب مکمل ہوگئی تو ابو الفرج نے اس کو سیف الدولہ بن حمدان کی خدمت میں پیش کیا اور انعام میں ایک ہزار درہم پائے، اس زمانہ میں کوئی امیر ایسا نہ ہوگا جس کے پاس یہ کتاب نہ رہی ہو، صاحب بن عباد جب سفر پر نکلتا تھا تو تیس اونٹوں پر کتابیں ساتھ رہتی تھیں، لیکن کتاب الاغانی کی تالیف نے ان سے مستغنی کر دیا، اس عظیم الشان کتاب کی ۲۱ جلدیں اور چھ ہزار صفحات ہیں، کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، لیکن اس کی اہمیت موسیقی اور غنا سے زیادہ ادبی علوم کی وجہ سے ہے، اس کتاب میں سینکڑوں شعراء، ادبا، مغنیوں، عشاق، قواد اور خلفاء کے تراجم اور واقعات ہیں، اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو زمانۂ جاہلیت، صدر اسلام اور عہد بنی امیہ کے بہت سے واقعات پردۂ اخفا میں رہ جاتے، ابو الفرج نے بہت سے واقعات اپنے معاصرین سے بھی نقل کیے ہیں، اس لیے یہ کتاب تدوینی لحاظ سے منفرد ہے۔[2]"

(۵) مشہور ادیب صادق الرافعی نے اپنے ایک شاگرد کے نام جو مکاتیب لکھے ہیں ان میں جن کتابوں کا مطالعہ ایک انشاء پرداز کے لیے ضروری قرار دیا ہے، ان میں کتاب الاغانی بھی ہے۔[3]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۶ [2] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان ج ۲ ص ۲۸۱ - ۲۸۲

[3] رسائل الرافعی

(۶) شام کے مشہور لغوی عالم شیخ عبد القادر المغربی مرحوم نے اس کو عربی زبان کی فصیح ترین کتابوں میں شمار کیا ہے[1]۔

(۷) عصر حاضر کے صاحب طرز ادیب ڈاکٹر طہ حسین لکھتے ہیں:-

"ہماری خوش قسمتی ہے کہ کتاب الاغانی زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہ گئی ہے، یہ کتاب بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ کی حیات ادبی اور اجتماعی کے مطالعہ کا بہترین ماخذ ہے"....

میں بھی فرانس جاتا ہوں تو اس کتاب کو ہمراہ لے جاتا ہوں، اور ہر دفعہ اس کے مطالعہ سے نئی لذت حاصل کرتا ہوں[2]....

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ راویوں کے ناموں سے صرف نظر کرکے ہمیں اس کتاب کو تنقید، تحقیق اور تحلیل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے، کیونکہ کتاب الاغانی اور تاریخ طبری نہ صرف ادب اور تاریخ کی کتابیں ہیں بلکہ ادب اور تاریخ کا ماخذ بھی ہیں[3]"

(۸) ڈاکٹر زکی مبارک لکھتے ہیں: "افسوس ہے کہ یہ کتاب علم ادب کو چھوڑ کر تاریخی حیثیت سے چنداں اہمیت کی حامل نہیں، اس کے بہت سے واقعات اور قصص تاریخی اعتبار سے ساقط الاعتبار ہیں۔

حیات اجتماعیہ کی چند دلآویز جھلکیاں طبری، مسعودی اور ابن الاثیر وغیرہ تاریخ کی معتبر کتابیں ہیں، لیکن یہ زیادہ تر سیاسی واقعات، محاربات اور خلفاء کی آل و اولاد کے تذکروں پر مشتمل ہیں، ان میں عربوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں، کتاب الاغانی اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں عوامی زندگی کی تصویر نظر آتی ہے، ابو الفرج نے اپنے زمانہ کی سوسائٹی کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور ہر طبقہ کی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا، اس زمانہ

---

[1] الاشتقاق والتعریب [2] حدیث الاربعاء ج ۲ ص ۱۲۰ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۳۰-۱۴۰

کی حیات اجتماعی کی چند دلآویز جھلکیاں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں،

(۱) عوام کالانعام ہوتے ہیں | عثمان الوراق روایت کرتے ہیں کہ میں نے عتابیؔ[1] کو باب الشام کے پاس سرراہ روٹی کھاتے دیکھا، میں نے کہا تمھیں یہاں روٹی کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ کہنے لگا گائے کے سامنے تم کو کھانے میں شرم آئے گی؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا ذرا ٹھہرو، میں تمھیں دکھائے دیتا ہوں، عوام ڈھور ڈنگروں سے زیادہ نہیں، یہ کہکر وہ وعظ کہنے لگا، اور ایک قصہ سنانا شروع کیا، اس کو سننے کے لیے لوگوں کا اژدحام ہوگیا، اور عتابی نے کہا "بہت سے راویوں سے مجھے روایت پہنچی ہے کہ جو کوئی اپنی زبان نکال کر ناک کے بانسہ تک لیجائے گا، اس پر آتش دوزخ حرام ہوگی، یہ سنکر تمام حاضرین اپنی زبان نکال کر ناک تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگے، جب مجمع منتشر ہوگیا تو مجھ سے کہنے لگا کہ اب بتلاؤ کیا ان لوگوں میں اور گایوں میں کچھ فرق ہے۔ (کتاب الاغانی جلد ۱۲ ص ۴ بحوالہ دراستہ الاغانی)

(ب) مکتب کے بچوں کی شرارتیں | احمد بن عبید اللہ بن عمار نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم ابوالعباسؔ[2] المبرد کی مجلس درس میں تحصیل علم کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے، وہ جو کچھ علم ادب اور تاریخ کے متعلق ہمیں بتلاتے تھے، ان کو ہم لکھ لیا کرتے تھے، ہمارے ساتھ ایک خوبرو اور خوش پوشاک نوجوان بھی جایا کرتا تھا جس کے حالات سے ہم ناواقف تھے، ایک دن ہم سب درس سے فارغ ہوکر ایک جگہ بیٹھکر اپنی یادداشتوں کا مقابلہ کررہے تھے کہ ایک خوبصورت کنیز نے آکر اس نوجوان کی گود میں ایک رقعہ ڈال دیا، اس رقعہ پر عنبر کی مہر لگی ہوئی تھی، نوجوان نے ہم لوگوں سے علحدہ ہوکر یہ رقعہ پڑھا اور اس کا جواب لکھ کر اس کنیز کو دیدیا،

---

[1] عتابی ایک قصہ گو بزرگ تھے [2] ابوالعباس المبرد ادب عربی کے مشہور امام ہیں، ادب میں الکامل انکی مشہور کتاب ہے

تھوڑی دیر بعد ایک ملازم چھڑی لے کر آیا، اور اس نے ہمارے ساتھی کی خوب مرمت کی، ہم نے بڑی مشکل سے اس کو چھڑایا اور اس سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ اس پرچہ میں کیا لکھا تھا، جواب ملا کہ اس میں یہ شعر لکھا ہوا تھا،

کفی حزنا انا جمیعا ببلدۃ کلانا بہا ثاو و لا نتکلم

ہمارے غم و اندوہ کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ہمکلام نہیں ہو سکتے

میں نے بھی اس کے جواب میں یہ شعر لکھ دیا جس کا یہ مطلب ہے کہ ہم پیلو کے درختوں کے پاس ملاقات کر سکتے ہیں، ہم نے پوچھا کہ تم نے ہمیں اس معاملے سے کیوں بے خبر رکھا، پھر ہم لوگوں نے اس کی ایسی درگت بنائی وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا، اس واقعہ کے بعد پھر کبھی اس نوجوان سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ (کتاب الاغانی ج ۶ ص ۱۵۳)

(ج) محفل عیش و طرب | زبیر بن بکار اپنے ماموں مصعب کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص کوفہ میں کہا کرتا تھا کہ میرے والد نے بلور کا ایک بڑا پیالہ ولید کی خدمت میں پیش کیا جو نہایت عمدہ اور بے نظیر تھا، جب شام ہوئی تو مے نوشی کا دور شروع ہوا، اتفاق سے رات بھی چودھویں کی تھی، اور چاند کا عکس پیالے میں پڑنے لگا، ولید نے پوچھا، آج کی رات چاند کس منزل میں ہے، بعض نے کہا برج حمل میں، بعض نے چاند کی ساری منزلیں گنانی شروع کر دیں، کسی نے کہا چاند تو پیالے کی منزل میں آگیا ہے، ولید نے کہا تجھ پر خدا کی مار، تو نے میرے دل کی بات کہدی، (کتاب الاغانی جلد ۶ ص ۱۲۶)

اس قسم کے مناظر کتاب میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں، جن کی تفصیل طویل ہوگی۔

نقد الادب | ابوالفرج عربی شعر و ادب کے بہت بڑے ناقد ہیں، وہ اپنی میزان نقد میں شعراء کے محاسن و معائب یکساں طور پر وزن کرتے ہیں، ولید یزید کے متعلق لکھتے ہیں

(۱) خمریات میں ولید بن یزید کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جو بعد میں شاعروں کے لیے

نمونہ بنے، خاص کر ابو نواس نے ان اشعار کے معانی کو اپنے الفاظ میں سمو کر بہت سی غزلیں لکھی ہیں، اور ان مطالب و معانی کو جا بجا دہرایا ہے۔ (کتاب الاغانی ج ۲ ص ۸۸)

(۲) ابو العتاہیہ کے کلام کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:۔ "اس کی شاعری افکار و معانی کا خزانہ ہے، اس کے اشعار سہل وسلیس اور تصنع و تکلف سے پاک ہیں، بعض شعروں میں سخیف اور بازاری الفاظ بھی ملتے ہیں، بہت سے اشعار زہد، دانائی کے مضامین اور ضرب الامثال پر مشتمل ہیں، اس کے معاصرین کا خیال ہے کہ وہ بعض فلاسفہ کی طرح حشر و نشر کا قائل نہ تھا۔

اس نے بعض نئے اور مزاحیہ اوزان ایجاد کیے ہیں، (ایضاً ج ۳ ص ۱۲۲)

(۳) مشہور عباسی شاعر ابن المعتز کی شاعری کے متعلق یہ رائے ہے کہ اس کے کلام میں شاہانہ رقت، ظریفوں کا تغزل اور ترقی پسندوں کی شان و شوکت ہے، ابن المعتز کی شاعری خوبی اور صفائی میں متقدمین سے کسی طرح کم نہیں، اس نے شاہی محلات کی چہل پہل، پھولوں کی مہک اور کنیزوں کے جھرمٹ میں پرورش پائی تھی، اس لیے اس کے کلام میں ریگستانوں، اونٹوں، ہرنیوں اور اجڑے دیار کی تلاش بے سود ہے (ایضاً ج ۹ ص ۱۴۲)

(۴) عباس بن الاحنف کے متعلق رقم طراز ہیں: "عباس بن الاحنف نے اپنے کلام کو کسی امیر، وزیر یا خلیفہ کی مدح یا ہجو سے آلودہ نہیں کیا اور نہ اپنی شاعری کو حصول معاش کا ذریعہ بنایا، اس کی طبع فیاض صرف غزل گوئی میں منحصر اور محدود ہو کر رہ گئی ہے، اور یہی اس کے کمال فن کی دلیل ہے۔ (ایضاً ج ۸ ص ۱۵)

ابو الفرج کا اسلوب بیان ابن المقفع، جاحظ، ابن قتیبہ اور طبری کی تصانیف عربی زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، ان کا طرز نگارش، سلاست زبان اور فصاحت بیان کا

ہ نمونہ ہے۔ لیکن ابو الفرج کی سادہ اور شیریں بیانی بھی اپنا جواب نہیں رکھتی، بلکہ حلاوت، حلاوٹ اور دلآویزی کے اعتبار سے ابو الفرج کا اسلوب بیان ان چاروں سے بڑھا ہوا ہے، وہ شادی اور غمی کی تقریبات، ملوک جاہلیت اور خلفائے اسلام کے واقعات، ...یا اور امرا، کی مجالس ادب، عوامی زندگی کے مشاہدات یکساں مہارت کے ساتھ نہایت سادہ اور روزمرہ کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں، ان کے ہلکے پھلکے الفاظ اور شہد و قند میں گھلی ہوئی ترکیبیں سحر حلال کا حکم رکھتی ہیں، ان کا اسلوب نگارش سجع اور قافیہ بندی کے ان التزامات سے پاک ہے، جو بدیع الزماں الہمدانی، ابو القاسم الحریری اور قاضی الفاضل کی انشار کا طغرائے امتیاز ہیں، وہ اپنی تصانیف میں وہی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جو اس زمانے کے لوگوں کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں شام کے مشہور ادیب اور نقاد استاد شفیق جبری کی تحقیق میں کتاب الاغانی کے بہت سے الفاظ اور ترکیبیں آج بھی شام میں مستعمل ہیں[۱]، اور یہی اس کتاب کے زندہ جاوید ہونے کی دلیل ہے، ابو الفرج کی مہارت انشار کا دوسرا راز روایات کے منطقی تسلسل اور انسجام میں ہے، وہ جب کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں، تو اس کی کڑیاں خود بخود جڑتی چلی جاتی ہیں، ان میں کہیں بھی جھول یا بے ربطی نظر نہیں آتی، انکی سحر نگاری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں،

(۱) مشہور مغنی اسحق بن ابراہیم الموصلی کے متعلق لکھتے ہیں:

"وہ جب بولتا تو بولنے والا چپ اور سننے والا حیران رہ جاتا، مجلس نشین اس کی باتیں سنتے نہ تھکتا، کان اسکی گفتگو کے شائق رہتے، اس کی بات چیت سے خوشی اور بحث و مباحثہ سے علم میں اضافہ ہوتا، اس کا گانا طرب انگیز ہوتا اور دنیا وما فیہا سے غافل کر دیتا"

(کتاب الاغانی جز ۱۰ ص ۱۱۷)

---

[۱] دراسۃ الاغانی ص ۱۴۲

ابو الفرج کو نفسیاتی حالات لکھنے میں بھی کمال حاصل ہے، ایک دبلے پتلے عاشق زار بدو کی زبانی اسکی نفسیاتی حالت اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"بعض دفعہ مجھ پر کچھ گھڑیاں ایسی بھی گذرتی ہیں جن میں مجھ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں زمین پر ہوں یا آسمان میں، محبوبہ کی یاد آتی ہے تو میں ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہوں، اسکی یاد محو ہوجاتی ہے تو میں پھر صحیح العقل ہو جاتا ہوں"۔

ایک بوڑھے نے نوجوان مغنیہ کا گانا سنکر کہا "سر سے لیکر پاؤں تک کوئی چیز مجھ میں سرایت کر گئی اور جب دل پر اثر ہوا تو میں کچھ حماقت کر بیٹھا" (ایضاً ج ۶، ص ۱۵)

عہد اسلام اور خلفائے عباسیہ کے زمانے میں شراب کا کاروبار یہود و نصاری کیا کرتے تھے، اور ان کی دوشیزہ لڑکیاں ساقی گری کی خدمت انجام دیتی تھیں، اس لیے انکی رعنائی، زیبائی اور عشوہ گری عرب شاعروں کا محبوب موضوع رہی ہے، ابو الفرج ایک کلال کی لڑکی کی مدح و توصیف نثر میں اس طرح کرتے ہیں:۔

"بوٹا سا قد، دینار جیسا دمکتا ہوا چہرہ، لمبے بال، دہن کشادہ ہنستی تو معلوم ہوتا کہ چمن میں پھول کھلے ہوئے ہیں، اسکی باتیں شہد سے زیادہ میٹھی تھیں" (ایضاً ج ۵ ص ۹۵)

کتاب الاغانی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی ساری کائنات شعر و نغمہ میں ڈوبی ہوئی تھی، عوام تو عوام خواص اور ارباب مذہب بھی غنا اور موسیقی سے شغف رکھتے تھے، اور ان کا یہ ذوق ان کے تقدس میں قادح نہ تھا، ارباب نشاط کی وہ قدردانی تھی کہ دوسرے اہل کمال ان کے آگے ماند پڑ گئے تھے، شاہی محلات میں غلاموں، کنیزوں اور رومی لونڈیوں کا حکم چلتا تھا، صوبہ داروں اور دیگر عہدہ داروں کا عزل و نصب بھی ان ہی کے مشورہ سے ہوتا تھا، خلفاء رنگ رلیوں اور عوام عیش و عشرت میں ڈوبے

ہوئے تھے، اور عیش پسندی، تن آسانی اور ارباب سیاست کی جاہ طلبی خلافت عباسیہ کو لے ڈوبی،

کتاب الاغانی کے اڈیشن | کتاب الاغانی کی پہلی جلد ۱۸۴۰ء میں جرمنی سے لاطینی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی، یہ جلد بہ اعراب ہے، اس اڈیشن کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا مطبع بولاق کا احسان ہے کہ اس نے ۱۸۶۸ء میں مکمل کتاب کو پہلی دفعہ شائع کرکے اس علمی خزانہ کو وقف عام کردیا، ۱۸۸۸ء میں ایک جرمن مستشرق روڈلف برونو نے اس کتاب کی ۲۱ ویں جلد شائع کی لیکن غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی مستقل حصہ نہیں ہے، بلکہ بعض زیادات کا مجموعہ ہے، ۱۹۰۰ء میں مشہور اطالوی مستشرق استاد گوئیڈی نے بولاق اڈیشن کا انڈکس شائع کرکے عظیم الشان علمی خدمت انجام دی، یہ انڈکس جو فرانیسی زبان میں ہے، چار جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی فہرست میں شعرا کے نام ہیں، دوسری میں قوافی، تیسری میں اعلام الرجال والنساء، اور قبائل وغیرہ ہیں اور چوتھی میں شہروں، قصبوں اور مختلف مقامات کے نام آگئے ہیں، مطبع بولاق کا دوسرا اڈیشن محمد آفندی ساسی نے چھپوایا تھا، جس میں ۲۱ ویں جلد کے زیادات بھی آگئے ہیں،

ان اڈیشنوں کے علاوہ اب بھی ایک ایسے اڈیشن کی ضرورت تھی جو تصحیح، ترتیب اور تحشیہ کے جملہ لوازم سے آراستہ ہو، اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے دار الکتب المصریہ نے اس بے مثل کتاب کی طباعت کا انتظام کیا، اب تک اس کی سولہ ۱۶ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور چار ابھی باقی ہیں، بیروت سے بھی کتاب الاغانی کے دو تین اڈیشن نکلے ہیں لیکن ان میں کوئی خوبی نہیں، وہ مصری اڈیشن کی نقل در نقل ہیں،

کتاب الاغانی کے مختصرات | کتاب الاغانی کے مختصرات کی تعداد بھی کافی ہے، ان میں سب سے زیادہ مشہور ابن المنظور المصری مؤلف لسان العرب کا ہے جس کا نام مختار الاغانی

فی الاخبار و النہانی ہے، مصری حکومت کی قدر دانی سے اس کی سات جلدیں یا رسالے شائع ہو چکی ہیں، دوسرا اختصار ابن الواصل الحموی کا ہے جس کا نام تجرید الاغانی ہے، سابق الذکر کی طرح اس میں بھی اسانید کو حذف کر دیا ہے، ڈاکٹر طہ حسین کی معارف پروری سے اس کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں اور دو باقی ہیں، لیکن ادبی دنیا میں زیادہ چلن رنات المثالث والمثانی کا ہے، جسے آج سے ساٹھ ستر برس پیشتر ایک عیسائی فاضل نے بیروت سے شائع کیا تھا،

مقالات احسان

مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ اعظم گڈھ ایک صاحبِ ذوق شاعر اور نکتہ سنج ادیب ہیں، ان کے قلم کی روانی نظم و نثر دونوں میں یکساں ہے، انھوں نے مشق سخن کے ساتھ بہت سے ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں، اور فانی و اصغر و دل شاہجہانپوری جیسے اساتذۂ سخن کے مجموعۂ کلام پر تبصرے بھی کیے ہیں اور بعض ادبی کانفرنسوں میں خطبے بھی دیے ہیں، یہ ان کے چند دلآویز ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جو معارف وعلی گڑھ میگزین وغیرہ سے اکٹھا کیے گئے ہیں، اس سے پہلے ان کے کلام کا مجموعہ پیام کیف کے نام سے شائع ہو کر اہل نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے، اس مجموعہ کے بعض اہم مضامین یہ ہیں:۔

علامہ شبلی بحیثیت محقق و نقاد ۔ یاد سہیل ۔ مولانا حمید الدین کا فارسی کلام۔

ضخامت:۔ ۴۸۰ صفحے	قیمت:۔ عہ

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

مراکش — آئینۂ ایام میں

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

یہ مضمون مراکش کے رسالہ "دعوۃ الحق" کے خاص نمبر —— جو مراکش کے فرمانروا مولائے حسن ثانی کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر نکلا ہے —— کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

مراکش براعظم افریقہ کے انتہائی شمال میں ساحل سمندر پر واقع ایک زرخیز اور سرسبز وشاداب ملک ہے، ابھی اس کی آزادی کو چند ہی سال ہوئے ہیں، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے سیاسی، تمدنی، تجارتی اور صنعتی ہر میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے، آج اس کی خوشحالی اور شادابی کو دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کبھی یہ ملک عروج وزوال کے پُرآشوب دور سے بھی گذرا ہے،

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سترہویں صدی عیسوی ہی میں ترکی مریض نیم جان ہوچکا تھا، لیکن ابھی اس کے مرکز قسطنطنیہ میں عثمانیوں کی تلوار برق وصاعقہ بنکر چمک رہی تھی جس سے یورپین اقوام ایک زمانہ تک خوف وہراس محسوس کرتی رہیں، لیکن انیسویں صدی کا اواخر ترکوں کے عروج واقبال کے لیے نقطۂ زوال وادبار ثابت ہوا، ان کی اس کمزوری کا ردعمل یورپ میں ظاہر ہونا طبعی تھا، چنانچہ جب اسلامی دنیا کا شیرازۂ اتحاد منتشر ہوا، تو یورپ کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے لگیں، اور جبرالٹر پر برطانیہ کے قبضہ کے بعد مغربی ملکوں میں ملک گیری کی دوڑ شروع ہوگئی جس میں کوئی ملک بھی پیچھے رہنا گوارا نہ کرسکتا تھا، خاص طور

برطانیہ، فرانس اور جرمنی ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی زیادہ کوشش میں تھے، یورپین اقوام کے اس استبداد اور استعمار کی خونچکاں داستان بہت طویل ہے، یہاں اس کی تفصیل میں پڑے بغیر صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ افریقہ کے شمالی ساحل پر جو عرب ممالک آباد ہیں وہ انیسویں صدی کے وسط تک خود مختار اور یورپ کی دستبرد سے محفوظ تھے، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس طرف بھی یورپ نے قدم بڑھائے اور مسلم فرمانرواؤں کی ناعاقبت اندیشی اور اختلاف کے باعث ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر فرانس کے قبضہ سے جو ابتدا ہوئی تھی وہ بیسویں صدی کے اوائل میں شمالی افریقہ کی سب سے آخری آزاد سلطنت لیبیا پر اٹلی کے تسلط پر ختم ہوئی، اس طرح مسلمانوں کی بدبختی پر آخری مہر ثبت ہوگئی،

شمالی افریقہ کے یہ ساحلی ملک عرصہ سے یورپ کی نظر میں چڑھے ہوئے تھے، کیونکہ یہ تمام علاقے انتہائی زرخیز اور سرسبز و شاداب ہیں، بالخصوص مراکش کے چار لاکھ پچاس ہزار مربع کیلومیٹر پر محیط علاقہ کا محل وقوع سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، آبنائے جبرالٹر کے عین مقابل ہونے کے علاوہ اس کے ایک طرف کے ساحل سے بحروم ٹکراتا ہے، اور اسکے دوسری طرف بحر اوقیانوس لہریں لیتا ہے، ایسا محل وقوع ہر مغربی ملک خاص طور سے برطانیہ کے لیے بڑا خطرہ اور اس پر قبضہ ایک بڑی دولت تھا، اس لیے جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں سے ہر ایک کی کوشش یہی رہی کہ وہ کسی طرح اس دولت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے، وہیں ایک اہم سبب مراکش پر تسلط قائم کرنا بھی تھا، اس کوشش میں ہر مغربی ملک دوسرے کا رقیب بن گیا تھا، اور اسی رقابت کا نتیجہ جنگ عظیم چھڑنے سے پانچ سال پہلے فرانس اور جرمنی کے درمیان جھڑپ کی شکل میں ظاہر ہوا تھا،

بہر حال شمالی افریقہ کے سارے ساحلی ممالک (الجزائر، طرابلس، تیونس، مراکش) یورپ کے قبضہ میں چلے ضرور گئے، لیکن آزادی و حریت کی قندیل برابر ابنائے وطن کے سینوں میں فروزاں رہی، اور وہ اس کے حصول کے لیے جان کی بازی لگاتے رہے، اس سلسلہ میں الجزائر کے امیر عبد القادر، طرابلس کے محمد بن علی سنوسی اور مراکش کے امیر عبد الکریم کے نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، جو اگرچہ آزادی کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن انھوں نے جذبۂ آزادی کا جو شعلہ مسلم نوجوانوں کے سینوں میں بھڑکا دیا تھا، وہ کبھی سرد نہ ہو سکا، اور ان ممالک کی آزادی کا سلسلہ شروع ہو گیا، سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں لیبیا (طرابلس) اٹلی کے نیجہ سے آزاد ہوا، اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں سرفروشانِ مراکش کی جد وجہد آزادی کامیابی سے ہمکنار ہوئی، پھر ۱۹۵۶ء میں تیونس نے فرانس کے چنگل سے رہائی حاصل کی، اور سب سے آخر میں الجزائر نے مسلسل سات سال تک فرانس سے نبرد آزما ہونے کے بعد ۱۹۶۲ء میں طوق غلامی اتار پھینکا، اس کے لیے اس کو اپنے دس لاکھ فرزندوں کی قربانی کرنی پڑی،

ذیل میں مراکش کی اجمالی تاریخ، مختلف زمانوں میں اس کی سیاسی سرگذشت اور آزادی کے بعد اس کی ترقی کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا،

مراکش کی وجہ تسمیہ | مراکش دراصل اس ملک کا ایک مرکزی شہر ہے جس کے نام سے اب پورا ملک موسوم ہو گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ گذشتہ زمانہ میں یہ مراکش نامی ایک رہزن کی جائے سکونت تھی، خاندان مرابطین کے پہلے بادشاہ سلطان یوسف بن تاشفین کو اس شہر کی تعمیر کا فخر حاصل ہوا، یورپ اس ملک کے باشندوں کو مور قوم کے نام سے موسوم کرتے تھے، چنانچہ اسی نسبت سے اس علاقہ کو مراکو بھی کہا جاتا ہے، عربوں میں اس کا زیادہ مشہور نام المغرب الاقصیٰ ہے،

رقبہ اور آبادی | مراکش کا رقبہ چار لاکھ پچاس ہزار مربع کیلومیٹر اور آبادی ایک کروڑ سولہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے جس میں مسلمان ۹۰ فیصدی ہیں، عہد غلامی میں یہ ملک تین حصوں میں منقسم اور اس کا بڑا حصہ فرانس کے قبضہ میں تھا، اس کے بعد ۲۰ ہزار مربع میل کے علاقہ پر اسپینی قابض ہوئے، اور طنجہ کا تھوڑا سا علاقہ بین الاقوامی اسمبلی کے سپرد تھا، مراکش کا سب سے زرخیز علاقہ جبل اطلس کے مغرب کا ہے، جو اگرچہ رقبہ میں کم ہے لیکن ملک کی اقتصادی ضروریات کو بڑی حد تک وہی پورا کرتا ہے،

مراکش میں اسلام | سرزمین مراکش پر اسلام کا جھنڈا ساتویں صدی عیسوی کے اواخر ہی میں بلند ہو گیا تھا، لیکن اس کے باشندے بار بار باغی ہو جاتے تھے، اس لیے ۶۲ھ میں عقبہ بن نافع والی افریقہ نے ایک شدید خونریز جنگ کے بعد انھیں شکست دی اور بڑھتا ہوا طنجہ تک پہنچ گیا، عقبہ کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اسلامی حکومت کے حدود کو بڑی وسعت دی اور شمالی افریقہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد اس قدر مضبوط کر دی کہ عربوں کے قدم اس خطہ پر ہمیشہ کے لیے جم گئے، اس علاقہ کے قدیم باشندے بربر طبعاً بڑے سرکش اور جنگجو واقع ہوئے تھے، اور برابر مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرتے تھے، لیکن جب عربوں نے بزور قوت انھیں زیر کر لیا، تو پھر وہ اسلام کے ایسے فدائی بن گئے کہ بیس ہزار بربری اندلس فتح کرنے کے لیے طارق بن زیاد کے ساتھ سر بکف نکل کھڑے ہوئے، اور طوفان باد و باراں کی طرح اسپین پر چھا گئے۔

آج بھی مراکش میں غالب اکثریت مسلمانوں ہی کی ہے، البتہ فقہی مذاہب بدلتے رہے دسویں صدی عیسوی تک حنفی مذہب کا غلبہ رہا، اس کے بعد امام مالک کے مذہب کو فروغ حاصل ہوا اور اس وقت تک اسی کے متبعین کی اکثریت ہے۔

مرکزی شہر پہاڑ اور دریا مراکش کے خاص خاص شہر یہ ہیں: دارالبیضاء، فاس، رباط، مراکش، مکناسہ، طنجہ، سبتہ، وجدہ، وزان، سلا، تازا، تیطوان، القصرالکبیر، اصیلا الصویرہ، الجدیدہ، العرائش، اسفی. فاس (جسے فیض بھی کہا جاتا ہے) اس ملک کا سب سے بڑا شہر ہے، اس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے، موجودہ دارالسلطنت رباط میں ہے،

یہاں پہاڑوں کے کئی سلسلے ہیں، سب سے طویل اور بلند کوہ اطلس کا سلسلہ ہے، جبل تجوت اس کی بلند ترین چوٹی ہے، جس کی اونچائی ۱۳ ہزار فٹ ہے، اس کے بعد دس ہزار فٹ بلند جبل بوایلان کا نمبر ہے، اسی طرح جبل ریف کے سلسلوں میں سب سے بلند چوٹی تیزی رون کی ہے جو آٹھ ہزار فٹ اونچی ہے،

مشہور دریاؤں کے نام یہ ہیں: ام الربیعہ، وادی ملویہ، وادی تان سیفت، وادی سیبو۔

پیداوار مراکش کا قابل کاشت خطہ نسبتہً کم اور ریگستان اور بنجر زیادہ ہے، کوہ اطلس کے شمال کا حصہ پیداوار اور آب و ہوا میں جنوبی یورپ سے مشابہت رکھتا ہے، جنوب کے میدان اور وادیاں کھجور کی کثرت کے سبب سے بحر النخل کہلاتی ہیں، موجودہ قومی حکومت ٹیکنیکل ذرائع سے زمین کو زیادہ سے زیادہ قابل کاشت بناتی جارہی ہے، یہاں کے پہاڑوں کے دامن میں سنگ مرمر کا بڑا خزانہ محفوظ ہے، اس کے علاوہ لوہا، فاسفیٹ، جست اور سیسہ جیسی معدنیات بھی اس کی زمین میں مدفون ہیں، جن کو رفتہ رفتہ نکالا جارہا ہے، گیہوں، جو چاول، باجرا، کھجور، زیتون اور روئی یہاں کی خاص پیداوار ہیں، میووں میں انجیر، انگور، بادام، آلوبخارا اور زردآلو بافراط پیدا ہوتا ہے، مصنوعات میں چمڑے، چاندی اور سونے کے کام کی کثرت ہے،

خود مختار حکومت کا قیام ۱۷۲ھ میں عرب کے ایک نامور قبیلہ کے رکن ادریس بن عبداللہ

حجاز سے مراکش کے صوبہ ولیلی میں وارد ہوئے، ان ہی نے ایک خود مختار و مستقل اسلامی حکومت کی حیثیت سے ملک مراکش کی بنیاد رکھی، اور فیض کا شہر بسایا، مولاے ادریس صرف ۴ سال حکومت کرپائے تھے کہ خلیفہ ہارون الرشید کی سازش سے شہید کردیے گئے، پھر ان کے بعد انکے لڑکے ادریس ثانی حکمراں ہوئے، ان دونوں کے مزار فیض کے قریب زرہون نامی قصبہ میں آج بھی مرجع خلائق ہیں،

یہ خاندان دوسو سال تک حکمراں رہا، دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک بربری قبیلہ بن مقدرہ ادریسیوں کو نکال کر خود حکمراں بن گیا، مراکش کے اصل اور قدیم باشندے بربری ہیں، اسلامی فتح کے بعد عرب بکثرت یہاں آکر آباد ہوگئے اور صدیوں کے طویل اختلاط کی بناپر بربری اسلامی روایات اور اس کی معاشرتی و تمدنی زندگی سے اس قدر مانوس ہوگئے کہ پھر وہ ملک واسلامی تہذیب کی ترقی میں عربوں کے دوش بدوش ہوگئے،

سولھویں صدی عیسوی میں مراکش میں سعدیین کا ظہور ہوا، جو اپنی سیادت کی بناپر شریفی کہلاتے تھے، یہ خاندان صدیوں مراکش کا حکمراں رہا اور اسی کے آخری تاجدار کے زمانہ میں فرانس نے مراکش میں اپنا اقتدار قائم کیا، مراکش میں بارہ سو سال تک اسلامی حکومت کا جھنڈا لہراتا رہا، اور اس طویل مدت میں الموحدین، المرابطین، سعدیین اور علوین چار خاندانوں نے دادِ حکمرانی دی،

مراکش کی سیاسی اہمیت | اوپر ذکر آچکا ہے کہ مراکش اپنے محل وقوع کی وجہ سے تجارتی اور اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کے مغرب میں بحر اطلانٹک، شمال میں بحر روم و اسپین، اور جنوب و مشرق میں الجزائر و صحاری واقع ہیں، اس کے انتہائی شمالی شہر سبتہ اور طنجہ آبنائے جبرالٹر (جبل الطارق) کے عین مقابل میں ہیں، جو مغربی اقوام

کے لیے بحر اوقیانوس میں داخل ہونے کا دروازہ ہے، اس کی اس اہمیت کے باعث جب انیسویں صدی کے اواخر میں مراکش کی خود مختار سلطنت کمزور ہوئی تو اقوام یورپ کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں، مگر فرانس نے پیش قدمی کرکے اس پر قبضہ کر لیا، اور جرمنی و برطانیہ شور، و واویلا مچا کر رہ گئے،

مراکش پر یورپین قبضہ مولائے حسن ثالث مراکش کے آخری تاجدار تھے جنھوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا، اور مغرب کی ہر سازش کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا، ۱۸۹۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا، ان کے بعد ان کا تیرہ سالہ بیٹا عبد العزیز تخت نشین ہوا، اس کی نابالغی کی وجہ سے وزیر سید محمد بن موسیٰ حکومت چلاتا رہا، اس وقت تک مراکش اجنبی اثرات سے محفوظ رہا، ۱۹۰۰ء میں سید محمد کی موت کے بعد جب اقتدار سلطان کے ہاتھوں میں آیا تو مغربی ملکوں نے مراکش پر قبضہ کرنے کی کوشش شروع کر دی، سلطان عبد العزیز اگرچہ ذہین اور زیرک تھا، لیکن نوجوانی کی وجہ سے عیش و عشرت کا دلدادہ تھا، اس کی فضول خرچی حد سے بڑھ گئی تھی، اس سے عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی، اور بہت سے قبائل بغاوت پر آمادہ ہو گئے، مغربی طاقتیں ایسے موقع کے انتظار ہی میں تھیں، چنانچہ فرانس نے قبائلی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے اپنی امداد پیش کی جس کو ناتجربہ کار سلطان نے قبول کر لیا، اس طرح مراکش میں فرانس کی مداخلت کا آغاز ہو گیا، اور وہ مختلف طریقوں سے اپنے تسلط کی راہ ہموار کرتا رہا، جرمنی کو جس نے ۱۸۷۰ء میں فرانس کو شکست فاش دی تھی، مراکش میں اس کا اقتدار گوارا نہ ہوا، اس نے اس کے خلاف آواز بلند کی، اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ مراکش کے سوال پر سمجھوتہ کرکے دونوں رقیب وقتی طور پر گلے مل گئے، اس صلح نامہ کی رو سے یہ دونوں ملک مراکش کے ہر معاملہ میں مداخلت کے برابر کے حصہ دار ہو گئے تھے، لیکن فرانس اپنی عیاری سے اپنے اثر و نفوذ

کو برابر بڑھاتا رہا، اس سے عوام میں ہیجان پیدا ہوا، اور ملک میں جا بجا اسکے خلاف بلوے ہونے لگے یہاں تک کہ ۱۹۰۷ء میں سلطان عبد العزیز کے بھائی عبد الحفیظ نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا، بہت سے قبائل اس کے ساتھ ہوگئے، سلطان عبد العزیز ان تمام شورشوں کو دبانے اور امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہا،

فرانس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر دار البیضاء (کاسا بلانکا) میں اپنی فوجیں اتار دیں، اور دھیرے دھیرے یہاں فرانس کے قدم مضبوط ہوتے گئے، ۱۹۱۲ء میں مغربی ملکوں میں بڑی چپقلش کے بعد مراکش تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا، جس حصہ پر فرانس کا پہلے سے قبضہ تھا، وہ مستقل طور پر اس کے اقتدار اور تسلط میں چلا گیا، شمال مغرب کے کچھ ساحلی علاقے پر اسپین نے پنجے جمائے، اور طنجہ کا سوا دو سو مربع میل کا علاقہ اہم تجارتی گذرگاہ ہونے کی وجہ سے ایک بین الاقوامی اسمبلی کے سپرد کر دیا گیا، اس طرح سب سے بڑا اور اہم علاقہ فرانس کے زیر تسلط رہا، اس میں کوہ اطلس کے شمال کا وہ حصہ بھی شامل تھا، جو معدنیات اور پیداوار میں دولت کی کان ہے،

مراکش کی تقسیم کا یہ فیصلہ جرمنی کے علی الرغم کیا گیا تھا، اس نے اٹلی اور برطانیہ کے دباؤ سے وقتی طور پر اس کو مان لیا تھا، لیکن یہ چیز اس کے دل میں برابر کھٹکتی رہی، جس کا نتیجہ پہلی جنگ عظیم کی شکل میں ظاہر ہوا،

جد و جہد آزادی اور امیر عبد الکریم لیکن مغربی قوموں کی قوت اور سازشیں اہل مراکش کے جذبۂ آزادی کو نہ دبا سکیں، وہ وقتاً فوقتاً ابھرتا رہا، جس کے ایک سرفروش مجاہد غازی عبد الکریم ہیں، ان کا نام مراکش کی تاریخ میں اتنا ہی روشن ہے، جتنا امیر عبد القادر کا الجزائر کی تاریخ میں، اور محمد بن علی سنوسی کا طرابلس کی۔ شکیب ارسلان نے امیر عبد الکریم کی عظمت، انکے

تدبر اور کمال کے سامنے لینن اور مصطفیٰ کمال جیسے عباقرہ کو بھی ہیچ قرار دیا ہے، کارل بروکلمان نے لکھا ہے کہ مراکش کے بطل حریت امیر عبدالکریم کا نام ملک کے ذرہ ذرہ پر ہمیشہ نقش رہیگا۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک مراکش کے حریت پسندوں نے بغاوت کی آگ برابر روشن رکھی، جب حالات حد سے بڑھ گئے تو اسپین نے باغیوں کی سرکوبی کرنی چاہی، اگرچہ بغاوت کا زیادہ زور فرانسیسی مراکش میں تھا، لیکن اسپینی مراکش میں بھی اس کی لہریں پہنچتی تھیں، اس لیے ۱۹۲۳ء میں اسپین نے برطانیہ سے جدید آلات حرب حاصل کر کے مراکش کے میدانی علاقے ریف پر حملہ کر دیا،

اسپین کی ان تیاریوں اور فوجی نقل و حرکت سے اہل ریف کے عزم و استقلال میں ذرہ برابر تزلزل پیدا نہ ہو سکا، دونوں میں بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں اسپین کو سخت جانی و مالی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا، اس جنگ کی قیادت امیر عبدالکریم جیسے جانباز بطل حریت اور اسلامی غیرت و حمیت کے پیکر کے ہاتھوں میں تھی، حقیقت یہ ہے کہ جن ناسازگار حالات میں امیر موصوف نے اسپین کو شکست دی، اس نے پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دیا،

لیکن ۱۹۲۶ء میں جب اسپین نے اپنی اس شکست کا داغ مٹانے کے لیے فرانس کے ساتھ مل کر متحدہ حملہ کیا، تو امیر عبدالکریم اور ان کی مختصر جماعت اس کی تاب نہ لا سکی، اور اسکو مجبوراً ہتھیار ڈال دینے پڑے، امیر موصوف کو گرفتار کر کے پہلے مرسینیا اور پھر جزیرہ کی طرف جلاوطن کر دیا گیا،

عہد غلامی میں مراکش کا نظام حکومت فرانس اور اسپین نے مراکش پر قبضہ کرنے کے بعد اسکا نظام یہ بنایا کہ تخت حکومت پر تو نام کے لیے سلطان کو بٹھائے رکھا لیکن حکمرانی کے سارے اختیارات اپنے

ہاتھ میں رکھے، اس سے یہ مقصد تھا کہ عوام کو غلامی کا احساس نہ رہے، اور وہ غیر ملکی تسلط کے خلاف شورش و بغاوت نہ کر سکیں لیکن یہ محض خوش فہمی تھی،

تمام اختیارات اسپینی گورنر اور فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو حاصل تھے، جنھیں اپنے اپنے مقبوضات میں دونوں حکومتیں مقرر کرتی تھیں، سلطان کی بے بسی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی بیرونی ملک سے معاہدہ تو کیا خط و کتابت بھی نہیں کر سکتا تھا، نہ کسی بڑے عہدہ دار کو ملازم یا موقوف کر سکتا تھا، تمام چھوٹے بڑے امور میں وہ اپنے حاکم کا دست نگر ہوتا تھا، اس طرح مراکش کے عوام عرصۂ دراز تک فرانس اور اسپین کے مشقِ ستم بنے رہے، مگر اس دوران میں بھی آزادی کی تحریک کسی نہ کسی شکل میں برابر جاری رہی، عربوں میں سیاسی بیداری اور ملی شعور پوری طرح پیدا ہو چکا تھا، اسلیے حصولِ آزادی کی راہ میں انھوں نے ہر قسم کی قربانیاں کیں، بالآخر فرانس کو ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو مراکش کی آزادی کا اعلان کرنا پڑا،

آزادی کے بعد آزادی کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد مراکش کے پہلے فرمانروا مرحوم مولائے محمد خامس قرار پائے، جو ساداتِ حسنی سے تعلق رکھتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے ولی عہد مولائے حسن ثانی ۳ مارچ ۱۹۶۱ء کو سریر آرائے سلطنت ہوئے، ان کے عہد سے مراکش کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا، مولائے حسن نے دار البیضاء (کاسابلانکا) میں اپنے جشنِ تاجپوشی کی تقریب میں جو تقریر کی تھی، اس سے ان کی پالیسی پر پوری روشنی پڑتی ہے، انھوں نے کہا:-

> ہم نے اپنے اس عزیز وطن کو اغیار کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے بڑی قربانیاں پیش کی ہیں، اس لیے اب ہمارا سب سے اہم اور مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم ہر حیثیت سے

اپنے کو اس آبائی وراثت کا اہل ثابت کریں، بلا شبہ اسلام کی ابدی تعلیمات آج بھی انسانی دلوں کو حق وصداقت کی روشنی سے منور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، پس ہمارا ہر قول اور ہر عمل اپنے پروردگار کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے، اسی وقت ہماری دیرینہ توقعات شرمندہ تعبیر ہو سکیں گی"

مولائے حسن ثانی کی قیادت میں مراکش نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کئے، ابھی ان کی حکومت کو صرف آٹھ سال کی مدت گذری ہے، اس مدت میں ملک سیاسی، تمدنی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشی ہر حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہو چکا ہے، عوام کے دل اسلامی شعور سے معمور ہیں، اسلامی ملکوں میں مراکش کا وزن و وقار قائم ہو گیا ہے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد جب تمام فرمانروا خاموش تھے، تو سب سے پہلے مولائے حسن ثانی ہی کی یہ ایمان افروز صدا فضا میں گونجی :

" یہ شکست ہماری مسلسل بداعمالیوں کا ثمرہ ہے، اس لیے اب از سر نو اعتصام بحبل اللہ کی ضرورت ہے، جب ہی ہم اپنے دشمنوں پر غالب آسکیں گے، ورنہ ذلت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی"

مراکش کا نظام حکومت گو شاہی ہے، لیکن مولائے حسن اپنی اسلامیت، آزادی پسندی اور حریت نواز طبیعت کی بنا پر ملک کے ہر طبقہ میں حد درجہ مقبول ہیں، ان کے عہد میں سب سے زیادہ ترقی تعلیمی میدان میں ہوئی ہے۔ غلامی کے دور میں ملک میں جہالت اور ناخواندگی عام ہو گئی تھی۔ کیونکہ فرانس اور اسپین کو مراکشی عوام کی تعلیم و تربیت سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ صرف اس ملک کے دفینوں سے اپنے ملکوں کے خزانے بھرنے میں مصروف رہے، لیکن صحیح آزادی ملنے کے بعد خصوصاً مولائے حسن کے عہد میں اس

پسماندگی کو دور کرنے کی طرف خاص توجہ کی گئی، اور پورے ملک میں ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک کے بکثرت اسکول و کالج قائم کیے گئے۔

مدارس قرآنیہ | موجودہ حکومت نے حسب ضرورت مدارس اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کا کام وزارت اوقاف وشئونِ اسلامیہ کے سپرد کیا، اس نے چند ہی برسوں میں نمایاں کارکردگی دکھائی، اور پورے ملک میں تعلیمی اداروں کا جال پھیلا دیا، غیر مستطیع طلبہ کے لیے گرانقدر وظائف کا بھی انتظام کیا،

اس سلسلہ میں شاہ حسن کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وزارت اوقاف کو ایسے مکاتب اور مدارس قائم کرنے کی خاص ہدایت کی جو قرآن حکیم کی تعلیم کے لیے مخصوص ہوں تاکہ ملک کے ہر بچہ کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہوجائے کہ قرآن ہی درحقیقت اسلام کا منبع و سرچشمہ اور یہی ہماری حکومت کا اصول و آئین ہے، شاہ کے حسب ایما وزارت نے اس قسم کے ۸۴ مدارس قائم کئے، جس میں اس وقت ۱۲۷ اساتذہ، بارہ سو طلبہ کی قرآنی حقائق کی تعلیم میں مصروف ہیں، اسکے علاوہ بہت سے ایسے گشتی مدرسین کا بھی تقرر کیا گیا، جو دور دراز دیہاتوں میں جاکر بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں،

جامعۂ قرویین | مغرب اقصیٰ کے شہر فاس کی جامعہ قرویین دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے، اس کے قیام کو گیارہ صدیاں گذر چکی ہیں، جامعہ ازہر بھی جسے آج سب سے قدیم خیال کیا جاتا ہے، اس کے بعد قائم ہوئی ہے، شہر فاس کو اس یونیورسٹی کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل ہے، جامعہ ازہر کی طرح یہ بھی ابتداءً ایک عالیشان مسجد میں قائم ہوئی تھی، کہا جاتا ہے کہ فاس میں آباد ہونے کے لیے جو خاندان باہر سے آئے، ان میں

شہر قیروان کے ایک متمول تاجر محمد الفہری نامی بھی تھے، انھوں نے انتقال کے وقت دو لڑکیاں فاطمہ اور مریم یادگار چھوڑیں، ان ہی نے اپنے مرحوم باپ کے ترکہ سے جامع قرویین اور جامع اندلس تعمیر کرائیں، فن تعمیر اور صناعی کے لحاظ سے بھی یہ مسجد دنیا کی ممتاز ترین مساجد میں شمار ہوتی ہے،

یہ یونیورسٹی ہر دور میں دینی و اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز اور انقلابی و سیاسی تحریکوں کا سرچشمہ رہی ہے، اسی لیے عہد غلامی میں مغربی اقتدار کے جور و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ رہی، کیونکہ یہیں سے حریت و آزادی کی کرنیں پورے مراکش میں پھیلتی تھیں، اس لیے فرانس نے اس کا تعلیمی و تنظیمی ڈھانچہ بہت بدل دیا تھا جس سے جامعہ قرویین کی وہ تمام خصوصیات ختم ہوگئیں جن کی بنا پر وہ دنیا کی دوسری یونیورسٹیوں میں ممتاز تھی،

آزادی کے بعد مولائے حسن ثانی کے عہد حکومت میں جامعہ نے ایک نئے عہد میں قدم رکھا، اس یونیورسٹی میں کلیۃ اللغۃ العربیہ، کلیۃ الشریعۃ اور کلیۃ اصول الدین کے تین کالج پہلے سے موجود تھے، شاہ حسن نے ان کی از سر نو تنظیم کی اور ۱۹۶۳ء میں دار الحدیث الحسنیۃ کے نام سے ایک نیا کالج قائم کیا، اس کے جلسۂ تاسیس کے موقع پر شاہ حسن نے اکابر علماء اور اعیان دولت کے ایک بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

> "اس اہم شعبہ کے قیام سے ہماری بہت سی دلی تمنائیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں، خدا کا شکر ہے کہ آج وہ تمنائیں منت کش تعبیر ہو رہی ہیں، انشاء اللہ العزیز مستقبل میں اس دار الحدیث سے ایمان و ایقان کے سوتے پھوٹیں گے اور ساری قوم اس دور کے گمراہ کن فکری دھاروں سے محفوظ رہے گی، اور اس میں صحیح اسلامی فکر

بیدار ہوگی، آج جبکہ الحاد، کفر اور باطل کی آندھیاں اسلام کے حسن جبین سے آکر ٹکرا رہی ہیں، اس قسم کے ادارہ کی شدید ضرورت تھی ــــــــــ"

اس دار الحدیث سے تھوڑی مدت میں بڑے اچھے نتائج نکلے ہیں، اس کا ایک خاص کتب خانہ بھی ہے، جس میں تفسیر، حدیث، اصول حدیث، علوم القرآن، فقہ، منطق، جغرافیہ نحو، لغت، بلاغت، علم الاجتماع اور سیر وغیرہ مختلف علوم و فنون کی چار ہزار سے زائد اہم کتابیں ہیں، پانچ سال کی قلیل مدت میں اس نے جتنی ترقی کی ہے، اسکو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مستقبل بہت تابناک ہے۔

اس نئی درسگاہ کے علاوہ شاہ حسن نے بہت سے ایسے ادارے بھی قائم کیے جن میں معلمین و اساتذہ اور مبلغین و داعیان اسلام اور خطباء کی ٹریننگ کا انتظام ہے، اور اس وقت جامعۂ قرویین پہلے سے زیادہ مکمل اور اسلامی دنیا کی ممتاز ترین یونیورسٹی ہے،

عصری علوم | مولائے حسن سے قبل مراکش میں عصری علوم (سائنس، ٹکنالوجی اور فوجی ٹریننگ وغیرہ) کی طرف کوئی توجہ نہ تھی، شاہ موصوف نے ملک کے استحکام و ترقی کے لیے اس کو بھی خاص اہمیت دی، اور ہونہار طلبہ کو بڑے بڑے وظائف دیکر دوسرے ملکوں میں بھیجا گیا، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۶۵ء میں ۱۲ طلبہ کو فوجی تعلیم و تربیت کے لیے فرانس بھیجا گیا، اس کے بعد انگلستان، اسپین، اٹلی، جرمنی اور ہالینڈ میں طلبہ کے جانے کا سلسلہ قائم ہوگیا، اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک اپنے دفاع میں دوسرے ملکوں کے فوجی ماہرین کا محتاج نہ رہے، اسی طرح سائنس، ریاضی اور علم طب کو بھی غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔

اعلیٰ تعلیم | مراکش میں اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند کرنے کی جانب شاہ کی خاص توجہ ہے، چنانچہ جامعہ محمد خامس کو قائم ہوئے ابھی صرف ۱۲ سال ہوئے ہیں، اس مدت میں اس کے

کالجوں کی تعداد آٹھ سے متجاوز ہوچکی ہے، اس وقت اس یونیورسٹی میں گیارہ ہزار ۲سو ۷، طلبہ زیر تعلیم ہیں، سال رواں کی رپورٹ کے مطابق اس کے اہم کالجوں میں طلبہ کی تعداد یہ ہے

ٹریننگ کالج ۳۱۲۹ (۱۸، طالبات)۔ انجینیرنگ کالج ۲۴۹ (۶ طالبات)

طبیہ کالج ۸۶، (۱۳۵ طالبات)۔ فیکلٹی آف آرٹس ۳۰۳۹

کلیۃ العلوم ۸۸، (۱۰۶ طالبات)۔ کلیۃ الحقوق والعلوم الاقتصادیہ والسیاسیۃ ۳۳۸۵

اس فہرست سے اسکا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ مراکش کے طبقۂ نسواں میں بھی تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے، وہ نہ صرف تدریسی بلکہ ٹیکنیکل اور طبی تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں،

مساجد کی تعمیر | مساجد عبادت گاہ کے ساتھ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز بھی ہوتی ہیں، مراکش میں قدیم زمانے ہی سے مسجدوں کی بہت کثرت ہے لیکن عہد غلامی میں فرانسیسیوں نے جہاں ملک کی دوسری خصوصیات کو ختم یا مسخ کر دیا تھا، وہاں مساجد بھی کس مپرسی کا شکار تھیں، چنانچہ آزادی کے وقت ہزاروں مسجدیں شکستہ اور ویران ہوچکی تھیں،

آزادی کے بعد وزارت اوقاف نے ملک گیر پیمانہ پر مساجد کی مرمت اور تعمیر کی طرف توجہ کی، اور پورے ملک میں ہزاروں نئی مسجدیں تعمیر کی گئیں، صرف ایک مراکش شہر میں گذشتہ آٹھ سالوں میں ۴۸ نئی مسجدیں تعمیر ہوئیں، اس کے علاوہ رباط، سلا، دار البیضا، قنیطرہ، مکناس، فاس، تازا، وجدہ، حسیمہ، تطوان، طنجہ، شادیہ تافیلالت، اور اکادیر وغیرہ میں قدیم مسجدوں کی درستگی کے ساتھ بہت سی نئی مسجدیں تعمیر کی گئیں،

مراکش کی بہت سی مسجدیں صناعی اور حسن و دلکشی کا ایسا مرقع ہیں جن کے سامنے

قرطبہ اور بغداد کا فن تعمیر ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے، بالخصوص رباط کا مأذنہ حسن اور مسجد السنۃ مراکش کی جامع کبتیہ اور فاس کی جامع قرویین اور جامع اندلس اپنی صناعی، تزئین اور شان و شوکت میں بے مثل ہیں،

مأذنہ حسن کا منارہ ۱۱۹۵ء میں جامع رباط الفتح کے لیے تعمیر ہوا تھا، اس کی بلندی ۱۶۵ فٹ ہے۔ مسجد السنۃ کو مولائے محمد نے تعمیر کیا تھا، موجودہ حکومت نے اسکی آرائش و زیبائش میں لاکھوں روپئے صرف کیے ہیں، اس کا بلند منارہ، چھتوں کے نقش و نگار، جالی کا کام اور بلند و خوبصورت منبر نگاہ کو دعوت نظارہ دیتے ہیں، جامع قرویین بڑی وسیع اور حسین مسجد ہے، اس کے ۱۴ دروازے، ۲۷۰ ستون اور ۱۲ صفیں ہیں جنہیں ۲۲ ہزار آدمی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں، وسط مسجد میں سنگ مرمر کی نہر جاری ہے، جامع اندلس فاس میں مریم فہری نے تعمیر کرائی تھی، اس کے منارہ پر رات میں حفاظ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، جامع کبتیہ شہر رباط کے مغربی حصہ میں بڑی وسیع اور شاندار مسجد ہے، عہد غلامی میں اس کی حالت خراب و خستہ ہوگئی تھی، اب پھر اس کی سابق شان و شوکت واپس آگئی ہے، اس کے نیچے کئی سو کتب فروشوں کی دکانیں ہیں، خاندان الموحدین کے پہلے فرمانروا مولائے عبد المومن نے اس کی بنیاد رکھی تھی، اور چوتھے حکمراں مولائے یعقوب المنصور نے اس کی تکمیل کی، اس کا منارہ بلندی اور استحکام کے لحاظ سے ساری دنیا کے میناروں میں ممتاز ہے، یہ منارہ ہفت منزل ہے، اس کی بلندی ۲۰۰ فٹ اور چوڑائی ۵۰ فٹ ہے[1]، سنہ تعمیر ۱۱۹۶ء ہے،

نشر و اشاعت | مولائے حسن ثانی کے عہد حکومت میں وزارت اوقاف نے حسب ذیل

[1] دہلی کا قطب مینار ۲۳۸ فٹ بلند اور ½ ۴۷ فٹ چوڑا ہے، اس کا سنہ تعمیر ۱۲۰۰ء ہے۔

اہم کتابیں بھی شائع کی ہیں :۔

(۱) المصحف الحسنی (۲) المدارک چار حصے (۳) التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید لابن عبد البر، ۲ حصے (۴) الاعلام بحدود قواعد الاسلام (۵) کتاب الدروس الحسنیۃ۔ یہ شاہ حسن کے ان خطبات کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے گذشتہ سال رمضان میں دیے تھے۔

ان کے علاوہ وزارت کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ دعوۃ الحق شائع ہوتا ہے، جس میں ملک کے مشاہیر ادبا، اور اہل علم کے معیاری مضامین ہوتے ہیں،

اسلام کی رفتار | آزادی کے بعد سے اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، چنانچہ گذشتہ بارہ سالوں میں مختلف ملکوں اور نسلوں کے تقریباً ایک ہزار سات افراد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ان میں سب سے زیادہ تعداد (۲۰۹) فرانسیسیوں کی ہے، دوسرا نمبر (۲۵۰) اسپین کا اور تیسرا (۱۵۵) یہودیوں کا ہے، اس کے بعد جرمنی، اٹلی، امریکہ اور پرتگال وغیرہ ممالک علی الترتیب ہیں، جس کی نظیر دوسرے بلاد اسلامیہ میں نہیں مل سکتی، اس سے مراکش میں تبلیغ و دعوت اسلام کے حسن انتظام کا اندازہ ہوتا ہے،

فن تعمیر | مغرب اقصیٰ فن تعمیر میں ہمیشہ سے ترقی یافتہ ملک شمار ہوتا ہے، یہاں کے کاریگر اور صناع دوسرے ملکوں میں جاکر اپنی فنی مہارت کی داد لیتے تھے۔ بغداد کی اعجوبہ روزگار مسجد امام اعظم کی تزئین و آرائش بھی مراکشی حسن ذوق ہی کا نتیجہ ہے، مراکش کا یہ امتیازی وصف آج بھی باقی بلکہ ترقی پذیر ہے، چنانچہ جامع منصور (شہر مراکش) کی محرابیں جامع قرویین (فاس) کا رو کار اور مسجد دکار رسینگال کا اپنے حسن و جمال نقش و نگار اور فنی نزاکت

میں جامع قرطبہ اور اشبیلیہ کو بھی شرماتے ہیں، خاص طور سے مراکش کے پہلے فرمانروا مولائے ادریس کا مقبرہ تعمیری شاہکار کی حیثیت رکھتا ہو اسکے در و دیوار پر بڑی مرصع و دیدہ زیب صناعی کی گئی ہے، اس کا فرش اسقدر شفاف و مجلی ہے کہ اس پر مطلا و مذہب چھت کا عکس جگمگاتا ہے، اس کے بالائی کالسوں پر آیات قرآنی اور قصائد منقبت اتنی خوبصورتی سے لکھے گئے ہیں کہ نگاہ کو سیری نہیں ہوتی،

اسی طرح مراکش کا قصر بہیہ جس کی تزئین و آرائش میں مولائے عبد العزیز کے وزیر احمد بن موسیٰ نے بڑی دولت صرف کی تھی، اپنی صناعی میں بے مثل ہے، اس کے وسیع دالان، مطلا و مذہب در و دیوار، آرام دہ خواب گاہیں، خوشنما اور نازک بارہ دری، بلند شہ نشین اور دلفریب پائیں باغ مراکشی معماروں کی مہارت فنی اور حسن ذوق کا نمونہ ہیں،

شاہ حسن ثانی کے حسن ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سینگال کی مسجد ڈکار جس کی تعمیر کی ابتدا مولائے محمد خامس نے بڑے ذوق و شوق سے کی تھی، اس کو مولائے موصوف نے مراکش کے ماہر کاریگروں کی ایک جماعت بھیجکر مکمل کرایا، اس میں ایسا حسین جالیدار کام، مینا کار چھتیں، خوبصورت اور سباک ستون اور مرصع و مزین محرابیں ہیں، جن سے بغداد کے دور عروج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، مولائے حسن نے اس مسجد کے لیے فاس کے بنے ہوئے پچیس بیش قیمت جھاڑ تحفۃً پیش کیے، اور ایک عالیشان آبنوسی منبر نصب کرایا،

یہ آزاد مراکش کی ترقیوں کا اجمالی جائزہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولائے حسن ثانی پورے جوش و انہماک کے ساتھ ملک کی ترقی میں سرگرم ہیں، ان کی یہ کامیابی درحقیقت ان کی اسلام دوستی، علم نوازی، علماء پروری اور خلوص و صداقت کا نتیجہ ہے،

آثارِ علمیہ

علم کلام پر علامہ شبلیؒ کا ایک نایاب لکچر[1]

مرسلہ

محمد اقبال مجددی - لاہور

مولانا شبلی مرحوم نے فروری سنہ ۱۹۱۰ء کے آخر میں حیدر آباد کا رُخ کیا،[2] ۲۷ مارچ کو نواب سید علی حسن خاں کو لکھتے ہیں "یہاں (حیدر آباد میں) ایک بڑا جلسہ میرے لکچر کے لئے ہوا، جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار بزرگوں کا مجمع تھا، لکچر کا سبجکٹ علم کلام تھا، ایک صاحب قلم بند کرتے گئے تھے، چنانچہ جس قدر قلم بند ہوا، چھپ کر شائع ہوگا، اور خدمت اقدس میں پہنچے گا"،[3] مولوی سمیع مرحوم کو لکھتے ہیں:"..... خود وزیر عدالت صدر انجمن ہوئے، نواب مدار المہام بہادر،[4] یعنی

---

[1] معارف: یہ لکچر اگرچہ شمسی پریس حیدر آباد میں چھپا تھا، لیکن اتنا نایاب ہے کہ مولانا شبلی کے مجموعۂ خطبات میں بھی جو دارالمصنفین سے شائع ہوا ہے، نہیں شامل ہو سکا، اور اس کی قدر و قیمت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی لکچر کے زمانہ میں تھی، اس لئے ایک تاریخی یادگار کے طور پر اسکو شائع کیا جاتا ہے، [2] حیات شبلی ص ۳۵۰-۵۳، [3] مکاتیب شبلی حصۂ دوم مکتوب نمبر ۴، [4] یعنی نواب محمد فضل الدین خاں سکندر جنگ اقبال الدولہ، اقتدار الملک، سر وقار الامراء بہادر مدار المہام دولت آصفیہ،

وزیر اعظم نے نہایت احترام سے شرف نیاز دیا[1]

یہ لکچر مولانا کی کتاب علم الکلام کی اشاعت سے پہلے کا ہے، علم الکلام ۱۹۰۲ء کے اواخر میں مفید عام پریس آگرہ سے شائع ہوئی تھی، اس لکچر میں دو تین جگہ مولانا نے اپنی اس کتاب کے مسودہ کا ذکر کیا ہے،

مقرر کا تعارف | اگرچہ ہمارا اور ہر مسلمان کا اس پر ایمان ہے کہ اسلام ایک ایسا صاف سیدھا اور سچا مذہب ہے، جس کو نہ کوئی فلسفہ ضرر پہونچا سکتا ہے، اور نہ کسی قسم کے علوم عقلیہ اور اگر ہم ایسا نہ سمجھتے تو کیوں کامل اعتماد کے ساتھ اوس کے بچانے کی فکریں کرتے؟ لیکن [illegible] سمجھ لینا اور اس پر اعتقاد رکھنا اور بات ہے، اور دوسروں کو سمجھا دینا اور معتقد بنا لینا اور بات، یا یوں کہنا چاہیے کہ فلسفہ یا علوم عقلیہ سے ان عام مسلمانوں کے اعتقاد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے، جو شرع و دین کے غوامض و اسرار سے کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتے ہیں، اور علم کلام اس نقصان سے مسلمانوں کو محفوظ رکھتا ہے، بہت موٹی بات ہے کہ جب ہمارے متقدمین جن کے نام بغیر رحمہم اللہ اور قدس سرہم کے ہم نہیں لیتے، یونانی فلسفہ اور علوم قدیمہ کو جو جدید فلسفہ و علوم کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھے، اس قابل سمجھے کہ اُن کے بُرے اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے علم کلام ایجاد کیا، اور اس میں کتابیں مدون کیں، تو اگر آج ہم علوم حالیہ و فلسفہ جدیدہ کے سمی اثر کی طرف اعتنا کریں، اور اس کے لئے تریاق تیار کرنے کی تشویق و تحریک کریں، تو کیوں ضعیف الاعتقاد ٹھہریں، ایسے لوگوں کی اور بات ہے جو ابھی تک بسم اللہ کے گنبد میں ہیں، اور نہیں جانتے کہ اسلام اور اسلامیوں پر کیا گذر رہی ہے، اور آیندہ کیا گذرے گی،

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

[1] مکاتیب شبلی بنام مولوی محمد سمیع مکتوب نمبر ۴۸،

جن معدودے چند بزرگوں نے نئے علم کلام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے، اُن میں سے ایک اسلامی پرانی تاریخ میں تازی روح پھونکنے کے شیدائی جناب مولانا شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی بھی ہیں، لیکن سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کا احساس دانشمندانہ و ہمدردانہ ہے، انھوں نے صرف خود سمجھ لینے یا زیادہ سے زیادہ چند دوسرے لوگوں کو سمجھا دینے پر ہی اکتفا کی ہے، بلکہ احساس سے قول اور قول سے گذر کر عمل و فعل میں اس کو جلوہ دیا ہے۔ مولانائے ممدوح شکر اللہ سعیہٗ کا وہ لکچر جو انھوں نے ۱۵ مارچ ۱۹۰۱ء کو باغ عامّہ میں دیا تھا، چونکہ نئے علم کلام کی واقعی ضرورت کو بتاتا اور اس کا عمدہ نمونہ بھی پیش کرتا ہے، اس لئے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ ایک رسالہ کی شکل میں چھاپ کر شائع کیا جائے، تاکہ مسلمانان صاحب ہوش و ذی فہم عموماً اور طبقۂ علماء جو حامی دین و مذہب ہے، خصوصاً اپنی توجہ اس طرف مبذول فرمائیں، اور صرف معترض بننے پر اکتفا نہ کر کے خیر خواہی اسلام اور حمایت دین خیر الانام کا عملی ثبوت دیں،

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

(مہتمم) محمد ابراہیم خاں اکبرآبادی،

---

۱۱ اردی بہشت ۱۳۱۰ف مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۰۱ء مقام باغ عامہ حیدرآباد

لکچر مولوی محمد شبلی نعمانی

سب سے پہلے میں نہایت ادب کے ساتھ عالیجناب صدر انجمن[۱] صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں

[۱] یعنی عالیجناب نواب خیر الدولہ فخر الملک بہادر وزیر عدالت دام مجدہٗ،

جنھوں نے اس جلسہ میں قدم رنجہ فرماکر میری عزت افزائی فرمائی، اور پھر ان سب صاحبوں کا جو تکلیف کرکے یہاں تشریف لائے ہیں،

حضرات آج کا میرا خطبہ (لکچر) علم کلام پر ہے، یعنی یہ کہ علم کلام کس علم کا نام ہے؟ وہ کب پیدا ہوا، ؟ کیونکر پیدا ہوا، اس سے کیا نتائج پیدا ہوئے، ؟

علم کلام کا ترجمہ انگریزی میں "اسلام اینڈ سائنس" کیا جاتا ہے، فرنچ تصنیفات میں اس کے لئے "اسکولاسٹیک" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ الفاظ علم کلام کا مفہوم نہیں ادا کرتے،

علم کلام کی تعریف علم کلام کے معنی یہ ہیں کہ مذہب کے عقائد و مسائل کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا جائے،

علم کلام کی دو قسمیں ہیں علم کلام کی دو قسمیں ہیں، ایک اندرونی یعنی جو اختلافات باہم مسلمانوں کے پیدا ہوگئے، اور ان کے متعلق استدلالات اور مباحثات سے مسلمانوں میں بہت سے فرقے قائم ہوگئے تھے، جن کی تعداد تہتر تک پہونچتی ہے، مثلاً معتزلہ، قدریہ، جبریہ وغیرہ وغیرہ، ان تمام مذاہب کے باہمی مناظرات کا نام بھی علم کلام ہے، لیکن میں اس وقت اوس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔

دوسرا علم کلام وہ ہے جو فلسفہ کے مقابلہ میں قائم ہوا، اور اس وقت میری تقریر کا عنوان یہی علم کلام ہے، اس کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے، اور اس سے عجیب عجیب معلومات حاصل ہوتے ہیں،

علم کلام کی ابتدا علم کلام کی ابتدا کی تاریخ یہ ہے کہ جب خلافت بغداد میں منتقل ہوئی تو منصور عباسی نے جو ہارون رشید کا دادا تھا، دنیا کی تمام قوموں کی علوم و فنون کی کتابیں

عربی زبان میں ترجمہ کرائیں، اس غرض کے لئے دنیا کے ہر حصہ سے علمار اور مترجمین دربار خلافت میں جمع کئے، اور اُن کو نہایت بیش بہا صلے اور انعامات دیئے، چنانچہ میں نے اپنے ایک رسالہ میں ان واقعات کو بالتفصیل لکھا ہے، اس وقت تفصیلاً بیان کرنے کا موقع نہیں[۱]،

جب ان علوم کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو اس کے پڑھنے سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں شبہات اور شکوک پیدا ہوئے، یہاں تک کہ مہدی کے زمانہ خلافت میں جو منصور کا بیٹا تھا، بہت سے لوگ ایسے پیدا ہوئے جو مانی کے پیرو ہونگے، (یہ مجوسیوں کا ایک مشہور پیشوا اور ایک فرقہ خاص کا بانی تھا،) چنانچہ حماد، عجرد وغیرہ نے اس مذہب کی حمایت میں کتابیں لکھیں، یہ حالت اس کی مقتضی تھی اور ممکن بھی تھا کہ ان لوگوں کو سزا دی جاتی، یا اُن کی زبانیں بند کر دی جاتیں" یا ترجمہ کا سلسلہ روک دیا جاتا، لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کسی صدمہ سے اسلام کو ضرر نہیں ہو سکتا، اور کوئی بادِ صرصر اسلام کو صدمہ نہیں پہونچا سکتی (چیزر) اس لئے خلیفہ مہدی نے روک ٹوک کے بجائے حکم دیا کہ اسلام کے اثبات اور دیگر مذاہب کے رد میں کتابیں لکھی جائیں، یہ علم کلام کے وجود کا پہلا دن تھا،

علم کلام کی ابتدا اور اسکی وجہ تسمیہ کے متعلق ابن خلکان وغیرہ کی غلطی

بعض مورخین کا بیان ہے کہ اس سے پہلے علم کلام پیدا ہو چکا تھا جس کا بانی واصل ابن عطا تھا، اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ علم کلام کی پہلی بحث کلام الٰہی کے متعلق تھی، اس لئے

---

[۱] اس رسالہ سے مراد علامہ شبلی کی کتاب علم الکلام" ہے، جو اوّلاً مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی، غالباً ۱۹۰۲ء (اس مضمون کے لکھنے کی تاریخ) تک اس کا دوسرا حصہ الکلام" شائع نہیں ہوا ہوگا، اسلئے یہاں حصہ اوّل کو رسالہ" کہا گیا ہے،

اوس کا نام علم کلام رکھا گیا" لیکن یہ غلطی ہے۔ علم کلام درحقیقت مہدی کے زمانہ میں پیدا ہوا، اور جیسا کہ شہرستانی نے ملل و نحل میں لکھا ہے۔ علم کلام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس علم کو منطق و فلسفہ کا ہم پلہ قرار دیا تھا، اور منطق و کلام ہم معنی الفاظ ہیں۔

علم کلام کا سب سے پہلا مصنف | اوّل شخص جس نے علم کلام پر کتاب لکھی ابوالہذیل علاف تھا، علاف کے معنی گھانس بیچنے والا ہے۔ اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں کوئی پیشہ معیوب نہ تھا، اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہاء ایسے گذرے ہیں جو موچی یا لوہار وغیرہ کا کام کرتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ علماء کو امر حق کے ظاہر کرنے میں عوام کی کچھ پروا نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان کا ذریعہ معاش عوام کی نذر و نیاز پر موقوف نہ تھا۔ آج کل کے علماء جو بالکل عوام کی مرضی کو دیکھتے رہتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر عوام برگشتہ ہو جائیں تو علماء کے وسائل معاش میں فرق آ جائے، اس سے آپ یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں اوس زمانہ میں علم تھا، یہاں تک کہ موچی اور لوہار وغیرہ بھی بڑے بڑے اہل کمال ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ اب حالت برعکس ہے۔

بہرحال ابوالہذیل علاف پہلا شخص تھا جس نے علم کلام پر کتاب لکھی، اس نے بہت سے مناظرات کئے، اور اُن کا یہ اثر ہوا کہ تین ہزار آدمی اس کی زور تقریر سے مسلمان ہو گئے، نہ کہ تلوار سے یا خوف سے یا دباؤ سے (جیرز)

ایک مجوسی میلاس نامی بہت سے مجوسیوں کو ساتھ لیکر آیا، اور کئی دن تک ابوالہذیل سے مناظرہ رہا۔ انجام کار اُس نے اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ اسلام قبول کیا[۲] (جیرز)

---

[۱] ابوالہذیل" کا پورا نام محمد بن الہذیل بن عبداللہ بن مکول ہے، ۱۳۱ھ میں پیدا ہوا، اور ۲۳۵ھ میں وفات پائی، (ملاحظہ ہو علم الکلام ص ۳۵ طبع آگرہ) [۲] ابن خلکان تذکرہ ابوالہذیل علاف،

نظام | دوسرا شخص نظام تھا جس نے اس علم کو بہت ترقی دی، چونکہ اس علم کی تکمیل کے لئے فلسفہ و عقلیات سے نہایت اعلیٰ درجہ کی واقفیت درکار تھی، اس لئے نظام نے یونانی فلسفہ میں نہایت مہارت حاصل کی، یہاں تک کہ جب ایک مرتبہ اس نے ایک برمکی سے کہا کہ آج کل میں ارسطو کی کتاب "الطبایع" کا رد لکھ رہا ہوں، اس نے کہا کہ ارسطو کی کتاب تم نے دیکھی بھی نہ ہوگی، رد کیا لکھو گے، تو نظام نے جواب دیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں "میں آپ کے سامنے اس کتاب کے اول سے آخر تک پڑھ جاؤں، یا آخر سے اول تک"[لہ]

ہارون الرشید نے علم کلام کی تصنیفات کو روک دیا | مہدی کے زمانہ میں یہ حالت رہی، مگر ہارون رشید نے جو یورپ میں الف لیلہ کی وجہ سے بہت مشہور ہے، حکم دیا کہ کوئی شخص علم کلام پر کچھ نہ لکھنے پائے، اس وجہ سے اس قسم کی تصنیفات بالکل بند ہوگئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر قوموں نے طعنے دینے شروع کئے، کہ اسلام دلائل اور براہین سے ثابت نہیں ہوسکتا، مامون الرشید کے زمانہ تک یہ بدنامی عام ہوچکی تھی،

مامون الرشید کا علم کلام کو دوبارہ زندہ کرنا | چنانچہ اس کے رفع کرنے کے لئے مامون الرشید نے حکم دیا کہ ایک عام مجلس مناظرہ قائم کی جائے، جس میں تمام دنیا کے پیشوایانِ مذہب بلائے جائیں، اور ہر شخص کو بحث و گفتگو کی عام اجازت دیجائے، اس زمانہ میں مجوسیوں کا پیشوائے مذہب، یزداں بخت تھا، چنانچہ وہ رے سے طلب ہوکر آیا، اس کے سوا اور تمام پیشوایانِ مذہب ہر جگہ سے طلب کئے گئے، اور مسلمانوں کی طرف سے بحث کرنے کے لئے نظام انتخاب کیا گیا، اس معرکہ میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا،[لہ]

لہ ملل و نحل ابن مرتضی زیدی ص۳ لہ اس مناظرہ کا ذکر ابن الندیم نے اجمالاً اور یحییٰ زیدی نے ملل و نحل میں تفصیلاً کیا ہے،

علم کلام سے مسلمانوں کی بے تعصبی کا اندازہ

علم کلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ جو چیز قابل خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے تعصبی اور فراخ حوصلگی ہے، جو کتابیں غیر مذہب والوں نے اسلام کے خلاف لکھی ہیں، میرا خیال ہے کہ آج اگر وہ موجود ہوں تو جلادی جائیں لیکن اس وقت جبر یہ روک ٹوک نہیں کی گئی، بلکہ دلائلِ عقلیہ سے ان کو باطل ثابت کیا گیا جس سے وہ خود ناپید ہوگئیں،

ایک اور امر حیرت انگیز یہ ہے کہ تاریخوں میں یہ واقعات تو ملتے ہیں کہ مسلمان علماء و فقہاء نے بادشاہانِ اسلام کے ہاتھ سے تکلیفیں اٹھائیں، مثلاً امام ابو حنیفہؒ و امام مالکؒ وغیرہ نے قیدیں بھگتیں، اور تازیانے کھائے لیکن ایک واقعہ بھی ایسا موجود نہیں کہ کسی غیر مذہب کے عالم کو اسلامی حکومت میں کچھ تکلیف پہونچی ہو، سلسلۂ بیان میں مجھے ایک بات یاد آگئی، اور خواہی نخواہی کہنا پڑتا ہے، کہ میری کتاب الفاروقؓ جب شائع ہوئی تو مسٹر آرنلڈ نے جو ہمارے کالج کے پروفیسر ہیں، اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا، اور لندن میں "ہیروز" کے سلسلہ میں داخل کرانے کی تحریک کی، چنانچہ اڈیٹر سے اس معاملہ میں خط و کتابت کی، دو مہینے کے گذرنے پر جواب ملا کہ ایک ایسی کتاب کا چھاپنا جو فاروقؓ "کے حالات میں ہے" ہماری پالیسی کے خلاف ہے"، حالانکہ اڈیٹر نے کتاب مذکور کو آنکھ سے دیکھا تک نہ تھا،

اس کے مقابلہ میں یہ واقعہ لحاظ کے قابل ہے کہ مامون الرشید کے زمانہ میں یعقوب کندی نے ایک مسلمان رئیس کو اسلام کے متعلق جو خط لکھا اور جس میں نہایت گستاخی سے اسلام پر حملے کئے، مامون الرشید کے سامنے جب وہ خط پیش ہوا تو اوس نے صرف یہ کہا کہ مذہبی خیال میں کسی پر جبر نہیں ہو سکتا، "لا اکراہ فی الدین"، چیرز

طرہ یہ کہ یورپ والے باوجود اس کے ہم مسلمانوں کو متعصب اور تنگ خیال کہتے ہیں، مسلمانوں کی بے تعصبی، روشن ضمیری، فراخ حوصلگی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے غیر قوموں کے علوم و فنون کے ساتھ وہی محبت اور دلچسپی ظاہر کی جو ان کو خود اپنے ذاتی علوم و فنون کے ساتھ تھی، وہ یونانی طب کو اپنا علم طب سمجھتے تھے، یہاں تک کہ آج ہمارے ہاں کے قدیم حکیموں سے جب کہا جاتا ہے کہ طب یونانی کی بہت سی غلطیاں ثابت ہوئیں، تو وہ لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں، گویا یہ علم خود انہی کا اور ان کے مورثوں کا علم ہے،

درس نظامیہ میں جس قدر کتابیں منطق اور فلسفہ کی شامل ہیں، اتنی خاص اسلامی علوم کی نہیں ہیں، تفسیر و فقہ کی صرف چند کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، لیکن منطق و فلسفہ کا یہ حال ہے کہ صغری و کبری سے شمس بازغہ تک اُن کا سلسلہ چلا جاتا ہے،

مسلمانوں کی بے تعصبی اس قدر بدیہی واقعہ تھا کہ یورپ مشکل سے اس کا انکار کرسکتا تھا، اس لئے یورپ نے بجائے اُس کے ایک دوسرا اعتراض قائم کیا اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کو کچھ ترقی نہیں دی، مسٹر ڈریپر نے لکھا ہے کہ "مسلمان درحقیقت ارسطو کی گاڑی کے قلی ہیں"

یورپ کے اس اعتراض کا جواب کہ مسلمانوں نے فلسفہ کو کچھ ترقی نہیں دی

افسوس یہ ہے کہ یورپ نے ہمارے علم کلام کی کتابیں نہیں پڑھیں ورنہ وہ دیکھتا کہ ہم ارسطو کے فلسفہ کو ہیچ سمجھتے تھے اور ہم نے دلائل سے اس کو ہیچ ثابت کیا تھا آپ کو سخت حیرت ہوگی کہ منطق جو ایک ایسا یقینی علم ہے جیسے کہ گرامر اور اس کا رد بظاہر ممکن نہیں، مسلمانوں نے نہایت باریک بینی سے اس پر نکتہ چینی کی، علامہ ابن تیمیہ کی کتاب "الرد علی المنطق" جو کئی سو صفحوں میں ہے آجکل

میرے استعمال میں ہے، میں دعوی سے کہتا ہوں کہ اگر اس کا ترجمہ یورپ میں شائع کیا جائے تو یورپ کی آنکھیں کھل جائیں،

فلسفہ کے خلاف مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور دو حیثیت سے لکھا ہے، اول یہ کہ وہ مسئلہ فلسفی حیثیت سے صحیح ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ مذہب کے مسائل سے مطابق ہے، یا نہیں، مثلاً فلاسفر کہتے ہیں کہ خدا خود اپنے اختیار سے کوئی فعل نہیں کرتا، بلکہ بلا اختیار تمام افعال اس سے سرزد ہوتے رہتے ہیں جس طرح آفتاب سے بلا اختیار روشنی پیدا ہوتی ہے، یہ عقیدہ مسلمانوں کے اعتقاد کے خلاف تھا، اس لئے علم کلام میں اس کو نہایت قوی دلائل سے باطل ثابت کیا گیا،

اس طرح اور بہت سے عقائد تھے، اور ان تمام مسائل میں مسلمانوں نے ارسطو کی غلطیاں ثابت کیں، یہ علم کلام کا ایک نہایت مختصر نمونہ اور اس کی تاریخ ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ آجکل ہم کو مذہب کی حفاظت کے لئے علم کلام کی ضرورت ہے یا نہیں اور ہے تو وہی قدیم علم کلام کافی ہے، یا ایک دوسرا علم کلام درکار ہے،

آج کل علم کلام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کی حفاظت کے سامان کی آج کل جس قدر ضرورت ہے کبھی کسی زمانہ میں نہ تھی،

قدیم زمانہ میں اوّلاً تو تربیت کا ایسا طریقہ تھا جو خود مذہب کی حفاظت کے لئے کافی تھا، ایک مسلمان بچہ جب مکتب میں بیٹھتا تھا، تو اس کو اس کا اُستاد مذہب کی مجسم تصویر نظر آتا تھا، بچہ کی ناروا باتوں پر ناجائز، منع، حرام، مکروہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے، اور یہ مختصر الفاظ فقہ کے بڑے بڑے مفصل احکام کا کام دیتے تھے، غرض چونکہ ابتدا ہی سے بچے مذہبی قالب میں ڈھالے جاتے تھے، اس لئے جوان ہوکر وہ بالکل مذہبی بن جاتے تھے،

اگر شاذ و نادر فلسفہ وغیرہ کے اثر سے مذہب میں تزلزل پیدا ہوتا تھا تو علم کلام کی
تصنیفات موجود ہوتی تھیں، لیکن آج دو باتوں میں سے ایک بھی نہیں،

تربیت تو اس لئے نہیں کہ اسکولوں اور مدرسوں میں مذہبی پابندی اور مذہبی خیالات کا نام نہیں لیا جا سکتا، جو گورنمنٹ ہم پر حکومت کر رہی ہے، اس کی رعایا میں مختلف مذاہب کے لوگ داخل ہیں، اور اس لئے وہ کسی مذہب کی تخصیص نہیں کر سکتی، اور درحقیقت اُس کو کرنا بھی نہیں چاہئے اسی ضرورت کے لئے مسلمانوں نے علی گڑھ میں اپنا مدرسہ الگ قائم کیا، اگر یہ ضرورت اشد انتظام پا جائے، تو دنیا میں کوئی چیز مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ مفید نہیں ہو سکتی،

قدیم علم کلام کا آج کل ناکافی ہونا

علم کلام کا یہ حال ہے کہ قدیم علم کلام جو طیار ہوا تھا، وہ فلسفۂ قدیم کے مقابلہ میں تھا اب سیکڑوں نئے مسائل پیدا ہو گئے، جن سے مسلمانوں کے عقائد پر اثر پڑتا ہے اور اُن کے دفعیہ کا کوئی سامان نہیں، مصر و شام میں بعض علما نے نیا علم کلام مرتب کرنا چاہا، مثلاً حسین جسر نے حمیدیہ نام کتاب لکھی، ایک اور مصنف نے "الدلیل الصادق" ایک بڑا رسالہ لکھا، لیکن چونکہ یہ علما، یورپ کے علوم سے بالکل ناآشنا ہیں، اسلئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں بے سروپا لکھتے ہیں،

ایک بڑے عالم صاحب نے فرمایا کہ خوردبین اور دوربین میں شیشوں سے جو کچھ نظر آتا ہے، اور جس کی بنا پر یورپ والے آسمان وغیرہ سے انکار کرتے ہیں وہ واقعی نہیں ہوتا، بلکہ صرف شیشہ کا اثر ہے جس طرح سبز عینک سے تمام چیزیں سبز نظر آتی ہیں، اور سُرخ سے سُرخ، آج کل جو لوگ نیا علم کلام مرتب کرنا چاہتے ہیں، ان میں صرف ایک شخص فرید وجدی بک ہیں جو فرنچ زبان کا بڑا ماہر ہے، اُس نے اسلام کے ثبوت میں متعدد تصنیفات لکھی ہیں، اور نہایت مدلل لکھی ہیں، وہ ایک ماہواری رسالہ بھی نکالتا ہے، جس میں علم کلام کی

بحثیں ہوتی ہیں،

اس قابل مصنف کے نمونہ پر میں نے ایک نہایت مفصل کتاب لکھنی شروع کی ہے، جس کے دو حصّے قرار دیئے ہیں، پہلے حصّہ میں قدیم علم کلام کی نہایت مفصل تاریخ اور اس پر ریویو ہے، دوسرے حصّہ میں جدید علم کلام کے مسائل ہیں،

اس دوسرے حصّہ میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا ہے، کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے، پھر نہایت تفصیل سے اس پر بحث کی ہے، کہ تمام مذاہب موجودہ پر اسلام کو کیا ترجیح حاصل ہے، چنانچہ اس موقع پر میں اپنی کتاب کے چند صفحے آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں،

مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے

اس نکتہ کے سمجھنے سے پہلے انسان اور حیوان کا مقابلہ کرو، حیوان اپنی تمام ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، اس کا لباس اس کے ساتھ ہوتا ہے، جو موسموں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنجہ، ناخن، ڈنک کے ہتھیار، اُن کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، جن غذاؤں پر اُس کی زندگی کا مدار ہے، پیدا ہونے کے ساتھ اس کو ہر طرف جنگل ہو یا پہاڑ، خشکی ہو یا دریا، ویرانہ ہو یا آبادی ہر جگہ مہیا ملتی ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان اُس کے پاس مُہیا نہیں ہوتا، اس کی جلد نازک ہوتی ہے، ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں، جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا، دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے، اس کے ساتھ عالم فطرت کی جتنی چیزیں اس کے گرد وپیش ہوتی ہیں، سب کی سب اُس کی دشمن نظر آتی ہیں، آفتاب کی گرمی، بادلوں کی جھڑی، لوؤں کی لپٹ، جاڑوں کی ٹھنڈ ہر چیز چاہتی ہے کہ اس کو تباہ کردے، یہی معنی ہیں، قرآن کی اس آیت کے "خلق الانسان ضعیفا"

ان مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کو کوئی مادی ہتھیار

نہیں دیا، کیونکہ جن بے شمار اور پرزور دشمنوں کو اُس کا سامنا کرنا تھا، اس کے لئے کوئی مادی آلہ کافی نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے قدرت نے اس کو مادی ہتھیاروں کے بدلے ایک ایسی عام قوت عطا کی، جس نے ہر مخالف کے مقابلہ کا جدا سامان تیار کیا، دھوپ، گرمی، جاڑے سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے، جانوروں کے مقابلہ کے لئے تیغ و خنجر طیار کئے، دریاؤں پر پل باندھے، پہاڑ تراشے، لوہا پگھلایا، برق کو مسخر کیا، ہوا کو تھاما، غرض تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو تمام کائنات اس کے پنجۂ اقتدار میں تھی، اس عام قوت کا نام عقل کلی یا عقلِ انسانی ہے،

لیکن چونکہ قدرت کو منظور تھا کہ انسان کی ترقیاں بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچکر ٹھہرنے نہ پائیں، اس لئے وہ (یعنی قدرت) ایک دم بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتی، وہ اس کے مخالفوں کو نئے نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے، جس سے ہر انسان پر نئے نئے طرح کے حملے کئے جاتے ہیں جن بیماریوں کا علاج معلوم ہو چکا تھا، ان کے علاوہ نئے امراض پیدا ہوتے ہیں، دنیا کا جغرافیہ جس قدر دریافت ہو چکا تھا، اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتہ لگتا ہے، اعدو ال نئی ضروریات پیش آتی ہیں، آرام و آسائش کے جو سامان ہو چکے تھے، راحت طلبی کا مادہ بڑھکر وہ سامان بے کار ہو جاتے ہیں، مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلہ کے لئے نئی طیاریاں کرتا ہے، اور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا، اس سے آگے نکل جاتا ہے، عالم کون اور انسان کی یہی باہمی کشمکش وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے، اور جس کی بدولت آج

؎ تیار اور [illegible]یاں اس کتاب میں ہر جگہ "ت" کی بجائے "ط" سے لکھا گیا ہے، مولانا شبلی مرحوم کی دیگر کتابیں جو اُن کی زندگی میں شائع ہوئیں، یہ الفاظ اسی طرح چھپے ہیں، نیز اردو کی بعض قدیم کتابوں میں بھی تیار کو طیار لکھا گیا ہے، محمد اقبال مجددی

یورپ میں سیکڑوں ہزاروں نئے نئے ایجادات کا سلسلہ قائم ہے، اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے لیکن ان بیرونی دشمنوں اور مخالفوں سے زیادہ عجب اور زیادہ خطرناک دشمنوں کا ایک گروہ ہے جو خود انسانوں کے اندر موجود ہے، اور جن سے انسان کو ہمیشہ سخت معرکہ آرائیاں رہتی ہیں طمع اس کو آمادہ کرتی ہے کہ عزیز و بیگانہ دوست و دشمن دور و نزدیک کی تمام دولت و مال پر قبضہ کر لیا جائے، کینہ پروری کا تقاضا ہے کہ مخالفوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، جاہ طلبی کہتی ہے جب تک تمام عالم کی گردنیں جھک نہ جائیں، آرام نہ لے، ان دشمنوں سے بچانے کے لئے ایک حد تک عقل کام آتی ہے، وہ بتاتی ہے، کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کرو گے، تو وہ بھی کرے گا، تم کسی کو برباد کرنا چاہوگے تو وہ بھی چاہے گا، تم دوسروں کی عزت نہ کرو گے تو وہ بھی نہ کریں گے، لیکن اول تو اس قسم کی پیش بینی اور انجام اندیشی عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص میں ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں، جہاں اس قسم کے مسلوب انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا، حکومت کا خوف، جاسوس کا ڈر، بدنامی کا احتمال، انتقام کا خطرہ، ایک چیز بھی نہیں ہوتی، ان موقعوں پر عقل ان پرزور مخالفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ ایک دوسری قوت ہے جو سینہ سپر ہوتی ہے، اور انسان کو ان دشمنوں کے حملہ سے بچاتی ہے اس قوت کا نام نور ایمان، کانشنس، حاسۂ اخلاقی ہے، اور یہی مذہب ہے۔

یہ قوت اس کی اصل فطرت میں داخل ہے، عالم و جاہل، رذیل و شریف، شاہ و گدا، افریقہ کا وحشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں) یہی معنی ہیں قرآن کریم کی اس آیت کے "فاقم وجهك للدين حنيفًا فطرة الله التي فطر الناس عليها، لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون"[1]

---

[1] یہ نکتہ تیرہ سو برس کے بعد اب یورپ کے حکما کے خیال میں آیا،

جرمن کا ایک حکیم لکھتا ہے کہ "مذہب ابدی چیز ہے، کیونکہ جس حاسہ کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانہ میں کبھی معدوم نہیں ہو سکتا" فرانس کا مشہور فاضل علم رینان اپنی کتاب "تاریخ مذہب" میں لکھتا ہے کہ "کل وہ اشیا جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں، اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محسوب ہو سکتی ہیں، مٹ جائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے، یا اس کی قوت میں زوال آجائے، وہ ہمیشہ اس بات کا علانیہ ثبوت دے گا، کہ مادی مذہب (میٹریلزم) بالکل غلط ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے۔"

پروفیسر سیتیر "فلسفۂ دینیہ" میں لکھتا ہے "میں کیوں پابند مذہب نہ ہوں، اس لئے کہ اس کے خلاف میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے، میں نے خود اپنی رائے پر یہی اعتراض کیا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا، ؟ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہے، اس سے زیادہ تمام انسانی سوسائٹی کو ہے، مذہب کی شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالی گئی ہیں، لیکن یہ جڑ ہمیشہ قائم رہی ہے، اور اس نے نئے برگ و بار پیدا کرلئے ہیں، اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے، جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی، مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور زیادہ گہرا کرتے جاتے ہیں، انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوتی ہے، اور اسی سے قوت پائے گی۔"

دنیا افراد انسانی کی خاص خاص مخصّصات یعنی زبان، قوم، ملک، صورت، رنگ کو حذف کرتے جاؤ، تو جو چیزیں مشترک رہ جائیں گی، ان میں ایک مذہب ہوگا، اور یہ اس

بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، جب چیزوں کی کمی ہم انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں، مثلاً اولاد کی محبت انتقام کی خواہش کمال کی قدردانی، ان کے فطری ہونے کی یہی وجہ قرار دیتے ہیں کہ تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں، اس بنا پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم، ہر طبقہ، ہر نسل کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب انسان کی فطری چیزوں میں شمار نہ کیا جائے، صرف اسی قدر نہیں بلکہ مذہب کے جو مقدم اصول ہیں، وہ تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں، خدا کا وجود اس کی پرستش کا خیال، حیات بعد الموت، اعمال کی جزا و سزا، رحمدلی ہمدردی، عفت کو اچھا سمجھنا، جھوٹ، دغا، زنا، چوری کو بُرا جاننا تمام دنیا کے مذہبوں کا اصل اصول ہے،

فطرت نے افراد انسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے، دولت ومال، جاہ وحشم، فضل وکمال، ذہن وذکا کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ ہو نہیں سکتی، سکندر و تیمور، ارسطو و افلاطون، ہومر و فردوسی اسی فیاضی کے نمونے ہیں، دوسری طرف یہ بخل ہے کہ انسان اور بندر میں اتنا کم فرق رہ جاتا ہے کہ ڈارون کو نظر بھی نہیں آتا، با اینہمہ جو باتیں شرط زندگی اور مدار حیات ہیں، وہ تمام افراد انسانی کو یکساں عطا کی ہیں، افریقہ کا جاہل وحشی بھی اسی طرح کھاتا، پیتا، چلتا، پھرتا، سوتا، جاگتا، بولتا چالتا ہے جس طرح یونان کا بڑے سے بڑا حکیم ان ضروریات کو انجام دیتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جو تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہے، لازمۂ انسانی تھا، اور اس وجہ سے قدرت نے تمام قوموں کو یکساں عطا کیا، ارسطو اور مبتہم بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ تک پہونچے کہ سچائی، دیانت داری، عفت، علم، اچھی چیزیں ہیں لیکن افریقہ کا ایک وحشی بغیر کسی تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے خود بخود ان چیزوں کو اچھا جانتا ہے، اور اچھا سمجھتا ہے،

ان تمام باتوں سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ نفس مذہب اور مذہب کے مقدم اصول فطری چیزیں ہیں، جو انسان سے جدا نہیں ہوسکتیں اور جو لوگ اس سے الگ ہونا چاہتے ہیں وہ گویا اصول فطرت کو توڑنا چاہتے ہیں[۱]؎

لکچرار نے یہاں پہونچ کر کہا کہ افسوس میں بالکل تھک گیا، اور اس وجہ سے اس مضمون کا وہ حصہ جس میں خاص مذہب اسلام کی صحت اور ترجیح کا ذکر ہے نہیں پڑھ سکتا۔

۱؎ معارف :- الکلام میں قریب قریب یہ پورا حصہ موجود ہے، مگر اس وقت یہ کتاب مسودہ کی شکل میں تھی، اس لئے بعد میں جا بجا الفاظ کا ردوبدل ہے، بلکہ بعض پیراگراف بھی جو اس لکچر میں نہیں ہیں، بڑھائے گئے ہیں، اور تقریر کا آخری پیراگراف الکلام میں نہیں ہے،

مطبوعات جدیدہ

مآثر الامراء: مترجمہ پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات: ۹۲۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: - مرکزی اردو بورڈ - ۳۶ - جی گلبرگ لاہور، پاکستان،

صمصام الدولہ میر عبدالرزاق شاہنواز خان (م ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۸ء) محمد شاہی عہد کے نامور امیر تھے، اورنگ آباد (دکن) کے نواب آصف جاہ اول اور اُن کے فرزندوں نظام الدولہ اور صلابت جنگ وغیرہ کی سرکار میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے تھے، سرکاری مشغولیتوں کے باوجود علمی ذوق اور فارسی ادب و انشاء کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے، سیر و تاریخ پر اُن کی نگاہ بڑی وسیع تھی، ان کی تصنیفات میں مآثر الامراء زیادہ اہم اور مشہور ہے، جو اکبر سے محمد شاہ کے زمانہ تک کے سات سو تیس امراء اور سرداروں کے حالات اور اُن کے علمی و انتظامی کارناموں اور دوسرے ضمنی و عجیب اور متفرق معلومات پر مشتمل ہے، ۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے دو لائق اساتذہ مولوی عبدالرحیم اور مرزا اشرف علی خان نے اس کا مکمل فارسی متن ترتیب و تصحیح کے بعد تین ضخیم جلدوں میں، اور اس کی مفصل فہرست مضامین، اور اسماء، اعلام اور بلاد و اماکن کا اشاریہ ایک مستقل جلد میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سے شائع کیا تھا، مآثر الامراء کا انگریزی اور اس کے بعض حصوں کا ہندی ترجمہ بھی پہلے چھپ چکا ہے، اب پاکستان کے مشہور صاحب قلم محمد ایوب صاحب قادری نے جن کو تاریخ ہند اور فن و سیر و تراجم سے خاص ذوق اور فارسی کتابوں کے ترجمہ کرنے کا اچھا

سلیقہ سے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے، زیر نظر کتاب پہلی جلد کا ترجمہ اور تیموری دور کے ۲۱۵ ہندو امرا کے حالات و کارناموں پر مشتمل ہے، اس میں ایشیاٹک سوسائٹی کے مندرجات و فہارس کے علاوہ فاضل مترجم نے شروع میں مصنف کے مختصر حالات اور مآثر الامرا کا مبسوط تعارف اور آخر میں مغل فرمانرواؤں کے سالہائے جلوس کی فہرست اور فٹ نوٹ میں انگریزی مترجم کے حواشی اور کہیں کہیں خود بھی مختصر معلوماتی حواشی کا اضافہ کر دیا ہے، اس سے اس کا افادہ بڑھ گیا ہے، یہ کتاب تیموری عہد کے تقریباً دو سو سالہ واقعات اور اس دور کے قدیم خاندانوں کے متعلق مستند معلومات کا ذخیرہ اور تاریخ ہند کے سلسلہ میں ایک معتبر ماخذ ہے، اس کے ترجمہ سے اردو کے سوانحی و تاریخی ذخیرہ میں بیش قیمت اضافہ ہوا ہے، اس کے لئے مترجم اور ناشر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں،

نئے مشاہدات اور معجزۂ شق القمر مرتبہ مولانا معین الدین رہبر فاروقی متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت، طباعت، قدرے بہتر، صفحات ۳۰۸،

قیمت: عہ، مکتبہ نشأۃ ثانیہ معظم جاہی، مارکٹ حیدرآباد سے اور مصنف سے بیرون یاقوت پورہ محلہ علی بن ۱۷-۳-۵۰۴، حیدرآباد (۲۳) آندھرا پردیش کے پتہ سے مل سکتی ہے،

اس کتاب میں معجزہ کی حقیقت اور عام معجزات خصوصاً معجزۂ شق القمر پر بحث کی گئی ہے، اور چاند کے متعلق موجودہ تحقیقات، دور خلائی مشاہدات کی تفصیل اور انشقاق قمر سے متعلق آیات کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے، اور اس معجزہ کے منکرین کو گمراہ اور کافر کہا گیا ہے، بلاشبہ قرآن کے نص صریح کا منکر کافر ہے لیکن انشقاق قمر کی آیتیں معجزۂ شق القمر کے باب میں صریح نہیں ہیں بلکہ وہ قیامت کے احوال پر بھی منطبق ہوتی ہیں، علمائے سلف میں بھی اس رائے کے علماء گذرے ہیں، ایسے محتمل نص کی بنیاد پر تکفیر بڑی جسارت ہے، پھر موجودہ خلائی مشاہدین نے چاند میں جن غاروں

اور گڑھوں کا انکشاف کیا ہے، ان کو قرآن کے لفظ انشقاق سے کوئی مناسبت نہیں، اس معجزہ کے آثار و نشانات کے باقی رہنے پر جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے، اس کی تعبیر میں مصنف سے سخت سہو ہوا ہے، اسی طرح عام معجزات کے آثار کے بقا کی جو مثالیں دی گئی ہیں، ان میں کشتی نوحؑ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، اور حضرت مسیحؑ کے بنائے ہوئے پرندہ کے موجود ہونے کی خود مصنف کوئی قرآنی شہادت نہیں پیش کر سکے ہیں، صرف رطب و یابس تفسیری اقوال کا سہارا لیا گیا ہے، سورۂ رعد کی آیتوں میں بھی معجزات کے آثار کے بقا کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت کا خصوصی مفہوم لینے کی صورت میں بھی مصنف کا مدعا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس صورت میں اس سے ظہور معجزات کے قدیم قانون کے محو و اثبات کی طرف اشارہ ہوگا، ص ۵۱ تا ۵۶ میں مختلف عنوانات کے تحت آیات قرآنی سے جو قضایا و مقدمات ترتیب دیئے گئے ہیں، ان میں سے بعض کا ثبوت محل نظر اور بعض سرے سے ثابت ہی نہیں، ص ۹۴، "ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین" میں کتاب مبین سے قرآن مراد لینا صحیح نہیں ہے، ص ۲۰۴ تا ۲۰۶ میں معجزہ شق القمر کے بعد کفار کو عذاب نہ دیئے جانے کی جو وجوہ تحریر کئے گئے ہیں، انکو اگر درست مانا جائے تو معجزہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، آخری باب میں، ان ملکوں کے ذکر میں جن میں اس معجزہ کا مشاہدہ کیا گیا تھا، ہندوستان کے جن اشخاص کے مشاہدہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تاریخی حیثیت سے مستند نہیں، اور نہ ان لوگوں کی رسول اللہ سے معاصرت ہی یقینی طور پر ثابت ہے، یہ کتاب خلائی مشاہدات اور موجودہ تحقیقات سے قرآنی بیانات کی تصدیق کے لئے لکھی گئی ہے، اس لئے اس کو مدلل ہونا چاہیئے تھا، کمزور، محتمل اور غیر مسلّمہ مقدمات پر تصنیفات کی بنیاد نہیں رکھی جاتی، بعض مباحث میں تکرار اور انداز بیان میں بھی الجھاؤ ہے، تاہم کتاب بڑی محنت و کاوش اور نیک جذبہ سے لکھی گئی ہے،

مقالات احسان، مرتبہ جناب مرزا احسان احمد صاحب، بڑی تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ،

صفحات ۲۹۰، قیمت ۶۰ر، پتہ:- دارالمصنفین، اعظم گڑھ - (یو-پی)

ہمارے شہر کے نامور شاعر مرزا احسان احمد صاحب وکیل چمنستان شبلی کے دیدہ ور سخن سنج ہیں، اُن کا اور مولوی اقبال احمد خاں سہیل مرحوم کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، ایک زمانہ میں ان دونوں کے ذوق سخن کی وجہ سے اعظم گڑھ کی سرزمین شعر و سخن کے ترانوں سے معمور رہتی تھی، مرزا صاحب کے خیالات بلند، ذہن نکتہ سنج، اور ذوق نہایت ستھرا ہے، انھوں نے نہ صرف شعر و سخن کی زمین میں گل بوٹے کھلائے ہیں بلکہ ادب و تنقید کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، وہ کم کہتے اور کم لکھتے ہیں لیکن جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہ ادب و انشا کا دلکش نمونہ ہوتا ہے، انھوں نے گذشتہ نصف صدی کے اندر بہت سے ادبی و تنقیدی مضامین لکھے جو معارف اور دوسرے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوئے، اب انھوں نے اس کا مجموعہ شائع کیا ہے، جو سولہ مضامین پر مشتمل ہے، مرزا صاحب کے نزدیک غزل گو شاعر کیلئے صاحب مذاق فنکار ہونے کے ساتھ حسن و عشق کا عظمت شناس، صاحب درد اور بیدار قلب ہونا بھی ضروری ہے، اسی معیار پر انھوں نے ماضی قریب کے اکابر غزل گو شعرا کے کلام کو جانچا ہے، اور اصغر، جگر اور سہیل کے محاسن کلام اور فانی کی شاعری کے معائب دکھائے ہیں، مصنف مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے خاص عقیدتمندوں میں ہیں، اس لئے ان دونوں کے فارسی کلام کی خصوصیات اور علامہ شبلیؒ کے تحقیقی کارناموں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، "اردو شاعری" اور "قدیم مذاق سخن کے معائب" میں جدید رجحانات کا خیر مقدم اور فرسودہ انداز سخن کی مذمت کی گئی ہے، مرزا صاحب کا مذاق تغزل بڑا لطیف ہے، اور وہ نوحہ و ماتم، گور و مرقد اور سوقیت و ابتذال کو غزل جیسی لطیف اور پاکیزہ صنف سخن میں گوارا نہیں کرتے، اس لئے لکھنؤ اسکول کے طرز پر کم و بیش ہر مضمون میں تنقید کی گئی ہے، اور ایک مضمون نواب جعفر علی خاں اثر کے رد و قدح میں ہے، مصنف کا اصل میدان شعر و سخن ہے لیکن ایک مضمون مشہور افسانہ نگار نسیم الم کی افسانہ نگاری کی خصوصیات پر بھی ہے، اب تنقید کا انداز بہت بدل گیا ہے، اسلئے بعض نئے ناقدین کیلئے مرزا صاحب کے بعض آرا و خیالات پر تنقید کی گنجائش ہوگی، ادبی حیثیت سے یہ مضامین دلکش اور بصیرت افروز ہیں،

ض

مصنفات مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: [illegible]

۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) " [illegible]

۳۔ اسوۂ صحابیات: " [illegible]

۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: [illegible]

۵۔ حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: [illegible]

۶۔ حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: [illegible]

۷۔ شعر الہند (حصہ اول) " [illegible]

۸۔ شعر الہند (حصہ دوم) " [illegible]

۹۔ انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کی ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: [illegible]

۱۰۔ سیرۃ عمرؒ بن عبد العزیز: (زیر طبع)

۱۱۔ امام رازی: امام فخر الدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت [illegible]

۱۲۔ ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل اُن کے فلسفہ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت [illegible]

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی و تاریخی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعرا کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دار المصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۲۴۶ قیمت: [illegible] مینجر دار المصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلاتفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ ازاد و بوم سرتاپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اُن کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اُس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور اُن کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخِ اسلام میں اُن کا مرتبہ، بلاتفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق، اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، اُن کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت:۔ ۲۳۰ صفحے، قیمت:۔ بجر

جسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) نومبر ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

جلد ۱۰۴ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۹ء عدد ۵

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

مسلم یونیورسٹی کا معاملہ ابتک معلق ہے، اور اس وقت حکومت خود ایسے حالات میں مبتلا ہو کہ فی الحال اس طرف توجہ کی امید نہیں، ہم بار ہا اس مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں، اُس وقت ہمارا خطاب حکومت سے تھا، اس مرتبہ یونیورسٹی کے اسٹاف، طلبہ اور ذمہ داروں سے کچھ عرض کرنا ہے، یونیورسٹی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ صریح الفاظ میں اس کی ملی خصوصیات اور تہذیبی روایات اور سیکولر اصطلاح میں اقلیتی کردار کے تحفظ کا ہے، اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ خود یونیورسٹی کے اسٹاف اور ذمہ داروں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ خود کہاں تک اقلیتی کردار کا نمونہ پیش کرتے ہیں، اسکے بعد حکومت سے اس کے مطالبہ کا حق ہوگا، اقلیتی کردار کے تحفظ کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ یونیورسٹی کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں اور ان کی اکثریت قائم رہے، اور نام کے مسلمان اس سے حصول جاہ و مال کا فائدہ اٹھاتے رہیں، بلکہ یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کے ساتھ یونیورسٹی میں اسلامی فضا بھی رہے، اس کے احاطہ میں اس کے کسی متوسل کو خواہ وہ کسی درجہ کا ہو، غیر اسلامی اور ملحدانہ خیالات کی اشاعت کی اجازت نہ ہو، اسلامی شعائر کا پورا احترام کیا جائے، اس کے خلاف کوئی چیز نہ ہونے پائے، اس کے بغیر اقلیتی کردار کے تحفظ کا مطالبہ بے معنی ہے، مسلمانوں کا کردار ملحدانہ خیالات اسلامی آداب و اخلاق سے آزادی، کلچرل پروگراموں، عورتوں اور مردوں کے بے باکانہ اختلاط اور بزم شبانہ کی سرمستیوں کا نام نہیں ہے، اگر اقلیتی کردار کا مطلب یہی ہے تو مسلم یونیورسٹی کا ختم ہو جانا بہتر ہے، حیرت اُن لوگوں پر ہوتی ہے جو اسلامی تہذیب و روایات کی بیخکنی بھی کرتے ہیں اور اس کے

نام سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔

~.~.~.~.~.~.~.~

اس صوبہ میں عربی مدارس کے بعد عربی اور فارسی تعلیم کا ذریعہ عربی فارسی اگزامینیشن بورڈ کے امتحانات تھے، ان کی سند ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کی عربی و فارسی ٹیچری کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی، اور ان امتحانوں کے پاس شدہ کی خاصی تعداد ان میں کھپ جاتی تھی، ان کو یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ وہ ہائی اسکول سے لیکر یونیورسٹی تک صرف انگریزی میں امتحان دے کر ان کی سند حاصل کر سکتے تھے، اب یہ دونوں رعایتیں ختم ہوگئی ہیں، اور عربی و فارسی ٹیچری کے لیے بھی بی اے بی ایڈ کی قید ہوگئی ہے، اس کے مقابلہ میں ہندی اور سنسکرت کے شاستری وغیرہ کے امتحانات کے پاس شدہ کو اب بھی یہ سہولتیں حاصل ہیں، جو سراسر انصاف کے خلاف ہے، دوسرے اس سے عربی و فارسی کی تعلیم کا معیار گر جائیگا، کیونکہ منشی اور فاضل وغیرہ کی عربی و فارسی کی استعداد ان لوگوں سے عموماً بہتر ہوتی ہے جو انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں بطور مضمون کے عربی و فارسی پڑھتے ہیں، تیسرے اگر ان کو عربی و فارسی ٹیچری کے حقوق نہیں ملتے تو پھر ان کے امتحانات کون دے گا، اور رفتہ رفتہ یہ محکمہ ہی ختم ہو جائے گا، ہندوستان کے تعلقات تمام عربی اور فارسی ملکوں سے ہیں، اس لیے اب یہاں پہلے سے زیادہ عربی و فارسی کی تعلیم اور اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے، نہ کہ اس کو ختم کرنے کے اسباب پیدا کیے جائیں، اس لیے منشی اور فاضل وغیرہ کو جو حقوق پہلے حاصل تھے وہ پھر ملنے چاہئیں۔

اس سال آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا اجلاس ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو

دار المصنفین میں ہوگا۔ کانفرنس کی طرف سے اس کے دعوت نامے جاری ہو چکے ہیں، بڑے شہروں کے اجلاس میں کانفرنس کی شرکت کے علاوہ لوگوں سے ملنے ملانے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں سیر و تفریح کی دلچسپیاں بھی ہوتی ہیں، اس لیے ان کی کشش بھی لوگوں کو کھینچ لاتی ہے۔ مقامی اصحاب ذوق بھی شریک ہوتے ہیں، اس لیے اچھا اجتماع ہوجاتا ہے۔ اعظم گڈھ میں دار المصنفین اور کانفرنس کے علاوہ اور کوئی کشش نہیں ہے، اس لیے اس میں شرکت خود شرکاء کے ذوق کا امتحان ہے۔ اس کی پوری کوشش ہے کہ یہ کانفرنس اجتماع کی حیثیت سے کامیاب رہے۔ چنانچہ کانفرنس کے دعوت ناموں کے علاوہ خود دار المصنفین سے بھی اصحاب علم کو خطوط لکھے گئے ہیں، ہم کو توقع ہے کہ وہ اپنی شرکت سے اجلاس کو کامیاب بنائیں گے۔

افسوس ہے کہ محمد اجمل خانصاحب ممبر پارلیمنٹ نے طویل علالت کے بعد انتقال کیا، مرحوم پرانے کانگریسی تھے، ان کا وطن الہ آباد تھا، انھوں نے پنڈت جواہر لال کے ساتھ قید و بند کی مصیبتیں جھیلی تھیں، آزادی کے بعد عرصہ تک مولانا ابو الکلام کے سکریٹری رہے، اس زمانہ میں کئی مرتبہ ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا، سیاسی ذوق کے ساتھ صاحب علم و قلم بھی تھے، عربی سے پوری طرح واقف تھے، ان کا خاص موضوع کلام مجید کی نزولی ترتیب تھا، اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے سیرت قرآنی کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سیرت لکھی تھی، ادب و انشا کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، غبار خاطر پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ مولانا ابو الکلام کے رنگ میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ ان کے قلم کا ہے یا خود مولانا ابو الکلام کے قلم کا، وہ اپنے بعض خیالات میں منفرد تھے لیکن اسلامی حمیت ان میں پوری طرح موجود تھی، بلکہ حالات نے ان کو اور بڑھا دیا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگذر اور ان کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

حضرت میر علی عاشقان سرائمیری

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

ہمارے دیار "شیراز ہند پورب" میں دسویں صدی میں ایک بزرگ حضرت میر سید علی بن قوام الدین سرائمیری جونپوری متوفی سنہ ۹۵۰ھ رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں، جو اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ہندوستان کے اولیائے کبار اور مشائخ عظام میں شمار کیے جاتے ہیں، ہندوستان و بیرونِ ہند کے تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں ان کا تذکرہ لکھا ہے جنہیں ان کے حالات، واقعات اور اوصاف و کمالات درج کیے ہیں، جنکی تفصیل یہ ہے:-

(۱) سب سے پہلے شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے میر صاحب کے حالات اخبار الاخیار میں لکھے ہیں، جو بعد کے تذکروں کے مقابلہ میں زیادہ مستند اور مفصل ہیں، شاہ صاحب کے والد شیخ سیف الدین دہلوی متوفی سنہ ۹۹۰ھ نے میر صاحب سے ملاقات کی تھی، اور وہ دیار پورب کے مشائخ میں شیخ یوسف چریاکوٹی اور شیخ سلطان بہرائچی سے بھی ملے تھے، شاہ صاحب نے ان بزرگوں کے تذکرہ میں اس کی تصریح کی ہے، شاہ صاحب نے میر صاحب کے حالات اپنے والد کی زبانی اخبار الاخیار میں بیان کئے ہیں، اس لیے بعد کے موزخوں کے مقابلہ میں ان کا بیان سب سے زیادہ مستند ہے۔

(۲) شاہزادہ دارا شکوہ متوفی ۱۰۶۹ھ نے سفینۃ الاولیاء میں میر صاحب کا ذکر کیا ہے،
جس کا ماخذ اخبار الاخیار معلوم ہوتا ہے،

(۳) شیخ محمد امین بن فضل اللہ محبی شامی متوفی ۱۱۱۱ھ نے خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن
الحادی عشر میں شیخ تاج الدین سنبھلی کے تذکرہ کے ضمن میں ان کے شیخ الشیخ کی حیثیت سے میر صاحب کا حال
لکھا ہے جس میں بعض مشائخ کی زبانی میر صاحب کے علو مرتبت اور کشف و کرامت کا بیان ہے،
مگر بہت مختصر ہے،

(۴) گذشتہ صدی کے عالم و بزرگ شیخ یوسف بن اسماعیل نبہانی نے جامع کرامات الاولیاء
میں خلاصۃ الاثر کا بیان نقل کر دیا ہے۔

(۵) شیخ عبد الصمد بن فضل محمد تمیمی انصاری نے اخبار الاصفیاء میں میر صاحب کا تذکرہ کیا ہے
جس میں چند نئی اور اہم باتیں ہیں، اس لیے یہ کتاب اخبار الاخیار اور خلاصۃ الاثر کے بعد میر صاحب
کے تذکرہ کا تیسرا مستند ماخذ ہے، اخبار الاصفیاء کا قلمی نسخہ میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے،

(۶) شیخ نظام الدین احمد بن محمد صالح صدیقی نے کرامات الاولیاء میں میر صاحب کے تذکرے
میں ان کی بعض کرامتوں کا ذکر کیا ہے، جو سب سے الگ اور نئی ہیں، اس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے،

(۷) شیخ سید علی موسوی حیدر آبادی نے مشکوٰۃ النبوۃ میں شیخ قاضن (محمد بن علاء الدین
قاضن متوفی ۹۴۰ھ) کے ذکر میں ان کے دو اکمل خلفاء میں میر صاحب کا ذکر کیا ہے، مشکوٰۃ النبوۃ
کا قلمی نسخہ بھی میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے،

(۸) شیخ محمد بن حسن غوثی مندوی نے گلزار ابرار (سنہ تصنیف ۱۰۲۲ھ) میں میر صاحب
کا تذکرہ کیا ہے جو زیادہ تر ان کے وجد و سکر اور جذب و حال کی کیفیات کے بیان پر مشتمل ہے،
اس کا ترجمہ اذکار ابرار میرے سامنے ہے،

(۹) مفتی غلام سرور ہاشمی لاہوری نے خزینۃ الاصفیا میں میر صاحب کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے، جو زیادہ تر اخبار الاخیار سے ماخوذ ہے۔

(۱۰) مولوی امام الدین گلشن آبادی نے تاریخ الاولیاء میں میر صاحب کا حال لکھا ہے، جو اخبار الاخیار کا خلاصہ در خلاصہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۱) مولانا سید عبد الحیٔ لکھنوی متوفی ۱۳۴۲ھ نے نزہۃ الخواطر میں میر صاحب کا حال نسبۃً تفصیل سے لکھا ہے جو زیادہ تر شیخ علی عارف کے رسالہ عاشقیہ اور شیخ محبی شامی کی کتاب خلاصۃ الاثر سے ماخوذ ہے، اس کتاب میں میر صاحب کے کئی خلفاء کے حالات درج ہیں۔

(۱۲) مولوی حکیم عبد المجید مصطفیٰ آبادی نے سمات الاخیار میں جونپور کے خانوادۂ رشیدی کے حالات میں ضمناً ایک مقام پر حاشیہ میں میر صاحب کے حالات لکھے ہیں جو گویا سفینۃ الاولیاء کی عبارت کا ترجمہ ہے، میر صاحب کے خاندان کے آخری دور کے بعض بزرگوں کا حال بھی لکھا ہے۔

ان ہی کتابوں سے میر صاحب کا یہ تذکرہ مدون و مرتب شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

دیار پورب کی دینی و علمی مرکزیت | مسلم دور حکومت میں دہلی کے مشرق میں صوبۂ الہ آباد، صوبۂ اودھ اور صوبۂ عظیم آباد پر جو خطہ مشتمل تھا، اس کو ملک پورب کہتے تھے، جس کے قصبات شہروں کی حیثیت رکھتے تھے، ان میں علماء و مشائخ، امراء و شرفاء کی آبادیاں تھیں اور مساجد و مدارس اور خانقاہوں کی کثرت تھی، اور یہاں کا ہر قصبہ شہر کے حکم میں تھا[۱]

بلاد پورب میں دینی و علمی شان و شوکت اور ایمانی و روحانی جلال و جمال کی بزم آرائی کی ابتدا بہت پہلے ہو چکی تھی، مگر اس کا شباب سلاطین شرقیہ جونپور (۷۹۶ھ تا ۸۸۳ھ) کے دور میں ہوا اور تیموری بادشاہ محمد شاہ عالم کے زمانہ ۱۱۳۰ھ میں ختم ہو گیا، جونپور کے تیسرے حکمراں سلطان ابراہیم شاہ

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۵۳ تذکرہ ملا محمود جونپوری

شرقی کا چالیس سالہ دورِ حکومت (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) بڑا ہی مبارک و مسعود تھا۔ اس دور میں جونپور دہلی ثانی، دار العلم اور دار الامان کہلاتا تھا[1]، آشوب زمانہ سے پریشان حال اہلِ کمال کارواں در کارواں اس دار العلم اور دار الامان میں آکر عیش دوروزہ میں غم فردا سے آزاد زندگی بسر کرتے تھے، اس کے بعد لودھیوں کے دورِ حکومت (۸۸۱ھ تا ۹۳۲ھ) میں بھی علم و دانش اور فضل و کمال کی یہ بزم سجی رہی، اگرچہ سلاطین شرقیہ کے اقبال کا آفتاب زوال پذیر ہوگیا تھا، مگر ان کے دور کی ایمان و یقین کی شمعیں ہر طرف روشن تھیں، پھر جب زمانہ نے کروٹ لی اور ۹۳۲ھ میں تیموری سلطنت قائم ہوئی تو دیار پورب کے چمن علم و فضل میں ایک نئی بہار آئی اور تیموری سلطنت کے دوسرے بادشاہ محمد نصیر الدین ہمایوں کے عہد سلطنت (۹۳۶ھ تا ۹۶۳ھ) میں جونپور کی علمی و دینی اقبال مندی نے دیار پورب کو شیراز ہند بنا دیا، چنانچہ ۹۴۷ھ میں جب ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں شکست کھائی، اور ہرات و مشہد کی راہ سے قزوین پہنچکر شاہ ایران طہماسپ شاہ صفوی سے ملاقات کی تو اس نے پہلی ملاقات میں علمائے جونپور کے بارے میں پوچھا، اور جب ہمایوں کی زبانی یہاں کے علماء و فضلاء کی کثرت کا حال سنا تو اپنے شہر شیراز کی ویرانی پر بڑی حسرت ظاہر کی، ہمایونی دور کے جونپور اور یہاں کے علماء و فضلا کی کثرت کا نقشہ ملا محمد اصفہانی نے سیر الملوک میں ان الفاظ میں کھینچا ہے،

"از مضافاتِ الہ آباد شہریست کہ سلطان فیروز دہلوی آں را در سنہ ہفت صد و ہفتاد و دو ہجری (۷۷۲ھ) بنا نہادہ و بجونپور موسوم ساختہ، در عہد سلاطین شرقیہ دار السلطنت شدہ، صدہا مدارس و مساجد در شہر و حوالی آن معمور شدند۔

---

[1] طبقات اکبری ص ۵۲۸ و تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

علما و فقرا از اقالیم دور دراز دراں بلدہ رسیدہ، سلاطین و حکام برائے ہر یکے وظائف و التمغا جاگیر بخشیدہ، شہنشاہ ایران طہماسپ از امیر ہمایوں در نخستین ملاقات از فضلائے جونپور پرسیدہ، و با در اک کثرت و انبوہ علما و دراں دیار بر دیدانی شہر شیراز آہ حسرت کشیدہ۔"[1]

اس دور میں دیار پورب میں بہت سے علما و مشائخ کے علمی و دینی خانوادے رشد و ہدایت کے گہوارے تھے، اور مختلف ملکوں کے طالبین و مسترشدین ان سے فیضیاب ہوتے تھے، ان سبھی میں اس دیار کے مشہور بزرگ حضرت شیخ میر سید علی بن قوام الدین سراٸیری جونپوری المتوفی سنہ ۹۵۰ھ رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، جن کو میر علی عاشقان بھی کہتے ہیں، اور جو اپنے اگلے پچھلے دور کے لیے العقد واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں، آئندہ صفحات میں انہی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نام و نسب اور خاندانی حالات عام تذکرہ نویسوں نے میر صاحب کا سلسلۂ نسب بیان نہیں کیا ہے، کسی نے ان کا نام سید علی قوام[2] کسی نے میر سید علی قوام الدین[3]، اور کسی نے سید علی بن قوام الدین لکھا ہے[4]، کرامات الاولیاء میں میر سید قوام ہے، جو کاتب کی غلطی ہے[5]، البتہ نزہۃ الخواطر میں میر صاحب کے دادا سید سعید بن محفوظ کے ذکر میں جو سلسلۂ نسب درج ہے، اس سے ان کا نسبی سلسلہ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، میر سید علی بن قوام الدین بن سعید بن محفوظ بن حسین بن عبد المجید بن نعمان بن حمزہ بن حسین بن ابوبکر بن عمر بن احمد حسینی ترمذی، لاہوری، سوانزی جونپوری، سراٸیری،[6]

---

[1] جونپور نامہ قلمی ص ۴۰ از مولوی خیر الدین محمد الہ آبادی، مملوکہ دار المصنفین [2] اخبار الاخیار ص ۱۲۱ مطبع ہاشمی وخزینۃ الاولیاء ج ۱ ص ۲۲۳ مطبع ثمر ہند لکھنؤ، وسفینۃ الاولیاء ص ۱۰۹ مطبع نولکشور، وتاریخ الاولیاء ج ۲ ص ۲۳۸ مطبع فتح الکریم بمبئی [3] اخبار الاصفیاء قلمی ص ۵۹، [4] خلاصۃ الاثر ج ۱ ص ۲۰۸ طبع مصر وجامع کرامات الاولیاء ج ۲ ص ۱۷۰ طبع مصر، ونزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴۳ مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد [5] کرامات الاولیاء ص ۱۶۲ [6] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۸۲

مقامات کی نسبتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے آباء و اجداد ترمذ اور لاہور سے ہوتے ہوئے سرہند کے قریب مقام سوانہ میں آباد ہوئے، یہ خاندان سوانہ میں کب آیا اور کب آباد ہوا؟ اسکا پتہ نہیں چلتا، البتہ میر صاحب کے دادا سعید بن محفوظ کا مولد سوانہ ہے[1] جس سے پتہ چلتا ہے کہ انکے پردادا محفوظ بن حسین یا ان سے پہلے کوئی بزرگ یہاں آئے ہوں گے، بعد میں یہ خاندان سادات سوانہ کے لقب سے مشہور و متعارف ہوا، اخبار الاخیار میں ہے "اور در اصل از سادات سوانہ است" (ص ۲۱۲)۔ اسی قسم کی عبارت خزینۃ الاصفیاء (ج ۱ ص ۴۲۳)، اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار (ص ۲۰۹) اور تاریخ الاولیاء (ج ۲ ص ۲۳۸) میں ہے اور سفینۃ الاولیاء میں مزید تشریح کے ساتھ درج ہے: "از سادات سوانہ کہ در نزدیکی سرہند است"۔ (ص ۱۹۰)، اخبار الاصفیاء میں صرف "از سادات بزرگ" ہے (۹۵)

میر صاحب کی جائے ولادت کے بارے میں عام تذکرہ نگار خاموش ہیں، البتہ صاحب اخبار الاصفیاء نے تصریح کی ہے کہ ان کا مولد سوانہ ہے[2]، خلاصۃ الاثر میں مسکن و مدفن کی طرح مولد بھی جونپور لکھا ہے[3] جو صحیح نہیں ہے کہ میر صاحب کا سنہ پیدائش بھی معلوم نہیں ہے، مگر اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے ان کے پہلے مرشد و مربی حضرت قاضن کی وفات ۹۲۰ھ میں ہوئی، اور ان کی خدمت میں حاضری سے پہلے وہ دہلی میں یا کسی اور جگہ کچھ دنوں رہ چکے تھے، ظاہر ہے کہ شیخ قاضن کے یہاں ان کی حاضری ۹۲۰ھ سے پہلے ہوئی ہوگی، اگر اسے ۹۰۰ھ میں مان کر ان کی عمر اس وقت بیس سال کی مان لیجائے تو پیدائش ۸۸۰ھ کے حدود میں ہوئی ہوگی،

آپ کے والد سید قوام الدین سوانہ کے مشہور اصحاب علم و فضل میں تھے، اپنے والد شیخ سعید ابن محفوظ سے تحصیل علم کی تھی، اور ان کو علم و فضل سے حصہ وافر ملا تھا، سنبھل کے قریب کسی مقام پر

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۸۔ [2] اخبار الاصفیاء ص ۷۹۔ [3] خلاصۃ الاثر ج ۳ ص ۶۸۷

امیر یا حاکم تھے. جہاں آپ کو قتل کر دیا گیا اور جوگی پور نامی گاؤں میں دفن کیے گئے، اس وقت میر صاحب بچے تھے، یتیمی کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا محمد بن سعید نے کی،[1]

میر صاحب کے دادا شیخ سعید بن محفوظ نویں صدی کے صلحا و مشائخ میں تھے، سوانہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، طریقت و روحانیت کی تعلیم و تلقین شیخ صدر الدین راجو قتال متوفی ۸۲۷ھ اور شیخ بدیع الدین مدار سے پائی تھی، سوانہ سے پیدل مکہ معظمہ گئے، اور سات حج کرنے کے بعد اسی بقعہ مبارکہ میں انتقال فرمایا،[2]

میر صاحب کی یتیمی اور چچا کی پرورش کے دور میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کو خاندانی علم و فضل سے کوئی حصہ مل سکا یا نہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں کوئی خاص تعلیم و تربیت نہ ہو سکی، بلکہ سوانہ سے نکلنے کے بعد آپ نے تحصیل علم کی،

دہلی، بہار، جونپور اور نظام آباد میں طلب علم و معرفت

میر صاحب نواح دہلی کے رہنے والے تھے، مگر آپ کی تعلیم و تربیت دیار پورب میں ہوئی، جہاں سلاطین شرقیہ کی بزم دو نشین کے علم و فضل کے چراغ ابتک روشن تھے، دہلی میں لودھیوں کی نئی نئی حکومت قائم ہوئی تھی اور وہاں کے ارباب علم و فضل ایک گونہ انتشار کے شکار تھے، اس لیے آپ نے پورب کا رخ کیا، اور یہیں کے ہو رہے، اخبار الاخیار میں ہے " در اوان طلب بجانب جونپور افتاد (ص ۱۷۰) سفینۃ الاولیاء (ص ۱۹۰) اور گلزار ابرار کے ترجمہ (ص ۱۰۹) میں بھی یہی ہے، اخبار الاصفیاء میں ہے کہ " او ابتدائے حال در تعلیقات البسرمی برد" (ص ۹۵)، نزہۃ الخواطر میں ہے کہ میر صاحب سوانہ سے دہلی گئے، اور کچھ دنوں وہاں رہ کر علما و مشائخ سے کسب فیض کیا (ج ۴ ص ۲۴۴) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ عہد شباب میں دہلی گئے، اور وہیں کسی امیر کبیر کے دربار میں

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۲ [2] خلاصۃ الاثر ج ۱ ص ۲۶۸

ملازم ہو گئے ، اور وہاں کے بعض علما و مشائخ سے بھی تعلق قائم کیا ، مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر راہ طلب میں دیار پورب کی طرف نکل کھڑے ہوئے ، دہلی میں آپ کی آمد ۹۰۰ھ سے بہت پہلے ہوئی ہوگی ، اس وقت سلطان بہلول لودھی متوفی ۸۹۴ھ کی حکومت تھی ، اس سلسلہ میں صاحب اخبار الاصفیا نے تفصیل سے کام لیا ہے ، وہ لکھتے ہیں کہ میر صاحب ابتدائے حال میں درباریوں سے منسلک ہوگئے ، ایک دن آقا کے دربار میں حاضر ہوئے اور باریابی کی اجازت چاہی مگر اجازت نہ مل سکی ، اس واقعہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ، اور اسی وقت آپ کے دل میں تعلق مع اللہ کا شدید داعیہ پیدا ہو گیا ، اور یہ خیال پیدا ہوا کہ آج تم جس امیر کی خدمت میں لگے رہتے ہو جب اسکے دربار میں تم کو باریابی کی اجازت نہیں ملی تو کل مالک حقیقی کے دربار میں باریابی کی اجازت کیسے مل سکتی ہے ، اس حال میں کہ تم اس کی اطاعت و فرمانبرداری بھی نہیں کرتے ہو ، یہ سوچ کر تمام مال و اسباب فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیا ، اور دہلی سے برہنہ پا شیخ قاضن کی خدمت میں حاضر ہوئے ، شیخ قاضن نے بڑھ کر استقبال کیا اور فرمایا کہ میں تمھاری آمد کا منتظر تھا ، اس کے بعد شیخ نے کچھ اوراد و اذکار کی تلقین فرمائی ، جس سے میر صاحب کے قلب میں سوز و درد کی کیفیت پیدا ہو گئی ، یہ آگ رفتہ رفتہ تیز ہوتی گئی ، اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ آپ بیتابی میں ادھر ادھر چکر کاٹتے اور کہتے تھے کہ کوئی ہے جو قاضن کی لگائی ہوئی آگ کو بجھا دے ۔ اسی عالم حیرانی و پریشانی میں آپ کا گذر حضرت شیخ بہاء الدین جونپوریؒ کے یہاں ہوا ، انھوں نے ایسی روحانی غذا دیدی جس سے یہ آگ دب گئی اور معرفت الٰہی کے تمام مقامات آپ پر منکشف ہو گئے ۔

اس کے بعد صاحب اخبار الاصفیا نے لکھا ہے کہ اس واقعہ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک بزرگ نے ایک دنیا دار شخص سے پوچھا کہ تم دنیا کس طرح حاصل کرتے ہو ؟ اس نے کہا کہ جد و جہد

کے بعد دنیا ملتی ہے، انھوں نے پوچھا کہ جد و جہد کے بعد بھی تم کو پوری دنیا حاصل ہو جاتی ہے؟
اس نے نفی میں جواب دیا، بزرگ نے کہا جب تم اس دنیائے فانی کو اس قدر کوشش کے بعد
بھی پورے طور سے حاصل نہیں کر سکتے تو عقبائے باقی کو بلا کوشش کے کیسے پا سکتے ہو؟ یہ سنتے
ہی اس دنیا پرست پر خوف خدا طاری ہو گیا، اور وہ اسی وقت ترک علائق کر کے مقصد اعلیٰ
کی طلب میں لگ گیا، اور ولی بن گیا[۵]

میر صاحب کے شیخ قاضن سے کسب فیض کرنے کی تصریح دوسرے تذکرہ نویسوں نے
بھی کی ہے، چنانچہ اخبار الاصفیاء میں مذکورہ بالا واقعہ کی تفصیل سے پہلے لکھا ہے کہ "مرید و خلیفہ
شیخ بہاء الدین جونپوری است، و برخے گویند کہ از شیخ قاضناً (قاضن) شطاری فیض گرفتہ" (ص ۹۵)
اور بقول صاحب گلزار ابرار بعض تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ آپ سلسلۂ شطاریہ میں قاضن
شطاری کے مرید ہیں، (اذکار ابرار ص ۲۰۹) صاحب مشکوٰۃ النبوۃ نے میر صاحب کو شیخ قاضن
کے کامل ترین خلفاء میں شمار کیا ہے، اور لکھا ہے " از ان جملہ در خلیفہ اکمل بودند، یکے میر سید علی قوام
کہ کمالات او اظہر است، در نواحی جونپور بسرائے میران آسودہ است، از وے مردم بسیار ارشاد
یافتند" (ص ۱۸۲)

میر صاحب کے شیخ قاضن سے کسب فیض کرنے بلکہ ان کے اکمل خلیفہ ہونے کی ان تصریحات کے باوجود
ان کے کئی تذکرہ نویس اس کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کو صرف "مرید و خلیفہ شیخ بہاء الدین جونپوری"
بتاتے ہیں، چنانچہ اخبار الاخیار (ص ۲۲۱)، سفینۃ الاولیاء ص ۱۹۰، خزینۃ الاصفیاء (ص ۴۲۲ ج ۱)
اور تاریخ الاولیاء ص ۲۳ ج ۴ میں یہی لکھا ہے، اور ان میں سے کسی کتاب میں شیخ قاضن یا کسی دوسرے
مرشد و مربی کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ شیخ قاضن شطاری کی نگاہ نے میر صاحب کی خشک لکڑی میں آگ

---

[۵] اخبار الاصفیاء، ص ۹۵-۹۶

لگائی تھی جس کو بجھانے کے لیے وہ در بدر کی خاک چھانتے پھرے اور شیخ قاضن کے علاوہ اور دوسرے کئی مشائخ سے بھی کسب فیض کیا جن میں شیخ بہاء الدین چشتی جونپوری جیسے جامع شریعت و طریقت عالم تھے اور میر صاحب ان ہی کے مرید و خلیفہ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اس کے باوجود آپ پر شطاری رنگ غالب رہا، شیخ قاضن کا نام محمد بن علاء الدین ہے، یہ بہت بہار کے رہنے والے اور بہار ہی میں منیر کے قاضی تھے، جو ان دنوں جونپور کی عملداری میں تھا، اس لیے میر صاحب دہلی سے چل کر سب سے پہلے بہار پہنچے جو حدود جونپور میں شامل تھا، اور اس پر جونپور کا اطلاق بھی صحیح تھا، شاید اسی لیے شاہ عبدالحق صاحب وغیرہ نے شیخ قاضن کا تذکرہ نہ کرنے کے باوجود میر صاحب کے ابتدائے طلب کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "در اوان طلب بجانب جونپور افتاد" (۲۲۱) اور نزہتہ الخواطر میں ہے کہ جب میر صاحب دہلی سے جونپور تشریف لائے تو ان کے چچا شیخ محمد ابن سعید بھی ساتھ تھے، اور جوان صالح بھتیجے کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لیتے تھے،

عام تذکرہ نویسوں نے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، میر صاحب کو مرید و خلیفہ شیخ بہاء الدین جونپوری بتایا ہے، اور ان کے کسی دوسرے شیخ کا نام نہیں لیا ہے، مگر کئی کتابوں میں شیخ بہاء الدین جونپوری سے پہلے شیخ قاضن شطاری سے تلمذ کا ذکر ہے، ان دونوں کے علاوہ میر صاحب نے دو اور مشائخ سے کسب فیض کیا ہے، جو دیار جونپور کے رہنے والے تھے، چنانچہ نزہتہ الخواطر میں رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے درج ہے، کہ میر صاحب جونپور آنے کے بعد سب سے پہلے شیخ شہاب الدین حسینی جونپوری کی خدمت میں پہنچے، جو سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ میں تھے، ان کی خدمت و صحبت میں رہ کر طریقہ سہروردیہ حاصل کیا، اور خرقہ پہنا، اس کے بعد نظام آباد (اعظم گڈھ) پہنچے، جہاں شیخ عبدالقدوس عرف شاہ قدن شطاری کا روحانی فیض جاری تھا، مدتوں ان کی خدمت میں رہ کر طریقۂ شطاریہ حاصل کیا، اور اس کے اذکار و اشغال میں اس قدر مشغول رہے کہ آپ پر

کشف وشہود کے دروازے کھل گئے گویا شیخ قاضن شطاری کی تعلیم و تربیت کے بعد شیخ عبد القدوس شطاری کی صحبت نے آپ کے حق میں طریقۂ شطاریہ کو سونے پر سہاگہ بنا دیا، اور آپ کو تمام مروجہ سلسلوں میں نسبت تامہ حاصل ہونے کے باوجود سلسلہ شطاریہ عشقیہ سے خصوصی تعلق رہا، شیخ شہاب الدین جونپوری اور شیخ عبد القدوس نظام آبادی سے میر صاحب کے تلمذ کا ذکر نزہۃ الخواطر میں موجود ہے۔[1]

ان سب مشائخ سے کسب فیض کرنے کے بعد میر صاحب آخر میں حضرت شیخ بہاء الدین عمری چشتی جونپوری کی خدمت میں پہنچے، اس زمانہ میں آپ کی ذات جامع شریعت و طریقت اور باب علم و فضل کا مرجع تھی، وہ ایک طرف بڑے عالم دین اور علوم شریعت کے حامل تھے، دوسری طرف سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کبار میں شمار تھا، میر صاحب ایک مدت تک شیخ بہاء الدین کی خدمت وصحبت میں رہکر ظاہری و باطنی علوم کے فیوض و برکات حاصل کئے اور انکے مرید و خلیفہ مشہور ہوئے۔

علوم ظاہری و باطنی میں جامعیت | اس زمانہ میں عام طور سے علماء، مشائخ اور مشائخ علماء ہوتے تھے، آج کل کی طرح بے علم مشائخ اور بے نسبت علماء کا رواج نہیں تھا، میر صاحب نے اپنے جن اساتذہ و مشائخ سے روحانی فیوض و برکات حاصل کیے، ان ہی سے علوم شرعیہ کی بھی تحصیل فرمائی، کیونکہ یہ حضرات ظاہری اور باطنی علوم کے جامع تھے، اور ارشاد و تلقین کے ساتھ تعلیم و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، اور ان کے کاشانے بیک وقت مدرسہ اور خانقاہ دونوں تھے، خاص طور سے شیخ قاضن اور شیخ بہاء الدین علوم شرعیہ کے زبردست ماہرین تھے، ایک منیر میں قاضی اور دوسرے جونپور میں معلم و مرشد تھے،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴۴

شیخ محمد بن حسن غوثیؒ نے گلزار ابرار میں تصریح کی ہے کہ جب سید علی قوام شہر جونپور پہنچے تو شیخ بہاء الدین سے بیعت ہوئے، اور ظاہری علوم اور باطنی کمالات پیدا کیے[1]، یہ ضرور ہے کہ میر صاحب کی زندگی کا روحانی پہلو اتنا پُرکشش اور نمایاں رہا کہ آپ کا شمار مشائخ میں ہوا، اور تذکرہ نگاروں نے اسی حیثیت سے آپ کا تذکرہ کیا ہے، مشائخ کی تذکرہ نگاری کا یہ پہلو ہمیشہ سے بہت افسوسناک رہا ہے کہ ان کے درجات و مراتب کشوف و کرامات اور تصرفات کے انبار میں ان کی علمی زندگی دب گئی، اور یہ بہت کم معلوم ہو سکا کہ علوم شرعیہ میں ان کا کیا مقام و مرتبہ تھا، حالانکہ ان بزرگوں میں بہت سے اصحاب علوم و فنون کے ماہر و جامع گذرے ہیں، اور ارشاد و تلقین کے ساتھ درس و تدریس کے خدمت بھی انجام دیتے رہے،

روحانیت و طریقت کے تمام مروجہ سلاسل میں جامعیت

میر صاحب دیار پورب کے دسویں صدی کے تمام مروجہ طرق و سلاسل کے مشائخ سے فیضیاب ہوئے، ان کے بعض مشائخ ان سب میں کامل تھے، اس لیے ان کے سوانح نگار ان کی سب نسبتیں شطاری، چشتی، نقشبندی اور سہروردی وغیرہ بیان کرتے ہیں، ان تمام طرق و سلاسل میں آپ کو نسبت کاملہ حاصل تھی، صاحب اخبار الاصفیاء نے لکھا ہے کہ "وچندے بر آنند کہ با ہر سلسلہ نسبت درست داشتہ[2]" گلزار ابرار میں ہے کہ "بعض کہتے ہیں کہ آپ کو تمام مشہور خانوادوں سے نسبت صحیح حاصل ہے، اور تمام دروازوں سے اپنی استعداد کی بدولت گوناگوں دانش و بینش حاصل ہے[3]" اس کے باوجود عام تذکرہ نویس آپ کو مرید و خلیفہ شیخ بہاء الدین لکھتے ہیں، اس اعتبار سے آپ طریقۂ چشتیہ کے مشائخ کبار میں ہیں، جن پر طریقۂ شطاریہ عشقیہ کا رنگ بھی چڑھا ہوا تھا،

---

[1] اذکار ابرار ص ۱۰۹ [2] اخبار الاصفیاء ص ۵۹ [3] اذکار ابرار ص ۱۰۹

اور شیخ قاضن شطاری کی نظر اور شیخ عبد القدوس شطاریؒ کی صحبت سے جو فیض پہنچا تھا، وہ شیخ بہاء الدین کی ارادت و خلافت کے بعد بھی نمایاں رہا، میر صاحب کے طلب و اکتساب کی ابتدا شیخ قاضن متوفی ۹۴۰ھ کی خدمت میں حاضری سے ہوئی، اور انتہا شیخ بہاء الدین متوفی ۹۲۱ھ کی خلافت پر ہوئی، ظاہر ہو کہ یہ ابتدا اور انتہا ان دونوں بزرگوں کی وفات سے پہلے ہوئی ہوگی، اور کم و بیش بیس سال تک میر صاحب نے علم و معرفت کی چار شمعوں سے روشنی حاصل کی ہوگی، اور یہ مدت سوانہ سے نکلنے کے بعد دہلی، بہار، نظام آباد اور جونپور میں گذری، تحصیل و تکمیل کے بعد آپ دیار مشرق ہی میں سکونت اختیار فرمائی اور سرائمیر کو ارشاد و تلقین کا مرکز بنا کر یہیں انتقال فرمایا۔

میر صاحب کے اساتذہ و شیوخ میر صاحب کی شخصیت سازی میں جن اساتذہ و شیوخ کی نگاہوں نے کیمیا گری کی ہے، ان میں چار بزرگ نمایاں ہیں جن سے آپ نے براہ راست کسب فیض کیا ہے ان کے مختصر حالات بیان درج کیے جاتے ہیں، ان سے خود میر صاحب کے فضل و کمال کا اندازہ ہو سکے گا۔

شیخ قاضن شطاریؒ آپ کا اصل نام شیخ محمد بن علاء الدین بن قاضی عالم بن قاضی جمال الدین ہے، قاضیٔ منیر اور قاضن کے لقب سے مشہور ہیں، ترہت بہار کے رہنے والے تھے، جو اس زمانہ میں حدود جونپور میں شمار ہوتا تھا، ظاہری و باطنی دونوں علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے، شریعت و طریقت کے جامع اور منیر کے قاضی تھے، آپ کو طریقت کے تمام مروجہ طرق و سلاسل کے اکابر سے نسبت حاصل تھی، طریقۂ فردوسیہ اپنے والد بزرگوار شیخ علاء الدین بن عالم سے طریقۂ سہروردیہ شیخ رکن الدین جونپوری سے، طریقۂ چشتیہ شیخ زاہد بن بدر الدین چشتی سے، طریقۂ قادریہ شیخ عبد الوہاب بن عبد الرحمن صدیقی سے، طریقۂ مداریہ شیخ حسام الدین اصفہانی

جونپوری سے ، اور طریقہ شطاریہ براہ راست اس کے بانی و امام شیخ عبداللہ بن حسام الدین شطاری خراسانی سے حاصل کیا تھا ، طریقہ شطاریہ کا رنگ آپ پر اس قدر غالب تھا کہ شطاری کی نسبت سے مشہور ہوئے ، آپکے اکمل ترین خلفاء میں میر صاحب اور آپکے صاحبزادے شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ شطاری شامل ہیں ، انتصاح عن ذکر اہل الصلاح میں ہے کہ آپ نے ۳ صفر ۸۹۲ھ کو وفات پائی ، ان کی قبر جونپور میں ہے ، برکات الاولیاء میں آپ کا مزار دارالقصر مندو میں بتایا گیا ہے ، اس میں اور مشکوۃ النبوۃ میں تاریخ وفات ۳ صفر ۹۰۲ھ درج ہے ، جو ۸۹۲ھ کی تصحیف کا نتیجہ ہے ، میر صاحب کی راہ طلب میں پہلی منزل آپ ہی کی ذات اقدس ہے ، جہاں دہلی سے پہنچے ، اور فیضیاب ہوئے[۱]

شیخ شہاب الدین سہروردی جونپوری حضرت شیخ شہاب الدین حسینی سہروردی جونپوری دسویں صدی کے جونپوری علماء و مشائخ میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ ہیں ، طریقہ سہروردیہ میں امامت و مشیخت کا درجہ رکھتے تھے ، روحانی تعلیم شیخ برہان الدین حسینی تلمیذ شیخ صدرالدین محمد بن احمد بخاری اوچی سے حاصل کی تھی ، میر صاحب شیخ قاضن کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، اس وقت میر صاحب راہ سلوک کی ابتدائی منزل میں تھے ، صاحب نزہۃ الخواطر نے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے اسکی تصریح کی ہے[۲]

شیخ عبدالقدوس شطاری نظام آبادی آپ شیخ قدن اور قطب صدیق کے لقب سے مشہور ہیں ، مستقل قیام نظام آباد (اعظم گڈھ) میں تھا ، طریقۂ شطاریہ عشقیہ براہ راست اس کے بانی و امام شیخ عبداللہ بن حسام الدین خراسانی سے حاصل کیا تھا ، اس کے بعد ان کے مرید خاص شیخ حافظ شطاری واسطہ کار کی صحبت میں رہ کر درجۂ کمال کو پہنچے ، اور حافظ شطاری نے ان کو خلافت سے نوازا اس کے بعد آپ نے نظام آباد میں ارشاد و تلقین کی بزم سجائی اور خلق اللہ کی ہدایت کی ، میر صاحب نے

---

[۱] مشکوۃ النبوۃ ص ۱۸۰ ، ۱۸۱ ، ۱۸۳ ، برکات الاولیاء ص ۵۵ ، نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۴ ، ۱۴۱ ، ۱۴۲
[۲] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۳۴

غالباً شیخ شہاب الدین جونپوری کے بعد ہی آپ سے تعلیم و تلقین حاصل کی تھی، آپ سے اخذ و کسب کی تصریح صاحب نزہۃ الخواطر نے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے کی ہے[1]

شیخ بہاء الدین عمر چشتی جونپوری | آپ شیخ حمید الدین ناگوری کی اولاد میں اور زبردست عالم دین اور طریقۂ چشتیہ کے مشہور مشائخ میں ہیں، ولادت اور نشو و نما جونپور میں ہوئی، علوم شرعیہ کی تحصیل و تکمیل شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری سے فرمائی اور علوم باطنی راجہ سید حامد شاہ مانک پوری چشتی سے حاصل کرکے ان کے مرید و خلیفہ ہوئے، جن دنوں شیخ بہاء الدین شیخ محمد بن عیسیٰ کی خدمت میں علوم شرعیہ کی تحصیل کر رہے تھے، دھولقہ (گجرات) سے شیخ حسین نامی ایک بزرگ جونپور آئے، انھوں نے شیخ بہاء الدین کو جوان صالح دیکھکر ان کی روحانی تربیت شروع کر دی، اس طرح شیخ بہاء الدین ایام طالب علمی ہی میں طریقت کی لذت سے آشنا ہو گئے، جب شیخ حسین دھولقہ واپس ہونے لگے تو آپ نے ان سے ارادت و خلافت کے بارے میں سوال کیا، شیخ حسین یہ کہکر چلے گئے کہ تمھارا شیخ اسی شہر جونپور میں ہے، تمھارے نصیب میں ہماری طرف صرف اتنی ہی تربیت تھی، ان کے جانے کے بعد شیخ بہاء الدین پھر اپنے استاد کی خدمت میں تحصیل علم کرتے رہے، شیخ محمد بن عیسیٰ نے بھی خلافت نہیں دی اور وصال کے وقت فرمایا کہ "بہاء الدین! خرقۂ خلافت تو پیش سیدے است کہ از مانک پور تشریف خواہد آورد"۔ چنانچہ شیخ محمد بن عیسیٰ کے انتقال کے بعد راجہ سید حامد شاہ مانک پوری جونپور تشریف لائے اور شیخ بہاء الدین ان کی آمد کی خبر سنکر استقبال کے لیے شہر کے باہر گئے، راجہ حامد شاہ نے پہلی ہی ملاقات میں آپ کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا۔

شیخ بہاء الدین آخر عمر میں حرمین شریفین چلے گئے، اور تیس سال تک مکہ مکرمہ میں جبل ابو قبیس

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۴۴۲

کے اوپر ایک خلوہ میں مقیم رہے، ہر نماز کے وقت حرم شریف میں نماز باجماعت ادا کرتے تھے،
اس وقت ان کی عمر سو سال سے زائد ہو چکی تھی، اسی دوران قیام میں وہاں کے علماء سے احادیث کی
سند عالی حاصل کی، اور شیخ کمال الدین اسمٰعیل شروانی سے جو خواجہ عبید اللہ احرار کے فیض یافتہ تھے،
طریقہ نقشبندیہ حاصل کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔ آپ کی تصانیف میں ارشاد
السالکین مشہور کتاب ہے، ۱۴ جمادی الاخری یا ۲۶ رمضان ۹۲۱ھ کو انتقال فرمایا[1]۔

میر صاحب نے یوں تو کئی علماء و مشائخ سے فیض حاصل کیا مگر درجۂ کمال کو شیخ بہاء الدینؒ
کی خدمت و صحبت میں پہنچے اور مرید و خلیفہ شیخ بہاء الدین جونپوریؒ سے متعارف ہوئے،

طریقۂ شطاریہ اور اس کے بانی شیخ عبد اللہ خراسانی

جیسا کہ معلوم ہوا میر صاحب کی روحانی اور احسانی نسبت تمام طرق و سلاسل مروجہ سے تھی، مگر طریقۂ شطاریہ کا جو رنگ ابتدائے طلب میں ان پر چڑھا تھا، وہ آخر تک باقی اور شیخ بہاء الدین سے طریقۂ چشتیہ میں خلافت پانے کے بعد بھی شطاری سوز و ساز غالب رہا، اس طریقہ کے بانی شیخ عبد اللہ بن حسام الدین
خراسانیؒ میر صاحب کے دو شیوخ کے شیخ و مرشد بھی ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس
سلسلہ اور اس کے بانی کے بارے میں بھی کچھ باتیں آجائیں، ان سے میر صاحب کی شخصیت
کے سمجھنے میں مدد ملے گی،

حضرت شیخ عبد اللہ بن حسام الدین شطاری خراسانی متوفی ۸۳۲ھ رحمۃ اللہ علیہ
سلسلۂ سہروردیہ کے بانی و پیشوا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد سے ہیں،
اور طریقۂ شطاریہ عشقیہ کے بانی و امام ہیں، اس کا سلسلہ اس طرح ہے: الشیخ عبد اللہ، عن
الشیخ محمد، عن الشیخ محمد عارف، عن الشیخ محمد عاشق، عن الشیخ خدا قلی، عن الشیخ ابی الحسن الخرقانی

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۲ و نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۶۱

عن الشیخ ابی المظفر الطوسی، عن الشیخ ابی یزید العشقی، عن الشیخ محمد المغربی رحمہم اللہ،

شیخ عبد اللہ شطاری بڑی شان و شوکت کے بزرگ تھے، دنیائے اسلام میں سیر و سیاحت کرنے کے بعد ارشاد و تلقین کی بزم آراستہ کی، اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی تشریف لائے، اور مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر خلق اللہ کی ہدایت کی، جس شہر یا گاؤں میں جاتے اسکے باہر اپنے مریدوں اور حشم و خدم کے ساتھ خیمہ زن ہوتے، آپ کی سواری شاہانہ انداز سے نکلتی اور نوبت و نقارہ سے دعوت و تبلیغ کا اعلان کیا جاتا، شاہ عبد الحق صاحب لکھتے ہیں :-

"سطوت و شوکت ظاہر و باطن داشت، گویند کہ وے نقارہ میزد، دندا دری واد کر طالبے است کہ بیاید، او را بخدا رسانم"۔

ایک مرتبہ آپ اسی شان و شکوہ کے ساتھ دیار جونپور میں تشریف لائے اور سُرہرپور (ضلع فیض آباد) پہنچے جو ان دنوں طریقۂ قلندریہ کا مرکز تھا، شاہ داؤد قلندر سُرہرپوری کو آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ پر گئے، دربان نے اندر جانے سے روکا، شاہ داؤد قلندر اس کو پچھاڑ کر سینے پر سوار ہو گئے، اور اندر جا کر شیخ عبد اللہ شطاری کے برابر کرسی پر بیٹھ گئے، آپ نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آئے، بعد میں ایک خادم نے شیخ داؤد سے کہا کہ بے ادب خدا تک نہیں پہنچ سکتا، شاہ داؤد نے جواب دیا کہ باادب خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا، اگر میں ادب کر کے دربان کو دھکا نہ دیتا اور اندر داخل نہ ہوتا تو شیخ عبد اللہ کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہو سکتا تھا،[1]

شیخ عبد اللہ شطاری کے دو خلفا، دیار پورب میں مشہور و مخصوص تھے، ایک شیخ قاضن، دوسرے شیخ عبد القدوس نظام آبادی، دونوں سے میر صاحب نے طریقۂ شطاریہ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۱، اخبار الاصفیاء ص ۸۲، مشکوٰۃ النبوۃ ص ۲۰۸ و ۲۰۹، نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۹۵

کو تعلیم و تلقین و صال کی بلکہ شیخ قاضن کے اکمل ترین خلفاء میں سے ہیں،

شیخ عبد اللہ شطاری نے سلسلۂ شطاریہ کے چند مخصوص و متعارف اذکار و اشغال وضع کیے ہیں، جن میں وہ منفرد ہیں، اور شطاری اوراد و وظائف اور مراقبات میں رسالہ شطاریہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں ان کے اصول بیان کئے ہیں۔ شاہ عبد الحق صاحب نے شیخ بہاء الدین بن ابراہیم قادری شطاری کے تذکرہ میں اسکی کچھ عبارتیں نقل کی ہیں، ہم ان کو یہاں درج کرتے ہیں، تاکہ میر سید علی بن قوام الدین کی روحانی زندگی کے سمجھنے میں مدد ملے، شاہ صاحب لکھتے ہیں،

" در رسالہ می گوید کہ الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلق گفتہ اند، اما سہ طریق ازاں مشہور و معروف است، اول طریق اخیار، وآں صوم وصلوٰۃ وتلاوت قرآن و حج و جہاد است، روندگان ایں طریق در زمان طویل اندک بمقصود رسند"

دوم طریق اصحاب مجاہدات و ریاضات در تبدیل اخلاق ذمیمہ و تزکیۂ نفس، و تصفیۂ روح، و ہو طریق الابرار، فالواصلون بہذا الطریق اکثر من تلک الطرق۔

سوم طریق شطاریہ، فالواصلون منہم فی البدایات اکثر من غیرہم فی النہایات، و ایں ازاں دو طریق اقرب الطرق الی اللہ، و اصول طریق شطار دہ چیز اند، اول توبہ، ہو الخروج عن کل مطلوب سواہ، دوم زہد عن الدنیا و محبتہا و متاعہا و شہواتہا قلیلہا و کثیرہا، سوم توکل، و ہو الخروج عن الاسباب، چہارم قناعت، و ہی الخروج عن الشہوات النفسانیۃ، پنجم عزلت، و ہی الخروج عن مخالطۃ الخلق

بالانزوا، والانقطاع کما ہو بالموت، ششم توجہ بسوئے حق. وہو الخروج عن کل داعیۃ تدعو الی غیر الحق کما ہو بالموت، فلایبقی مطلوب ولامحبوب ولامقصود الا اللہ. ہفتم صبر وہو الخروج عن محظوظ النفس بالمجاہدۃ. ہشتم رضا. وہو الخروج عن رضا النفس بالدخول فی رضا اللہ تعالیٰ، بالتسلیم للاحکام الازلیۃ. والتفویض الی تدبیر اللہ بلا اعراض کما ہو بالموت، نہم ذکر است. وہو الخروج عن ذکر ماسوی اللہ تعالیٰ، دہم مراقبہ، وہی الخروج عن وجودہا وقوتہا کما ہو بالموت[۵]۔"

---

[۵] اخبار الاخیار ص ۱۹۳، رسالہ شطاریہ کا قلمی نسخہ میں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں دیکھا ہے. غالباً یہ رسالہ چھپ چکا ہے۔

فتوح السّلاطین کی ادبی خصوصیات

از جناب ڈاکٹر عبدالمنان صاحب ریڈر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

(۲)

(۳) فتوح السلاطین سے سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے نسب، خلق، حالات، ابتدائی زندگی، اس کے بھائیوں کی تفصیل اور شاہی فوج سے دکن کی باغی فوج کی آویزش پر روشنی پڑتی ہے جس سے تاریخ فرشتہ کے اکثر بیانات کی تصحیح میں مدد ملتی ہے۔

(الف) سلطان کے نسب کے بارہ میں عصامی کا بیان[1] نہایت واضح ہے، سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ، بہمن واسفندیار کی نسل سے تھا، جس سے فرشتہ کے بیان کی تردید ہوتی ہے،

(ب) علی شاہ نتھو خواہرزادۂ ظفر خاں علائی اور علاء الدین حسن بہمن شاہ کے رشتے کے بارہ میں عصامی[2] اور صاحب تاریخ فرشتہ[3] کے بیان میں اختلاف ہے، عصامی نے علاء الدین حسن کو اس کا حقیقی بھائی کے بجائے ماں کی طرف سے رشتے کا بھائی قرار دیا ہے، علی شاہ کی بغاوت کی تفصیلات میں بھی ان دونوں کے بیان میں اختلاف ہے،

(ج) فتوح السلاطین سے سلطان علاء الدین حسن کے ابتدائی حالات پر اہم روشنی

---

[1] فتوح السلاطین ص ۹ [2] ایضاً ص ۴۸۳ - ۵۰۰ [3] فرشتہ ج ۱ - م ۲ - ص ۱۳۸

پڑتی ہے۔ فرشتہ[1] کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاء الدین حسن بادشاہت سے قبل پہلی مرتبہ قتلغ خاں کے دولت آباد کا گورنر مقرر ہونے کے بعد اس کی رفاقت میں دکن آیا،

عصامی کا بیان[2] ہے کہ وہ گرشاسپ کی بغاوت فرو کرتے وقت ۱۳۲۶ء میں ساگر میں شاہی فوج کے ساتھ تھا، اور جب بڑودہ[3] میں امیران صدہ نے بغاوت کی تو اس وقت وہ اپنی جاگیر میرج میں سرحد دار کی خدمت پر مامور تھا، فرشتہ[4] کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابتدا سے دکن کی باغی فوج میں شریک تھا، اس کے برعکس عصامی[5] کا بیان ہے کہ وہ اسمٰعیل مخ کے اعلان بادشاہت کے بعد گلبرگہ کے محاصرہ میں باغی فوج کے ساتھ شریک ہوا، اس طرح بانی سلطنت بہمنیہ کے ابتدائی حالات پر جو نئی روشنی پڑتی ہے، اس سے بہمنیہ سلطنت کی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے، فرشتہ اور طبا طبا نے اکثر جگہ بہمنیہ سلطنت کے ابتدائی حالات بیان کرنے میں فتوح السلاطین سے مدد لی ہے، لیکن فرشتہ نے ان معلومات کو نظر انداز کر دیا ہے، جو اس کے مقصد کے خلاف تھے،

(۴) فتوح السلاطین میں چودھویں صدی کے ہندوستان کی معاشرتی زندگی کی بھی جھلک نظر آتی ہے:-

(الف) خضر خاں اور دول رانی کی شادی[6] کے موقع پر ایک جشن کے انعقاد کا منظر دکھایا ہے، جس میں جشن کے اختتام پر مہمانوں کی پان اور شربت سے تواضع کی گئی تھی،

(ب) عصامی[7] نے پرجوش انداز میں دہلی کی آبادی، اس کی فراوانی، خوشحالی اور

---

[1] فرشتہ، جلد اول، مقالہ سوم ص ۲۷۴ [2] فتوح السلاطین ص ۴۲۹ [3] ایضاً ص ۵۲۶ [4] فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۴

[5] فتوح السلاطین ص ۵۲۲ - ۵۲۶ [6] ایضاً ص ۲۲۵ [7] ایضاً ص ۴۵۲ - ۴۵۳

علم و فن کے چرچوں کا ذکر کیا ہے۔ دہلی کی علمی فضیلت کے بیان میں کہتے ہیں کہ بخارا اور سمرقند کے مفتیوں کو کسی شرعی مسئلہ میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تو دہلی کے مفتیوں سے فتوی حاصل کرتے تھے۔ دہلی، عصامی کے زمانے میں دینی اور دنیوی علوم کا بڑا مرکز تھا جس کا شیرازہ سلطان محمد بن تغلق کی خود رائی اور تلون مزاجی کی بناپر منتشر ہو گیا۔

(ج) ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخوں سے اس زمانے کی ضیافتوں کے اہتمام اور ان کے ماکولات و مشروبات پر روشنی نہیں پڑتی، عصامی نے سلطان علاء الدین حسن کی ایک شاہی ضیافت کا تفصیل سے نقشہ کھینچا ہے، جس میں شاہی دسترخوان کے کھانوں اور مٹھائیوں کی تفصیل دی ہے۔

فتوح السلاطین کی ادبی اہمیت عصامی ہندوستان کے ادبی روایات کے نمایندے ہیں، ان کے اشعار میں فصاحت اور کلاسیکی خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان کے انداز بیان کی جادوگری سے ناظرین مسحور ہو جاتے ہیں، ان کے اشعار میں شعریت اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے، وہ واقعات کا تسلسل بڑی چابک دستی سے قائم کرتے ہیں، سلسلۂ سخن کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اصل واقعات کے ضمن میں ذیلی واقعات بھی بیان کرتے ہیں، لیکن کہیں بھی واقعات کی ترتیب اور تسلسل میں فرق پیدا نہیں ہونے پاتا، اور اصل واقعے کی لہر بدستور باقی رہتی ہے۔ ان کی زبان میں لطافت، خیالات میں روانی اور کلام میں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ تاریخ نگاری کا ملکہ خداداد ہے، واقعہ یہ ہے کہ فتوح السلاطین تاریخ اور شاعری کے امتزاج کا دلکش مرقع ہے، انھوں نے تاریخ کو ادب بنا دیا، ماضی کے بے جان واقعات کو اپنی جاندار شاعری

سے زندگی عطا کردی، لیکن شاعرانہ انداز بیان میں وہ واقعات کی صحت و صداقت کا دامن کہیں نہیں چھوڑتے اور ان کی صحیح تاریخیں دیتے چلے جاتے ہیں،

ذیل میں فتوح السلاطین کے چند نمایاں ادبی محاسن کا تبصرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) جامعیت:- فتوح السلاطین رزم و بزم، اخلاق و حکمت، تاریخ و داستان عشق و محبت اور، تہذیب و معاشرت ہر قسم کے مضامین پر مشتمل اور پورے تین سو برس کی تاریخ ہے، تاریخی واقعات بیان کرنے کے دوران میں مختلف قسم کے گوناگوں واقعات اور حالات آتے جاتے ہیں، لیکن جامعیت اور بلاغت کا کمال یہ ہے کہ شروع سے آخر تک تناسب، ترتیب، تسلسل اور ہم آہنگی میں فرق نہیں آنے پاتا، اس لیے یہ ایسا ادبی شہ کار ہے جو رزمیہ بھی ہے اور بزمیہ بھی، اصل میں یہ ایک رزمیہ ہے، لیکن عصامی نے تنوع کی خاطر اس کو عاشقانہ یا جذباتی شاعری کا بہترین نمونہ بنا دیا، رزمیہ واقعات میں زور بیان اور شکوہ الفاظ اور بزمیہ یا عشق کی داستان میں لطافت، نزاکت اور اثر انگیزی کا خاص اہتمام ہے، اس لیے وہ رزم و بزم دونوں کا شاہکار ہے،

فتوح السلاطین کی ان خصوصیات کا اظہار خود عصامی نے بھی کیا ہے، فردوسی رزمیہ شاعری کا خدائے سخن ہے، عصامی نے اس کو اس صنف کا طاؤس قرار دیا ہے[۱] نظامی گنجوی بزمیہ یا عشقیہ مثنوی کے تاجدار ہیں، عصامی[۲] نے خمسہ کی شیرینی اور داستانی پہلو کے لحاظ سے ان کو بلبل سے تشبیہ دی ہے، فتوح السلاطین شاہنامہ اور خمسہ کے مشترک انداز میں نظم کیا گیا ہے، گویا فتوح السلاطین فردوسی اور نظامی

---

[۱] فتوح السلاطین ص ۶۰۹ [۲] ایضاً

دونوں کے ادبی فیضان کا نتیجہ ہے جس کو وہ طوطی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) معیار کی بلندی:۔ عصامی نے فتوح السلاطین میں فن شاعری اور اصناف سخن سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بڑی ادبی قدر و قیمت کے حامل ہیں، ان سے عصامی کی تنقیدی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے اور شاعری کے جدید نظریات اور رجحانات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے، فارسی شاعری کے اصناف کے بارہ میں انھوں نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں اسکا مختصر خلاصہ حسب ذیل ہے:

"غزل کا خمیر عشق[۱] ہے اور قصیدہ کی روح مدح ہے، ایک دلنواز ہے تو دوسرا جانفزا، لیکن میرے دل و جان مثنوی کے دلدادہ ہیں، اس لیے کہ اس میں قافیہ کا التزام نہیں ہوتا، مضمون و اسلوب کے اعتبار سے مثنوی ایک جامع صنف سخن ہے، اس کے شگفتہ، جاذب نظر اور رواں دواں وزن میں ہر قسم کا مضمون بیان کیا جا سکتا ہے، جن لوگوں نے اقلیم شاعری میں امتیاز و ناموری پیدا کی ہے، انھوں نے غزل کے مقابلہ میں مثنوی کی طرف زیادہ توجہ کی ہے، بادشاہوں اور محبوبوں کے خط و خال کے جائزے کے لیے یہی صنف موزوں ہے .... وغیرہ"

ان خیالات سے عصامی کے ترقی پذیر ادبی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ مثنوی کی جامعیت اور ہمہ گیری کے متعلق انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ موجودہ تنقید ادب کے معیار پر بھی پورے اترتے ہیں، انھوں نے اپنے ادبی معیار کو فتوح السلاطین میں پیش کیا ہے، جس میں مثنوی کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

عصامی نے تخلیق شعر کے متعلق حسب ذیل خیالات[۲] کا اظہار کیا ہے:۔

"روشن دلوں پر یہ حقیقت عیاں ہے کہ معانی کا عرض کرنا کس قدر مشکل فن ہے

---

[۱] فتوح السلاطین ص ۱۶ [۲] ایضاً ص ۱۱۹

شاعر کو اس کے لیے کس قدر خونابہ افشانی کرنی پڑتی ہے جس کے نتیجے میں ایک سنجیدہ موتی حاصل ہوتا ہے، بڑی کدوکاوش سے ایک نکتہ، وزن، معانی اور لفظ صحیح کے ارتباط سے شعر کی صورت اختیار کرتا ہے، جس میں سلاست اور شائستہ قافیہ ہونا چاہیے"

عصامی کے ان خیالات سے شعر کی تخلیق کے جس عمل پر روشنی پڑتی ہے وہ ادب کے موجودہ نظریے سے ہم آہنگ ہے، ادب میں عظمت "خون جگر" سے پیدا ہوتی ہے جس کا اظہار عصامی نے اس شعر میں کیا ہے[۱]

شب و روز خون دل خوشتن ہمہ آب کردم پئے ایں چمن

(۲) محاکات :۔ اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز یا کسی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا جائے کہ اس شئے یا حالت کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، محاکات میں جان تخیل سے پیدا ہوتی ہے، خالی محاکات محض نقالی ہے، محاکات پر آب و رنگ چڑھانا تخیل کا کام ہے، عصامی بڑے چابک دست مصور ہیں، ان کی شاعری جذبات انسانی اور مظاہر قدرت کا نہایت حسین مرقع پیش کرتی ہے، ان کی واقعہ نگاری میں تسلسل جوش اور روانی پائی جاتی ہے، وہ داخلی اور خارجی مظاہر کی مصوری میں معنویت اور جان اپنے تخیل سے پیدا کرتے ہیں، اور ان کو اپنے شاداب تخیل سے از سر نو زندہ کرتے ہیں، ان کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے، جزئیات پر بھی ان کی نظر رہتی ہے، وہ ان میں حسین تشبیہات سے کام لیتے ہیں جس سے کلام میں تازگی اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے، فتوح السلاطین محاکات کے نمونوں سے معمور ہے، اور شاداب اور شگفتہ چمن زار کا نقشہ پیش کرتا ہے،

---

[۱] فتوح السلاطین ص ۱۲،۹،

اس کی چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں :-

(الف) عصامی نے نظامی گنجوی سے خواب میں ملاقات کا نقشہ اس دلچسپ اور معنی خیز انداز سے کھینچا ہے[1] :-

"عالم خواب میں عصامی نے ایک مہمان خانہ کی سیر کی جو خانۂ آفتاب سے زیادہ منور تھا، جس میں بے شمار مسافر اپنے اپنے مقام پر قیام پذیر تھے، جب عصامی نے اس "جائے نغز" کا جائزہ لیا تو ایک مرد پیر کو خاموشی کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا، اس مرد پیر کے چہرے سے جلہ "سیاے ہوش" عیاں تھے، انھوں نے اس "صبح روشن" سے "اسرار شب" دریافت کیا، شاعر کے استفسار پر نظامی کے چہرہ پر صبح تبسم کھیل گئی"

(ب) عصامی نے کیخسرو کے بعد کیقباد کے بادشاہ ہونے کا ذکر خاص انداز سے کیا ہے، اور اس کے عیش و عشرت کا نقشہ اپنی ادبی مصوری سے بہت پرلطف انداز میں کھینچا ہے[2] :-

چو دیہیم کیخسروی کیقباد   بہ نیروئے اقبال بر سر نہاد
ہمی راند کارے در آں تخت گاہ   بہ کارش کمر بستہ ہر گنہ کلاہ
شب و روز بزم طرب ساختے   بہ اشغال دیگر نہ پرداختے
بہ بزمش رواں ساقیا صبح و شام   ہمہ شکریں لعل و شیریں کلام
ہمہ عنبریں زلف و صندل بدن   ہمہ سرو قد و ہمہ سیم تن
شہ شیر گیر اندر آں آہواں   شب و روز بودے تنکار افگناں

[1] فتوح السلاطین صفحہ ۱۸، [2] ایضاً ص ۱۸۷

(۲) جدت مضامین ولطف ادا :۔ شاعری کے لیے یہ سب سے مقدم چیز ہے، بعض ارباب فن کے نزدیک شاعری جدت ادا کا دوسرا نام ہے، شاعری اور انشا، پردازی کی جادوگری اسی سے عبارت ہے، یہ ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے، عصامی کو مبدأ فیاض نے یہ خوبی فراوانی سے عطا کی تھی، اس سے فتوح السلاطین جدت ادا اور لطف بیان کا ایک حسین وجمیل مرقع ہے، ذیل میں اس وصف کو چند مثالوں سے واضح کیا جاتا ہے :۔

(الف) شاہنامہ ایران باستان کی سرگذشت ہے، جس میں آتش پرستوں کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں، عصامی کہتے ہیں :۔

بس آنکہ یکی نامۂ خوش نبشت　　بیاراست آتشکدہ چوں بہشت

(ب) خوشی وشادمانی :۔

چوں بر ایک التمس ایں قصہ گفت　　دل ایبک از عشق چوں گل بشگفت

(ج) پیری کے متعلق عصامی نے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے، جو ان کے جدت وتخیل کی دلیل ہے :۔

بہ پیری بود آدمی را کمال　　بہ بدرے دہد نور کامل ہلال
ز موئے سپید اے برادر مرنج　　کہ بہ روشنی بہ تواں دید گنج

(۴) کردار کشی :۔ عصامی کو مختصر الفاظ میں شخصیتوں کا خاکہ کھینچنے میں کمال حاصل ہے، ان کے نزدیک اچھے اخلاق شخصیت کو آب وتاب عطا کرتے ہیں، وہ اپنے موئے قلم سے ان پیکروں میں جان ڈال دیتے ہیں، ان کی تاریخ، واقعات اور اشخاص کا ایک مرقع ہے :۔

(الف) ناصر الدین محمود کی سیرت کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں :-

شنیدم کہ آں شہ فرخندہ رائے — یکے بود از خاص گان خدا
بہ دعاریت بود تاج وسریر — کہ بودے بکارے پلاس وحصیر
شب و روز آں خوش ز از جان پاک — بدے مست از ذکر یزدان پاک

(ب) جلال الدین خلجی کی کردار کشی میں اس کو بڑی اہمیت دی ہے کہ اس کے زمانے میں کسی شخص کے دل کو تکلیف نہیں پہنچی :

شہے بود الحق حلیم و کریم — مزاجش بہ داد و دہش مستقیم
دراں ہفت سالے کہ او ملک راند — یکے خاطر آزردہ از وے نماند

(۵) ساقی نامہ :- عصامی ہر اہم تاریخی واقعے کے اختتام پر ساقی سخن سے جام تمرّت مانگتے ہیں، یہ شراب کبھی شراب عبرت سے عبارت ہوتی ہے اور کبھی ایک نئے دور مسرت افزا کی خوشیاں مراد ہوتی ہیں، ذیل میں اس کی دو مثالیں درج کیجاتی ہیں :

(الف) سلطان معز الدین محمد ابن سام کے قطب الدین ایبک کو ہندوستان سے طلب کرنے کی داستان شروع کرنے کے موقع پر ساقی سے مخاطب ہوتے ہیں :

بیا ساقیا بادہ در جام کن — مرا بے غم از دور ایام کن
کہ گیرم ز مستی جہان دگر — زنم خامہ در داستان دگر

(ب) سلطانہ رضیہ کے قید ہو جانے کے واقعہ پر دل گرفتہ ہو کر ساقی سے دل افسردہ پر آبحیات چھڑکنے کی خواہش کرتے ہیں کہ تازہ دم ہو کر معز الدین بہرام کی حکمرانی کا ذکر کریں :-

بیا ساقیا گرچہ در آتشم — چو باد چمن می رسد سرخوشم

یکے جرعہ بر خاک من برفشاں ز آب حیاتم دہ تازہ جاں

(۶) مضامین رزم:- فتوح السلاطین دراصل ایک رزمیہ تاریخ ہے، اس سے عہد وسطیٰ کے فن جنگ یعنی صف بندی کے اصول، فوجوں کی مختلف حصوں پر تقسیم، حملہ کا قاعدہ، آلات حرب کی تفصیل وغیرہ پر مفید روشنی پڑتی ہے، عام طور پر ایشیا کی بڑی تاریخیں اس قسم کی تفصیل سے خالی ہیں، میدان رزم کی مرقع کشی اور فوجی تکنیک سے واقفیت میں عصامی کو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے دوسرے مورخین کے مقابلے میں خاص امتیاز حاصل ہے، لڑائی کی تفصیلات کے علاوہ جنگ کی حالت میں سپاہیوں کی نفسیاتی کیفیت بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں، مثلاً سلطان معزالدین اور رائے پتھورا کی لڑائی اور گرشاسپ حاکم ساگر کی بغاوت کے سلسلے میں میدان جنگ کا بڑا کامیاب نقشہ[۱] پیش کیا ہے، اور فوج کی صف بندی اور معرکہ آرائی کا بڑی تفصیل اور نہایت باریکی سے جائزہ لیا ہے، مگر اس سے شعر کی لطافت اور نزاکت متاثر ہونے نہیں پائی ہے، میدان جنگ کی ایسی بہتر اور صحیح نقشہ کشی نثر میں بھی ممکن نہیں، یہ نظامی گنجوی کے فیضان کا نتیجہ ہے،

(۷) جذبات نگاری:- واقعہ کشی اور جذبات نگاری شاعری کا بڑا اہم عنصر ہیں، اس میں عصامی، فردوسی اور نظامی کے ہم پلہ ہیں، واقعہ کے بیان میں جزئیات اور گردوپیش پر پوری نظر رکھتے ہیں، اور ان کا احاطہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جذبات مجسم ہوکر آئینۂ تخیل میں منعکس ہو جاتے ہیں، وہ رمز شناس فطرت ہیں، ان کا دامن تخیل تشبیہ اور استعارہ کے گلہائے صد رنگ سے معمور رہتا ہے، اس لیے وادیٔ تخیل میں

---

[۱] فتوح السلاطین ص ۷۷

نئے نئے پھول کھلاتے ہیں، اور واقعہ نگاری، انداز بیان کی اثر انگیزی سے مرقع نگاری کا درجہ حاصل کرلیتی ہے، اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوگا،

(الف) ناصرالدین محمود[1] کو زہر دینے کے سلسلے میں دنیا کی بازی گری اور عیاری پر روشنی ڈالتے ہوئے جذبات نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے:۔

جہان کہن طرفہ بازی گری است فریبندۂ کودکاں اکثرے است

بسی تاج شاہان فرخ نژاد بہ بازی طفلاں سپارد بہ باد

یکی نوش او نیست خالی زنیش یکی را حتش نیست بیروں ز ریش

(ب) عشق و محبت کے کوائف کے بیان میں بڑی اثر آفرینی ہے، ایک مقام[2] پر عشق کی کارفرائی اور حکمرانی کا نقشہ بڑے سوز و گداز سے کھینچا ہے:۔

بر آں سر کہ نبود افسار عشق جوئے ہم نیرزد بہ بازار عشق

بسے خواجہ از عشق گردو غلام وزیں دانہ صیاد افتد بہ دام

کسے کو دریں راہ ننہاد سر بروں است از کاروان بشر

دریں کارواں بیں کہ ہر صبح و شام کشد خواجہ چوں ناقہ بار غلام

(۸) ضرب الامثال:۔ فتوح السلاطین میں ایسے بے شمار اشعار ملتے ہیں جو مصنف کے وسیع مطالعہ اور دنیاوی تجربہ کا نتیجہ ہیں، اس لیے وہ ضرب المثل بن سکتے ہیں، مثلاً:۔

دلم گوید ایں آب تنہا مخور کہ تنہا خور آمد ز سگ ہم بتر

بداند بہ ہر جا کہ نام آور است کہ مرگ از زبوں زیستن خوشتر است

در اندیشہ با خود دہانے بگفت گلے دیگر از باغ دوراں شگفت

---

[1] فتوح السلاطین ص ۱۴۳ [2] ایضاً ص ۳۰۴

قدم چوں تواں زد دریں طرفہ راہ — کہ غول از عقب دام پیش چاہ

(۹) حب الوطنی:۔ عصامی کو ہندوستان کی تاریخ، تمدن اور مناظر قدرت سے بڑی محبت ہے، اور وہ اس کو اس کے شاداب اور شگفتہ مناظر کی بنا پر رشک جنت کہتے ہیں، یہاں کے موسم میں سدا بہار کی کیفیت پائی جاتی ہے، اگر کانٹے بوئے جائیں تو پھول کھلتے ہیں:۔

(الف) خوشا رونق ملک ہندوستاں — کہ جنت برد رشک ازیں بوستاں

سوادش شدہ زیب روئے زمیں — چو خالے بہ رخسارے ہر نازنیں

بہ فصل خزانش در آید بہار — دمد گل در و گر بکارند خار

سرشتہ ہمہ خاک او بہ گلاب — درو شبنمے دادہ نفع سحاب

(ب) سرزمین ہند میں ایسی دلفریبی اور دلکشی پائی جاتی ہے کہ جہاں دیدہ سیاح جب یہاں پہنچتے ہیں تو سیر و سیاحت چھوڑ کر یہاں قیام پذیر ہو جاتے ہیں:۔

جہاں دیدگانے کہ گرد جہاں — بگردند دایم سیاحت کناں

بہ بندند خاطر بہ ہیچ از دیار — نگیرند ماہے بہ شہرے قرار

ہم آخر چوں در ملک ہندوستاں — در آیند اگر سیاحت کناں

سیاحت گذارند و ساکن شوند — برون زیں دیار و دمے کم روند

ان اشعار میں سیاح جہاں گرد سے ابن بطوطہ کی طرف اشارہ ہے،

(ج) محمد بن تغلق کے دور حکومت میں باشندگان دہلی کی دولت آباد کو منتقلی کے موقع پر اپنی مادر وطن "دہلی" کی عظمت اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

چناں تخت گاہے کہ در روزگار — بماند از شہان جہاں یادگار

ملک ہمہ کو چالیش مدام زیبہائے خود رفتہ ہر صبح و شام
مرمت در او کردہ ہر خسروے مباہات از و کردہ ہر پہلوے

(۱۰) ہندی الفاظ کا اثر :- فتوح السلاطین ایسی فضا میں تصنیف ہوئی جس نے ایک مخلوط زبان کو پروان چڑھایا، اس کے اثرات فتوح السلاطین میں بھی نظر آتے ہیں چنانچہ عصامی نے ہندی الفاظ کو فارسی الفاظ کے ساتھ بے تکلف استعمال کیا ہے، ذیل میں ایسے ہندی الفاظ کی فہرست دیجاتی ہے :-

راؤت	بمعنی بہادر
گھنٹی	" کہسار
نایک	" سرہنگ رسردار فوج
تھال	" طشت ، طبق ، سینی
کھنگر	" پرچین محکم از چوب و خار
سفیل	" در ہند تاکنون در اصطلاح عام فصیل را سفیل می گویند
ہولی	جشن و عیدے را گویند

غرض امیر خسرو اور عصامی ہندوستان کے فارسی ادب کی ایہٗ ناز ہستیاں ہیں، اگر فردوسی کے شاہنامہ اور نظامی گنجوی کے خمسہ کا شمار ادبیات عالیہ میں ہوتا ہے تو عصامی کی فتوح السلاطین اپنی صوری اور معنوی محاسن کی بنا پر ان سے کمتر قرار نہیں دیجا سکتی، عصامی نے عہد وسطی کی شاعری کے پر تکلف اسلوب کے بجائے کلاسیکی متانت، استواری کے ساتھ سادگی، سلاست اور روانی کو بھی برقرار رکھا ہے، انھوں نے رزم و بزم دونوں میدانوں میں شہسواری دکھلائی ہے، بزم کے میدان میں ان کی شاعری ایسے

چمن کا نقشہ پیش کرتی ہے جہاں عیش و نشاط، کامجوئی اور کامرانی کے پھول مسکراتے ہیں، اس لیے فتوح السلاطین کو بجا طور پر دکن کے عہد وسطیٰ کے فارسی ادب کا کوہ نور قرار دیا جا سکتا ہے، چنانچہ فتوح السلاطین کے ایک فاضل مرتب نے ان الفاظ میں فتوح السلاطین کے محاسن کا اعتراف کیا ہے :-

"عصامی در شعر فارسی مخصوصاً در صنف مثنوی مقامی بس عالی است و فی الواقع فتوح السلاطین بہترین نمونۂ مثنوی و دلکش ترین آثار قدمائے است کہ بزبان پارسی در ہندوستان انشا شدہ۔"

یہ ایک ادبی خزینہ ہے کہ بہمنیہ عہد کا بیش تر ادبی سرمایہ دست برد زمانہ کے نذر ہو گیا ہے، لیکن فتوح السلاطین کی موجودگی میں ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں:

"در دکن اگر عصامی است بس است"

ہندوستان عربوں کی نظر میں (جلد۲)

ہندوستان کی قدیم تاریخ سے متعلق قدیم عرب مصنفین خصوصاً عرب جغرافیہ نویسوں، سیاحوں اور مورخین کی کتابوں، سفرناموں اور تاریخوں میں جو بیش قیمت مواد پھیلا ہوا ہے اور جو تاریخ کے طالبعلموں کے لیے بہت کارآمد ہے اس کو دارالمصنفین نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ دو جلدوں میں جمع کرایا ہے،

اس جلد میں ابن ندیم، عبدالقادر بغدادی، قاضی صاعد اندلسی، عبدالکریم شہرستانی، قاضی رشید ادریسی، ابن ابی اصیبعہ، ابن بطوطہ، قلقشندی وغیرہ کی کتابوں اور سفرناموں کے اقتباسات اور ان کا اردو ترجمہ ہے، تاکہ جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ضخامت ۴۰۱ صفحے قیمت ـــ

منیجر

ٹونک کے تاریخی مخطوطات

از
جناب صاحبزادہ شوکت علی خانصاحب ایم اے ناظم ادارۂ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک

(۳)

اقبال نامۂ جہانگیری :۔ جہانگیر نامہ بھی کہلاتا ہے جو تین دفاتر پر مشتمل ہے، دفتر اول میں بابر اور ہمایوں کے ادوار کے تاریخی اور سیاسی حالات ہیں، دوسرے دفتر میں صرف اکبر اعظم کے طویل عہد حکومت کے واقعات کا احاطہ ہے، جس کی بنیاد زیادہ تر اکبر نامہ ہی ہے، تیسرے دفتر میں جہانگیر کے سوانح، سیاسی اور ملکی حالات ہیں جو ۱۵ سنہ جلوس تک کے واقعات پر مشتمل ہیں، تیسرا دفتر بہت عام ہے، اس کے نسخے قریب قریب سب کتب خانوں میں ملتے ہیں، لیکن دفتر اول اور دوم نایاب ہیں[۱] اور موجودنیا کے چند کتب خانوں کے علاوہ مشکل ہی سے اور جگہ مل سکتے ہیں، حالانکہ تینوں دفتر ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ سے طبع ہو چکے ہیں، لیکن اب کمیاب ہیں،

اس کے مصنف معتمد خاں عہد جہانگیری اور شاہجہانی کے معتمد رکن تھے، اور "شائستہ سریر سلطنت و فرمانروائے زیبندۂ افسر" تھے، ان کا اصلی نام محمد شریف ہے، ایران کے رہنے والے تھے، ہندوستان آکر تیسرے جلوس جہانگیری میں اعلیٰ منصب اور معتمد خاں کے موقر خطاب سے سرفراز ہوئے، جہانگیر نے اپنی تزک میں کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے، شاہجہاں کے دور شہزادگی

---

[۱] اسٹوری ص ۵۶۱

میں بخشی بناکر شاہجہاں کے ساتھ دکن کی مہم پر بھیجے گئے تھے، ۱۸ سنہ جلوس میں دکن سے واپسی میں تزک جہانگیری کی ترتیب کی خدمت سپرد ہوئی، معتمد خاں نے شاہجہاں کے زمانہ میں زیادہ ترقی کی، ۱۰ سنہ جلوس شاہجہانی میں میر بخشی کے منصب پر مامور ہوئے، ۱۰۴۹ھ م ۱۶۳۹ء میں انتقال ہوا،[1]

ایلیٹ نے اپنی کتاب میں اس کے ۴۰ صفحات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے،[2] اس ترجمہ کے متعلق جی، آر، کے، راے کی رائے ہے کہ "ایلیٹ نے جو حصص دیے ہیں وہ کسی اور کتاب کے معلوم ہوتے ہیں، اور ہمارے جہانگیر نامہ سے مطابقت نہیں کرتے"[3] جہانگیر نامہ کے تینوں دفتروں کا ترجمہ جے میکرڈ نے انگریزی میں کیا ہے، جو مسودہ کی شکل میں انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے، جہاں اس نسخہ کے تینوں دفتروں کے قلمی نسخے بھی موجود ہیں، دفتر سوم میں نہ صرف جہانگیر کے انیسویں جلوس کے واقعات ہیں، بلکہ معتمد خاں نے اس کی وفات کے بعد کے واقعات بھی بڑھا دیے تھے،[4]

انڈیا آفس کا دفتر اول جیسا کہ ایتھے نے بتایا ہے، غالباً انیسویں سنہ جلوس عالمگیری ۱۰۸۷ھ م ۱۶۷۶ء کا نوشتہ ہے، خدابخش خاں لائبریری میں بھی پہلا اور دوسرا دفتر ۱۰۴۵ھ م ۱۶۳۵ء کا نوشتہ ملتا ہے، برلن کے کتب خانہ اور میر Azumer میں تینوں دفاتر ہیں،[5] کتب خانہ سعیدیہ میں بھی تینوں دفتر ہیں جو ایک ہی جلد میں مجلد اور ۱۲۴۱ھ م ۱۸۲۵ء کے نوشتہ ہیں، اول اور آخر صفحہ پر ظہور علی اور لوح کتاب پر محمد امین

---

[1] مآثر الامراء، تذکرۃ الامرا اور تزک جہانگیری میں مزید حالات دیکھئے [2] History of India as Told by its own historian Volume VI PP 400 To 438 [3] استوری ص ۵۶۲

[4] مخطوطات انڈیا آفس لائبریری جلد اول مرتبہ ایتھے ص ۲۱ نسخہ نمبر ۳۱۰-۳۱۳ ملاحظہ ہو۔

[5] دیکھئے برلن کیٹلاگ ص ۴۸۷ اور Azumer ص ۲۵۷

کی مہریں ثبت ہیں، ان کے علاوہ دو جلدیں اور ہیں، ایک جلد اول کا حصہ ہے، جو ابتدا سے ۶ھ جلوس اکبر شاہی کے حالات پر مشتمل ہے، یہ حصہ دفتر دوم کا نامکمل حصہ ہے، جو ۳۴ھ جلوس شاہ عالم بادشاہ کے عہد حکومت کا مکتوبہ ہے، کاغذ سفید اور خط شکستہ ہے، اس کے کاتب سدھا رائے ہیں، جنھوں نے مشق کے طور پر یہ نسخہ لکھا تھا، اس لیے مکمل بھی نہیں کر سکے، بہت ممکن ہے کہ انھوں نے کسی ایسے نسخے سے نقل کیا ہو جو عہد جہانگیری یا شاہجہانی کا مکتوبہ ہو، شاہ عالم کے دور میں ایسے نسخوں کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں ہے، اس نسخہ کے علاوہ دفتر سوم کا ایک اور قلمی نسخہ بھی ہے جو نہایت دیدہ زیب مطلا، مذہب اور اعلیٰ خطاطی کا نمونہ ہے، اس اعتبار سے یہ نسخہ اور بھی اہم ہے کہ یہ نواب کلب علی خاں بہادر (متوفی ۱۳۰۴ھ م ۱۸۸۷ء) والی ریاست رام پور کے حکم سے لکھا گیا، جو اب ٹونک کے کتب خانہ میں ہے، نواب صاحب مرحوم کی مہر نواب کلب علی خاں بہادر، ثبت ہے، اس کے ساتھ ایک عبارت بھی مرقوم ہے، یہ نسخہ ۱۲۷۲ھ م ۱۸۵۵ء میں محمد مرتضیٰ خطاط نے ۲۵ رمضان المبارک کو مکمل کیا، نسخہ نہایت عمدہ اور گوناگوں صنعتوں کی وجہ سے بہت اہم اور کاغذ سفید خوشخط مجدول طلائی شنگرفی، آسمانی، لوح کتاب مطلا، مینا کار آسمانی اور فیروزی ہے، شروع کے دو صفحات کے بین السطور مطلا ہیں، پوری کتاب کا حاشیہ بھی گلکار اور مطلی ہے، جلد بھی بہت خوبصورت اور نفیس بنی ہوئی ہے،

جہانگیر نامہ یا تزک جہانگیری[1] - یہ کتاب سلیم شاہی، تزک جہانگیری، تاریخ سلیمی واقعات جہانگیری مختلف ناموں سے موسوم ہے، لیکن اس کا اصل نام جہانگیر نامہ ہے، جس سے وہ ابتدا میں موسوم تھی، چنانچہ اصل تزک جہانگیری میں مرقوم ہے کہ جب بارہ سالہ سوانح کو

---

[1] ۱۳ سنہ جلوس میں جہانگیر نامہ سے تزک جہانگیری نام بدلا گیا، اسٹوری ص ۵۵۲

جہانگیر نے مجلد کرا کے اراکین سلطنت میں تقسیم کیا، اس وقت اس کا نام جہانگیر نامہ ہی تھا،[۱] جہانگیر نامہ کے ابتدائی نو سالوں کا ترجمہ ارسکن نے انگریزی میں کیا تھا، جو برٹش میوزیم میں نمبر ۲۶۵۵۴ پر محفوظ ہے،[۲] تزک جہانگیری کے تین مختلف نسخے ملتے ہیں، جن میں پہلے دو مستند ہیں اور ایک غیر مستند جو مبالغہ آمیز بیانات پر مشتمل ہے، پہلا نسخہ ۳ جلوس کا نوشتہ ہو جس کی ابتدائی عبارت یہ ہے :۔ "حمد بے غایت و شکر بے نہایت معبودی را"۔ تیسرے مبالغہ آمیز نسخہ کی ابتدائی عبارت بھی یہی ہے، اول الذکر نسخہ خدا بخش لائبریری میں ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء کا نوشتہ ہے، انڈیا آفس میں ۱۰۹۴ھ م ۱۶۸۳ء کا اور برلن میں ۱۰۹۹ھ م ۱۶۸۴-۸۵ء کا نوشتہ ہے،[۳] اس کا دوسرا نسخہ بھی مستند مانا جاتا ہے، جو "از عنایات بے غایت الٰہی" سے شروع ہوتا ہے، یہ سال جلوس اول سے شروع ہو کر سترہویں جلوس تک کے احوال پر مشتمل ہو، یہ وہی نسخہ ہو جسکو جہانگیر نے جہانگیر نامہ کے نام سے موسوم کر کے اپنے امرا میں تقسیم کیا تھا اس کے بعد سترہویں سال تک کے حالات خود اس نے قلمبند کیے، جو انیسویں سال جلوس کے ابتدا تک معتمد خاں کے ذریعہ شاہی نگرانی میں بڑھائے گئے، اسی نسخہ کو محمد شاہ کے زمانہ میں محمد ہادی کامور نے ترتیب دے کر ایک مقدمہ کا اضافہ کیا، اس میں جہانگیر کے جلوس سے پہلے کے حالات سے لیکر اخیر تک کے واقعات ہیں، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں وہ نسخہ جو جہانگیر نے مجلد کرا کے تقسیم کرایا تھا ابتک محفوظ ہے۔ اس نسخہ پر جہانگیر اور شاہجہاں کے دستخط ثبت ہیں، اس لیے بہت اہم مستند اور نایاب مانا جاتا ہے،[۴] برٹش میوزیم میں بھی ایسا ہی ایک نسخہ محفوظ ہے، مگر اس میں کسی کے دستخط نہیں ہیں، صرف بارہ سال کے واقعات جہانگیر نامہ کے نام سے ہیں،[۵] انڈیا آفس

۱؎ ریو جلد اول ص ۲۵۴ ۲؎ ایضاً ۳؎ اسٹوری ص ۵۵۰ ۴؎ ملاحظہ کیجئے اورینٹل کالج میگزین لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۲۶ء ۵؎ اسٹوری ص ۵۶۰-۵۵۹

لندن کے نسخوں میں انیسویں سال جلوس تک کے حالات ملتے ہیں۔[1] تیسرا نسخہ جو مبالغہ آمیز ہے اور جس میں واقعات سن وار نہیں ہیں، تزک جہانگیری کے نام سے موسوم ہے۔ اس نسخہ کی ابتدا "حمد بے غایت و شکر بے نہایت" سے ہوتی ہے، اور اس عبارت سے پہلے کچھ اشعار بڑھائے گئے ہیں، مثلاً "اے نام تو سرو فتر اسرار جود" یہ پہلے نسخہ پر اضافہ معلوم ہوتا ہے ریو کا بیان ہے کہ یہ نسخہ شاہجہاں کے دور اول میں اس لیے لکھوایا گیا کہ اس کے ذریعہ ان واقعات کی جو اصل تزک میں جہانگیر نے شاہجہاں کے خلاف لکھے ہیں، پردہ پوشی ہو جائے، ان دونوں نسخوں کی اصلیت کا انکشاف سب سے پہلے ایس ڈی سے سی اور موریے نے کیا اور آخر میں پروفیسر ڈاوسن نے دونوں کے اقتباسات نقل کرکے پوری وضاحت اور تحقیق سے بتایا کہ اصلی تزک کونسی ہے، اور نقلی کونسی۔[2] اکثر نسخوں کے آخر میں ایک پند نامہ جہانگیر کے نام سے ملتا ہے، جس کو پرائس نے لندن اور کلکتہ سے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا تھا،

یہ نسخے مختلف طریقوں سے شائع ہوئے ہیں، محمد ہادی والے نسخے کے کچھ حصے جے اینڈرسن نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ۱۸۶۰ء میں شائع کیے، گولڈرون نے تاریخ ہندوستان میں ان کو شامل کرکے ۱۸۰۸ء میں شائع کیا، لیکن مکمل نسخہ سرسید احمد خاں نے ۱۸۶۳-۶۴ء میں دوبارہ مرتب کرکے طبع کرایا، جو ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ میں طبع ہوا، انگریزی میں اس کا مکمل ترجمہ ڈی، ایچ لووے (D. H. Lowe) نے ۱۸۶۹ء میں شائع کیا، اور اے رو جرس نے مقدمہ چھوڑ کر اصل کتاب کا دوسرا ترجمہ کیا جس کو ایچ بیوریج (H. Beveridge) نے ۱۹۰۹ء میں لندن سے دو جلدوں میں شائع کیا، ایلیٹ نے ان سب ترجموں پر نقد و تبصر

---

[1] ایتھ جلد اول ص ۱۱۹ مخطوطہ نمبر ۲۰۰۵ [2] Journal Dosaenis 1930 P.P. 359-430
[3] ایلیٹ اور ڈاوسن جلد ششم ص ۲۵۱ تا ۳۹۱ تک

کیا ہے[۱]، ہمارے یہاں کا نسخہ ہادی کے مرتبہ نسخہ سے قدرے مختلف ہے، ابتدا میں وہی اشعار ہیں جو مبالغہ آمیز نسخہ کے ہیں، اس کے علاوہ اور بہت سے اشعار بھی ہیں، یہ نسخہ مطلا' بین السطور اور لوح کتاب مطلا اور مینا کار اور حاشیہ طلائی اور گلکار ہے، اس میں جلوس اول ۱۰۱۴ھ م ۱۶۰۵ء کے حالات ہیں، ابتدا میں اکبر کے ذکر میں اس کے تخت شاہی کے حال میں جس پر بعد میں جہانگیر جلوہ افروز ہوا، لکھا ہے، کہ اس کی تیاری میں تین سو من سونا، دو کروڑ کے جواہرات اور پچاس من عنبر صرف ہوا تھا، اکبری تاج کی قیمت چار کروڑ تیس لاکھ (فی اشرفی تیس روپیہ کے حساب سے) بتائی گئی ہے، اس کے بارہ گوشوں میں بارہ ہیرے تھے، فی ہیرا ایک لاکھ اشرفی کی قیمت کا، موتی اور زمرد چار مثقال، ہر ایک کی قیمت ایک ایک لاکھ دو سو یاقوت جن کی قیمت بارہ لاکھ اس زمانہ میں تھی، جڑے ہوئے تھے، . . . . . .

اسی طریقہ سے زنجیر عدل کے بارہ میں لکھا ہے کہ ایک سو چالیس گز لمبی تھی، اور اس کی تیاری میں ساٹھ من سونا صرف ہوا تھا، آگے چل کر اپنے بیٹوں کا ذکر کیا ہے، ان میں شہزادہ خرم کی بہت زیادہ تعریف کی ہے، پھر نور جہاں کی شادی، اس کے مہر اور تسبیح کا ذکر ہے:

"اورا (نور جہاں) بعقد خود آوردم و ہشتاد لکھ اشرفی پنج مثقالی مہر او قرار دادم.....

و تسبیح مروارید ی از چہل دانہ کہ ہر دانہ او بہ چہل ہزار روپیہ خریدہ بود ما بخشیدیم"،

اسی قسم کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ اکبر نے حکم دیا کہ آگرہ کے دونوں خزانے تولے جائیں اور کل رقم کی تعداد تخمیناً بتائی جائے، تزک کے بیان کے مطابق ایک ہزار آدمی چار سو ترازو سے پانچ ماہ تک شب و روز تولتے رہے، تب بھی صرف ایک خزانہ تولا جا سکا، شہزادہ خسرو کے جواہرات کے صندوق کے بارہ میں لکھا ہے کہ اس میں دس کروڑ کے جواہرات تھے،

---

[۱] ایلیٹ اور ڈاورسن جلد ششم ص ۲۶۷ سے ۳۹۱ و ۳۹۲ سے ۳۹۹ تک

چولڈانی میں کہیں ضائع ہو گئے، اسی قسم کے بہت سے مبالغہ آمیز واقعات ملتے ہیں جو نسخہ ایادی اور دوسرے نسخوں سے بیان کے تسلسل میں مطابقت نہیں کرتے، البتہ کہیں کہیں واقعات میں مطابقت ہے، اس نسخہ میں بھی وہی انانیت ہے، جو جہانگیر کے اصلی نسخوں میں ہے، البتہ یہ فرق ہے کہ اس کے واقعات سنہ وار نہیں ہیں، اور دونوں مذکورہ بالا نسخوں کے واقعات سنہ وار ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تزک شاہجہاں کے دور میں مرتب ہوئی ہوگی جو ہو سکتا ہے کہ خود شاہجہاں کی ایما سے یا اس کے کسی معتمد امیر نے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لکھی ہو، اس نسخہ میں بھی کچھ پند و نصائح ہیں جو اکبر کی جانب منسوب اور جہانگیر کے زبان و قلم سے ادا کیے گئے ہیں، ان سب باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تزک دور شاہجہانی کی اختراع ہے، اس کا ان دونوں نسخوں سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے دور شاہجہانی کے ان حالات اور واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو گو مبالغہ آمیز ہیں، لیکن کسی اور کتاب میں اس تفصیل سے نہیں ملتے،

تاریخ نادری:۔ مصنفہ محمد مہدی استرآبادی، نادر شاہ کے عروج کے زمانہ سے لیکر اسکی موت ۱۱۶۰ھ م ۱۷۴۷ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے، اسکا فرانسیسی زبان میں Histoire de Nadir Chah کے نام سے ۱۷۷۰ء میں ترجمہ ہو چکا ہے، انگریزی ترجمہ بھی فاضل مترجم نے ۱۷۷۳ء میں لندن سے شائع کیا، اصل فارسی ایڈیشن تبریز، طہران اور بمبئی وغیرہ سے شائع ہو چکے ہیں،[1] مصنف کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ نادر شاہ سے وابستہ تھا یا کسی اور بادشاہ سے اس نے کسی بادشاہ کا نام مقدمہ میں نہیں لکھا ہے، مگر ریو کے بیان کے مطابق خود مہدی کے بعض بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نادر شاہ سے متعلق تھا، چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ جب نادر شاہ ۱۱۴۶ھ م ۱۷۳۳ء

[1] ریو جلد اول ص ۱۹۲ مزید ملاحظہ کیجئے مورے کیٹلاگ ص ۱۳۸، پیٹرس برگ ص ۲۹۳، میونخ ص ۸۱ کوپنہیگن ص ۲۲

میں اصفہان جا رہا تھا، تو میں ان کے ہمراہ تھا، اور وہیں نادرشاہ کے پوتے شاہ رخ کے پیدا ہونے کی خبر جانفزا ملی تھی، دوسری جگہ جو انگریزی ترجمہ میں پوری طرح واضح نہیں ہے، لکھتا ہے کہ نادرشاہ کی زندگی کے آخری سال ۱۱۶۰ھ میں وہ شاہی حکم سے مصطفیٰ خاں شاملو کے ساتھ سلطان ترکی کے پاس بھیجا گیا تھا، سر ہرفورڈ برجس نے اپنی کتاب ہسٹری آف کاجرس میں لکھا ہے کہ نادرشاہ سے اس کی ملاقات اور گفتگو کے وقت محمد مہدی نادرشاہ کے واقعہ نویس کی حیثیت سے موجود تھا،[۱] مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کتاب کا صحیح نام کیا ہے، دوسرے نسخوں میں تاریخ جہاں کشائی نادری اور تاریخ نادری دونوں نام ملتے ہیں، زیر نظر نسخہ میں کوئی نام تحریر نہیں ہے، یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ مصنف کے ان الفاظ "کہ از چاکران حضور مر بہ ضبط وقائع مامور است" سے کون سا بادشاہ مراد ہے، نادرشاہ یقینی طور پر مراد نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ چند ہی سطروں بعد نادرشاہ کو مرحوم لکھا گیا ہے،[۲] مگر ریو کی یہ بحث بے سود سی ہے، کیونکہ مصنف نے ان واقعات کو نادرشاہ کے انتقال کے بعد ہی ترتیب دیا ہوگا، اس لیے مقدمہ میں "از چاکران حضور" سے حکمران وقت مراد ہوگا، جو شاہ رخ ہوگا یا حسن خاں سردار کاجراں کو حضور تحریر کیا گیا ہے، جس کی تعریف و توصیف میں کتاب ایک تتمہ بڑھایا گیا ہے، یہ تتمہ فرانسیسی ترجمہ میں بھی موجود ہے، نسخہ ہذا مطلّا مینا کار اور مجدول شنگرفی اور ۱۲۳۱ھ م ۱۸۱۵ء کا نوشتہ ہے۔

سیر المتاخرین فارسی: اس کے مصنف غلام حسین بن ہدایت علی خان ابن سید علیم اللہ خاں بن فیض اللہ خاں بن شیخ علیم اللہ خاں بنگال کے مشاہیر میں تھے۔

---

[۱] ریو جلد اول ص ۱۹۳ [۲] ایضاً

مصنف کے والد یعنی ہدایت علی خاں بہار کے نائب صوبیدار تھے، جو شاہ عالم کے زمانہ میں فوجدار اور میر بخشی ہوگئے تھے، ۱۱۸۹ھ م ۱۷۷۵ء میں ان کا انتقال ہوا، ان کے بعد مصنف غلام حسین کچھ عرصہ ان کی جگہ میر بخشی پھر انگریزی عہد میں مختلف عہدوں پر مامور رہے۔

سیر المتاخرین ۱۰ صفر ۱۱۹۴ھ میں شروع اور رمضان المبارک ۱۱۹۵ھ میں مکمل ہوئی، بعد میں فاضل مورخ نے ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی شامل کیا تھا، جس کو گورنر جنرل وارن ہیسٹنگس کے نام سے منسوب کیا ہے، غلام حسین خاں نے مقدمہ میں یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ انھوں نے یہ مقدمہ ایک منشی کی تاریخ سے لیا ہے جو کوروپانڈ سے شروع ہو کر اورنگ زیب کی تخت نشینی تک کے حالات پر مشتمل ہے، منشی نے فارسی اور سنسکرت ماخذوں سے اس کو مرتب کیا تھا، میں نے اس کے اغلاط اور غیر فصیح جملوں کو درست کرکے سیر المتاخرین کے مقدمہ کی حیثیت دیدی ہے، ریو کا بیان ہے کہ اس مقدمہ کا اشارہ خلاصۃ التواریخ مصنفہ سجان رائے کی طرف ہے، اگر مقدمہ کو بھی سیر المتاخرین کا حصہ مان لیا جائے تو یہ ہندوستان کی مکمل تاریخ ہے، مگر اصل کتاب اورنگ زیب کے انتقال سے لیکر ۱۱۹۵ھ م ۱۷۹۰ء تک کے واقعات اور حالات مشتمل ہے جس کے تین حصے ہیں، ان تینوں حصوں کا انگریزی ترجمہ ایک فرانسیسی نومسلم حاجی مصطفیٰ نے ۱۷۸۹ء میں شائع کیا تھا، اس میں مقدمہ شامل نہیں ہے، ۱۸۳۲ء میں برجس نے اس کے بعض حصے دوبارہ لندن سے شائع کیے، اور بنگال سے متعلق حصہ کا ترجمہ بھی اسکاٹ نے اپنی کتاب تاریخ دکن میں شامل کیا،[1] اور مکمل تینوں جلدیں نولکشور پریس نے ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۶ء میں شائع کیں، اس کے دو ترجمے اردو میں بھی ہوئے ہیں

---

[1] دیکھئے تاریخ دکن جلد دوم از جے اسکاٹ صفحہ ۱۳۳ تا ۱۴۶

بخشی علی نے اقبال نامہ کے نام سے کیا ہے، دوسرا کسی شخص نے مرأۃ السلاطین کے نام سے کیا ہے، زیربحث نسخہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، دوسری اور تیسری جلدیں ایک ہی میں ہیں اور ۱۲۳۲ھ م ۱۸۱۶ء کی مکتوبہ ہیں، اول سے ایک ورق ناقص ہے صفحہ ۱۱۴۳ پر کتاب ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد ہی سے کاتب نے جلد اول کا حصہ شروع کر دیا ہے،

طبقات اکبر شاہی (فارسی):۔ طبقات اکبر شاہی یا طبقات اکبری یا تاریخ نظامی ہندوستان کی مکمل اور پہلی اہم بنیادی تاریخ ہے، بعد کے تمام مورخین نے اسی سے استفادہ کیا ہے، اس کے مصنف نظام الدین احمد بن محمد مقیم ہروی ہرات کے مشہور خواجہ عبداللہ انصاری کی اولاد میں ہیں، خواجہ مقیم ہروی بابر کے دیوان اور مرزا عسکری کے معتمد تھے، عہد اکبری میں پہلے گجرات کے بخشی اور بعد میں مغلیہ سلطنت کے بخشی مقرر ہوئے تھے، نظام الدین کے قول کے مطابق ان کو مطالعہ کا شوق ورثہ میں ملا تھا، اسلیے انھوں نے ابتداہی سے ایک ایسی مکمل تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تھا جو غزنی، غوری، پٹھان، مغل تمام خاندانوں کے حالات پر محیط ہو، یہ تاریخ امیر سبکتگین ۳۶۷ھ م ۹۷۷ء سے لیکر ۱۰۰۱ھ م ۱۵۹۲ء یعنی اکبر کے ستائیسویں جلوس تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے، اس کتاب کے ماخذوں کی فاضل مورخ نے باقاعدہ فہرست دیدی ہے، مثلاً تاریخ مینی زین الاخبار، روضۃ الصفا، تاج المآثر، طبقات ناصری، خزائن الفتوح، تغلق نامہ تاریخ فیروز شاہی، فتوحات فیروز شاہی، تاریخ مبارک شاہی، فتوح السلاطین تاریخ محمود شاہی، خود مندوی، طبقات محمود شاہی گجراتی، مآثر محمود شاہی گجراتی، تاریخ محمدی تاریخ بہادر شاہی، تاریخ بہمنی، تاریخ ناصر و مظفر شاہی، تاریخ مرزا حیدر، تاریخ کاشمیری تاریخ سندھ، تاریخ بابری، تاریخ ابراہیم شاہی، واقعات مشتاقی، اور واقعات

ہمایوں شاہی، ان میں سے بعض کتابیں اب نایاب ہیں، ہر دور کے حالات اسی دور کی تاریخوں تذکروں اور سوانح عمریوں سے تحریر کیے گئے ہیں، پوری تاریخ ایک مقدمہ، نو طبقات اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ میں غزنویوں کی تاریخ ہے، طبقہ اول میں ہندوستان کے سلاطین میں معزالدین محمد غوری سے لیکر ۱۰۰۲ھ تک کے واقعات ہیں، اس باب میں دور اکبری کے امرار، مشائخ، ادبار، علمار، فضلار، شعرار اور دوسرے مشاہیر اور اصحاب کمال کے حالات ہیں، طبقات شاہجہانی کے مصنف محمد صادق نے عہد اکبری اور جہانگیری کے حالات غالبًا اسی سے لیے ہیں، اس لیے کہ عہد اکبری کے بیشتر مشاہیر عہد جہانگیری میں بھی موجود تھے، طبقہ دوم دکن (۷۴۸ھ تا ۱۰۰۲ھ) کی تاریخ میں قطب شاہی عادل شاہی بہمنی نظام الملکی حکمرانوں کا ذکر ہے، طبقہ سوم میں تاریخ گجرات (۹۸۰ھ م ۱۵۷۲ء تا ۷۹۳ھ م ۱۳۹۱ء) تک کے واقعات پر مشتمل ہے، طبقہ چہارم میں تاریخ مالوہ ۸۰۹ھ سے ۹۷۷ھ تک کی تاریخ ہے، طبقہ پنجم میں تاریخ بنگال (۷۴۱ھ م ۱۳۴۰ء سے ۹۸۴ھ م ۱۵۷۶ء تک)، طبقہ ششم میں شرقی شاہان جونپور (۷۸۴ھ م ۱۳۸۶ء سے ۸۸۱ھ م [illegible] تک طبقہ ہفتم میں ملوک کشمیر (۷۴۷ھ سے ۹۹۵ھ) تک، طبقہ ہشتم میں تاریخ سندھ (فتح عرب ۸۶ھ سے ۱۰۰۱ھ) تک اور طبقہ نہم میں ملتان کی (۸۴۷ھ م ۱۴۴۳ء سے ۹۳۲ھ م ۱۵۲۵ء) تاریخ ہے، خاتمہ میں اکبری دور کے شہروں اور مواضعات کی تعداد ہے،

طبقات اکبر شاہی کا ذکر مورلے نے اپنے کیٹلاگ میں بالتفصیل کیا ہے[1]، ایلیٹ نے اپنی کتاب میں اس کے بڑے حصہ کا ترجمہ کیا ہے[2] اصل کتاب اور اس کا اردو ترجمہ دونوں

---

[1] مورلے کیٹلاگ ص ۵۸، استیورٹ کیٹلاگ ص ۱۱ کوپن ہیگن ص ۲۱

[2] ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن جلد پنجم ص ۱۷۷ تا ۴۸۹

شائع ہو چکے ہیں لیکن ہمارے ادارہ کا نسخہ قدامت کے لحاظ سے بہت اہم ہے، یہ نسخہ دور شاہجہانی کے اوائل کا لکھا ہوا ہے، کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا ہے، لیکن ترقیمہ میں سنہ کتابت ۱۰۴۹ھ م ۱۶۳۹ء درج ہے، ہمارے علم میں ہندوستان میں اس سے قدیم دوسرا نسخہ نہیں آیا، برٹش میوزیم کا بھی ایک نسخہ ۱۰۴۹ھ کا نوشتہ ہے، جو ہمارے نسخہ سے تقریباً ۸ ماہ بعد کا ہے، دوسرا نسخہ دور عالمگیری کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے، اس پر سعید الدین خاں اور دوسرے تحویلداروں کی مہریں ثبت ہیں، صحیح تاریخ کتابت اس نسخہ پر درج نہیں ہے۔[1]

ظفرنامہ یزدی (فارسی) :- تیمور کی جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں ظفرنامہ شامی اور ظفرنامہ یزدی زیادہ اہم ہیں، ظفرنامہ شامی دو حیثیتوں سے اہم ہے، ایک تو یہ کہ تیمور کی زندگی میں اس کے حکم سے لکھا گیا ہے، اس لیے سب سے زیادہ مستند ہے، دوسرے اس کی زبان بڑی سلیس ہے، اس کے بعد ظفرنامہ یزدی کا درجہ ہے، یہ ظفرنامہ تیمور کے پوتے ابراہیم سلطان نے لکھوایا تھا، اور اس کی تحریر ادیبانہ ہے، اس کی تصنیف میں مولانا یزدی نے اس دور کے تمام ماخذوں سے استفادہ کیا ہے، اس لیے یہ ظفرنامہ بھی معتبر اور مستند ہے، اس میں تیمور کے سوانح اور اس کے محاربات و لمہات کا ذکر ہے، جس سے اس دور کے سیاسی حالات اور مسلمانوں کے فن جنگ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، حبیب السیر کے بیان کے مطابق ظفرنامہ شیراز میں ۸۲۸ھ م ۱۴۲۴ء میں مرتب ہوا، اس کا تاریخی مادہ "صنف فی شیراز" ہے، جس سے سنہ تالیف ۸۲۸ھ م ۱۴۲۴ء برآمد ہوتا ہے سلطان ابراہیم کی مدح میں ایک مثنوی بھی شامل ہے،

پیٹش (de Pe Te) نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے، جو ۱۷۲۲ء میں پیرس سے

---

[1] ریو جلد اول ص ۲۲۱

بع ہوا، اسی سے ۱۸۲۳ء میں جے ڈربی نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔[۱] پیش نظر نسخہ کی ہمارے ادارہ میں دو نقلیں ہیں، ایک دور اکبری یعنی ۱۰۰۱ھ م ۱۵۹۲ء کی ہے، اس کی کتابت احمد بن شیخ مبارک فاروقی نے کی ہے۔ یہ نسخہ شاہی کتبخانوں کی زینت رہ چکا ہے، چنانچہ اس پر بہت سی مہریں اور عبارتیں تحریر ہیں، جو چیٹ زدہ اور کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے محو ہو چکی ہیں، اول کے دو صفحے مجدول، طلائی اور لوح کتاب مطلی اور مزین ہیں، لیکن اس نسخہ میں مقدمہ نہیں ہے، دوسرے نسخہ کی کتابت ۱۲۳۳ھ م ۱۸۲۲ء میں ہوئی ہے مگر کاتب کا نام تحریر نہیں ہے، یہ نسخہ ابو المظفر بہادر کے کتب خانہ کے نسخہ سے مقابلہ شدہ ہے، ایک اور خطی نسخہ بھی ہے، جس میں نہ مقدمہ ہے اور نہ سنہ کتابت درج ہے، البتہ اس پر ایک مہر علی احمد از قلب احمد علی ثبت ہے،[۲] لیکن طرز کتابت سے متذکرہ نسخہ سے قدیم معلوم ہوتا ہے۔

عالم آرائے عباسی (فارسی):- مصنفہ اسکندر بیگ، اس کے مقدمہ میں شجرۂ خاندان عباسیہ شیخ صفی الدین اور اس کے جانشین کے حالات ہیں، شاہ اسمٰعیل اور شاہ طہماسپ کی بھی تاریخ ہے صحیفہ اول میں شاہ عباس کی پیدائش، شاہ طہماسپ کی موت، اسمٰعیل مرزا اور سلطان محمد شاہ، عباس کے سریر آرائے حکومت ہونے تک کے حالات ہیں، صحیفہ دوم میں شاہ عباس کی تخت نشینی اور اس کے ابتدائی تیس سالہ دور حکومت ۱۰۲۵ھ م ۱۶۱۶ء کے حالات و واقعات ہیں، مقصد ثانی میں ۱۰۲۶ھ م ۱۶۱۷ء سے شاہ عباس کی موت ۱۰۳۸ھ م ۱۶۲۸ء تک کے حالات ہیں، نسخہ ہذا مطلی مذہب

---

[۱] ریو جلد اول ص ۱۸۳، [۲] علی احمد از قلب احمد علی ۱۲۹۶ھ، صاحبزادہ علی احمد خاں مرحوم بن احمد علی خاں رونق بن نواب امیر الدولہ بہادر جنت مکانی بانی ریاست ٹونک کا سجع ہے، علی احمد خاں مرحوم ٹونک کے
[illegible]

اور دیدہ زیب ہے، لوح کتاب بھی مزین، مینا کار اور مطلا ہے، ۴۸ سنہ جلوس کا مکتوبہ ہے، اس نسخہ میں صرف صحیفہ دوم ہے، صحیفہ اول اور مقصد ثانی نہیں ہے، کاتب نے اپنا نام اور تاریخ کتابت نہیں لکھی ہے، اول صفحہ پر نواب وزیر الدولہ بہادر خلد مکانی اور نواب یمین الدولہ محمد علی خاں بہادر جنت مکانی والیان ریاست ٹونک کی مہریں ثبت ہیں، برٹش میوزیم کا نسخہ اس نسخہ سے زیادہ مکمل اور قدیم ہے، اس کا آخری حصہ ۱۰۶۷ھ م ۱۶۵۶ء کا نوشتہ ہے[1]۔

عالمگیر نامہ (فارسی):۔ مصنفہ منشی محمد کاظم بن محمد امین، اس میں اورنگزیب عالمگیر کے دس سالہ عہد حکومت کے سرکاری واقعات ہیں، عالمگیر کو محمد کاظم کا طرز تحریر بہت پسند تھا، اس لئے محمد کاظم سے یہ تاریخ مرتب کرائی تھی، یہ حالات اورنگ زیب کی اورنگ آباد سے روانگی ۱۰۶۸ھ سے لے کر ۱۰۶۸ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، عالمگیر نامہ چھپ چکا ہے، ہمارے ادارہ کا نسخہ ۵ ذی الحجہ ۳۳ سنہ جلوس عالمگیری کا نوشتہ ہے، کاتب کا نام تحریر نہیں ہے۔

فرحۃ الناظرین معروف بہ سیر الاخیار (فارسی) } مولفہ محمد اسلم بن محمد حافظ عصمت اللہ قادری ۱۱۸۱ھ م ۱۷۷۰ء، شاہ عالم کے عہد میں لکھی گئی جس کا ذکر مقدمہ میں ہے، مصنف کا اصلی وطن لکھنؤ ہے، ۱۱۸۲ھ میں تصنیف کی ابتدا کی اور ۱۱۸۴ھ میں مکمل کر کے حکمران وقت شجاع الدولہ کے نام سے معنون کیا، یہ مختلف تاریخوں کی مستند اور اہم تلخیص ہے، جو عمومی تاریخ اسلام اور تاریخ ہند پر مشتمل ہے، مقدمہ میں ابتدائے آفرینش کا حال ہے، مقالہ اول میں انبیائے کرام، حیات نبوی

---

[1] ریو جلد اول ص ۱۸۵ - ۱۸۹، مورلے ص ۱۳۳، دی آئی ج ۲ ص ۴۷، اور اسٹوری کیٹلاگ ص ۱

آپ کے غزوات، خلفائے راشدین، ائمۂ عظام، فقہائے اربعہ کا حال ہے، دوسرے مقالہ میں ہندوستان کے مہاراجگان اور شاہانِ دہلی میں ابراہیم لودی کا حال ہے، تیسرا مقالہ امیر تیمور، یہ سے لیکر شاہ عالم تک کے واقعات پر مشتمل ہے، خاتمہ میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات، اور مصنف کے ہم عصر علما، مشائخ اور ہندوستان کے مشہور شہروں اور عجائبات کا تذکرہ ہے، پیش نظر نسخہ مصنف کے زمین عہد یعنی ۱۱۹۹ھ کا نوشتہ ہے، اسکے اول صفحہ پر ایک مہر ثبت ہے، اور ایک جگہ چٹ لگی ہوئی ہے، جس پر تاریخ کتابت درج ہے، ممکن ہے تاریخ کتابت غلط ہو، پھر بھی یہ نسخہ اہم ہے، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے، جو نامکمل ہے، اس میں اورنگزیب کے تخت نشین ہونے کے بعد کے واقعات غائب ہیں، نسخہ ہذا کی جلد اول میں متن کے ساتھ ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہے[۱]۔

---

[۱] ریو جلد اول ص ۱۳۱

مقالاتِ سلیمان حصہ اول

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر ارقام فرمائے، اور تحقیق اور موضوع سے متعلق نادر معلومات کی بہم رسانی کا حق ادا کر دیا، اس کا ہر مقالہ تاریخ کے طالبعلموں اور علما و محققین کے پڑھنے کے لائق ہے، یہ مجموعہ کل ایک ہزار چھپا ہے، اس کی خریداری میں عجلت فرمایئے ورنہ پھر شائقین کو دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت لعہ/

منیجر

شوکت جنگ اور سراج الدولہ کی جنگ بلدیہ باڑی

(سوزنامہ کی روشنی میں)

از جناب اکمل یزدانی جامعی ایم اے

نومبر ۱۹۶۷ء کے معارف میں راقم الحروف کا ایک مقالہ بعنوان "پورنیہ (بہار) کے دو مربیان علم، نواب صولت جنگ و شوکت جنگ" شائع ہوا تھا، جس میں راقم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ پورنیہ کے یہ دونوں فوجداران علم و ادب کے قدر دان ہی نہیں، مربی و سرپرست بھی تھے،

صولت جنگ (میرزا احمد سعید المخاطب بہ نواب سعید احمد خاں بہادر صولت جنگ) علی وردی خاں مہابت جنگ کا بھتیجا اور داماد تھا، اور سیف خاں پسر امیر خاں عمدۃ الملک عالمگیری (۱۷۲۲ء تا ۱۷۵۰ء) کے مرنے پر پورنیہ کا فوجدار ہوا تھا[1]، اور شوکت جنگ اس کا بیٹا تھا، اور اپنے باپ کے مرنے پر ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۷۵۶ء میں پورنیہ کی فوجداری پر مامور ہوا تھا،[2] علی وردی خاں مہابت جنگ نے جو اس کا نانا تھا، سارا پورنیہ اس کو جاگیر میں دے دیا تھا، ۹ رجب ۱۱۶۹ھ کو جب مہابت جنگ مرگیا[3] اور سراج الدولہ اس کا دوسرا نانی مسند نشین ہوا تو اس نے شوکت جنگ کو اپنی راہ سے ہٹا کر پورے پورنیہ پر اپنا تسلط جمانا چاہا اور اس کے لیے کوشش بھی شروع کر دیں، اس نے اپنے ایک خیر خواہ راے راس بہاری

---

[1] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۲۱۳ [2] ایضاً ص ۲۵۴ [3] ریاض السلاطین ص ۳۶۲

پسر راجہ جانکی رام کو بیرنگر دگوند وارہ کے پرگنے عطا کرکے شوکت جنگ کی نقل وحرکت پر مامور کیا اور شوکت جنگ کو اطلاع بھجوادی، شوکت جنگ یہ دیکھکر سخت چراغ پا ہوا اور چونکہ وہ بھی علی وردی خاں صاحب جنگ کا نواسہ تھا، اور پورنیہ اس کی جاگیر تھی، مزید براں اس کو بنگالہ، بہار اور اڑیسہ کی صوبیداری کی سند بھی دلی سے حاصل ہوچکی تھی، وہ کسی طرح تیار نہ ہوا بلکہ سراج الدولہ کے فرستادوں کے ساتھ بڑی بے عزتی کا برتاؤ کیا، اور اس کو کہلا بھیجا کہ چونکہ بنگالہ وبہار واڑیسہ کی سند مجھے دلی سے حاصل ہوچکی ہے، لہذا تم خود اپنے لیے کوئی جگہ تجویز کرکے مجھ سے اس کی سند طلب کرو اور دارالامارت کے خزانے واسباب میرے حوالے کردو ورنہ انتظار کرو کہ ہمارا ایک پاؤں رکاب میں ہے[۱]، یہ سنکر سراج الدولہ کا خون کھولنے لگا اور جلد یہ باڑی (پورنیہ) میں جو منہاری اور نواب گنج کے بیچ میں واقع ہے، اور فوجی نقطۂ نظر سے اس زمانہ میں بڑا محفوظ مقام سمجھا جاتا تھا، سراج الدولہ اور شوکت جنگ کی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی، بالآخر تھوڑی سی جنگ کے بعد ۱۶ اکتوبر ۱۷۵۶ء کو شوکت جنگ مارا گیا[۲]، اور پورنیہ بستی میں مدفون ہوا[۳]۔

زیر نظر مقالہ میں جو سوور نامہ کے اشعار پیش کیے جا رہے ہیں، وہ اسی جنگ سے متعلق ہیں اس میں سراج الدولہ اور شوکت جنگ کے ابین جنگ کی اچھی نقشہ کشی کی گئی ہے۔

یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ مخدومی جناب پروفیسر سید حسن عسکری صاحب آنریری جوائنٹ ڈائرکٹر جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ اور جناب قیام الدین صاحب ریسرچ فیلو جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ کو اس سوور نامہ کے دو اوراق بھاگلپور میں جناب شمس الہدیٰ خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے دولت کدہ پر پرانی کتابوں کی تلاش کے دوران میں دستیاب ہوئے تھے۔

---

[۱] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۵، [۲] ایس، سی، ہل، بنگال ۵۷-۱۷۵۶ء میں (اسی ۔ آئی) دوم ۵۳
[۳] مخطوطہ منظوم نامہ کرم علی خاں ورق ۵۵

اور راقم الحروف کو مرحوم و مغفور جناب فصیح الدین بلخی عظیم آبادی مولف تاریخ مگدھ' نے از راہ عنایت اس کی نقل عنایت فرمائی تھی، اور حکم دیا تھا کہ تاریخ کی روشنی میں 'سورنامہ' پہ پر کچھ لکھوں، راقم ان تمام حضرات کا شکرگذار ہے، اور سورنامہ کو اس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ قارئین کرام کو اس کے سمجھنے میں سہولت اور پڑھنے میں دلچسپی ہو۔

"سورنامہ شوکت جنگ بہادر" کے یہ اوراق ۲۹ اشعار پر مشتمل ہیں، زبان اس وقت کی مروجہ ہندوستانی ہے، طرز آلھا اودل کا سا اختیار کیا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ شاعر کی زبان پر مختلف علاقائی زبانوں کا بھی اثر ہے، سورنامہ مذکور میں طرفین کے اکثر و بیشتر سرداروں اور بہادروں کے نام ہیں، جو جنگ میں شریک تھے، اور جن کا تاریخ میں بھی تذکرہ ہے۔

جنگ کا آغاز ۱۲ محرم الحرام سنہ۱۱۷۰ھ کو ہوا[1]، سراج الدولہ نے عظیم آباد سے راجہ رام نرائن موزوں گورنر بہار کو طلب کر لیا تھا، اور اس کی معیت میں راجہ سندر سنگھ، پہلوان سنگھ اس کا بھائی سونہر سنگھ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ تھے، اس کے علاوہ محمد جعفر خاں، دوست محمد خاں، میر محمد کاظم خاں، دلیر خاں، اصالت خاں ولد عمر خاں اور شیخ دین محمد، سراج الدولہ کی فوج کے قابل ذکر سردار تھے۔

سراج الدولہ کی فوجیں شوکت جنگ کی فوجوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھیں، اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا، ایک حصہ کی قیادت راجہ موہن لال دیوان قدیم کو دے کر گنگا پار بھیج دیا تھا کہ براہ بسنت پور گولہ اور حیات پور گولہ اور جمدہ شوکت جنگ کے مقابلے میں آئے، دوسرے حصے کی قیادت خود کر رہا تھا، اس کے [illegible] رام نرائن موزوں

---

[1] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۲۰۰

کی فوجیں تھیں ؎۱

ادھر نواب شوکت جنگ کی طرف میمنہ میں شیام سندر بخشی، داروغہ توپ خانہ دستی اور میسرہ میں شیخ جہاں یار تھا، اس کے علاوہ میر مردان علی پسر رستم علی خواہرزادہ خواجہ متعصم برادر صمصام الدولہ خاں، بٹھن لال دیوان اور بعض دوسرے سرداران شوکت جنگ کی ہراولی میں تھے، اس جنگ میں غلام حسین خاں طباطبائی مؤلف سیرالمتاخرین بھی موجود تھا، جو شوکت جنگ کا مصاحب تھا، اور اس کے باپ صولت جنگ فوجدار پورنیہ کی مصاحبت میں بھی پورنیہ میں تقریباً سات سال رہ چکا تھا، ان کے علاوہ شوکت جنگ کی فوج کے قابل ذکر افراد یہ تھے :-

نقی علی خاں، کارگذار خاں بخشی، شیخ عبدالرشید، میر سلطان خلیل، محمد سعید خاں، پسر ابوتراب خاں تورانی، شیخ بہادر نارنولی، مرزائی خاں، عمر خاں جمعدار ؎۲

شوکت جنگ کی فوج نے نواب گنج میں سونرا ندی کے کنارے مورچال بندی کی تھی، شوکت جنگ نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھی مگر لشکروں کو اپنے سے دور دور رکھا، اور کسی کو کوئی واضح حکم بھی نہیں دیا، ہر ایک اپنی اپنی جگہ کھڑا حکم کا منتظر رہا، جب ۲۱ محرم ۱۱۷۰ھ کو دوپہر کے قریب سراج الدولہ کی فوجیں موہن لال کی سرکردگی میں منہاری کے میدان میں آپہنچیں اور دونوں لشکروں کا درمیانی فاصلہ ابھی ڈیڑھ کوس تھا، کہ شیام سندر شوکت جنگ کا داروغہ توپخانہ اپنی فوجیں لے کر آگے بڑھ گیا اور موہن لال کی فوج کے مقابل کھڑا ہوگیا، بیچ میں کوئی آڑ نہ تھی، موہن لال کی فوجیں گنگا کے کنارے خیمہ زن تھیں، شیام سندر حکم کا منتظر تھا، کہ ناگاہ موہن لال کے کیمپ سے گولے

؎۱ سیرالمتاخرین ترجمہ اردو ج ۲ ص ۲۷۹ ؎۲ ایضاً ص ۲۷۹-۲۸۰

چھوٹنے لگے، پہلے چھوٹی چھوٹی توپیں استعمال ہوئیں، اس لیے اس کے گولے جھیل میں گرنے لگے، یہ دیکھکر موہن لال نے بڑی توپیں منگوائیں اور اس کے گولے شوکت جنگ کے کیمپ میں دھڑا دھڑ گرنے لگے، شوکت جنگ یہ دیکھکر بہت بوکھلایا اور بدحواسی کے عالم میں اپنے سواروں کے دستے کے سرداروں کو بہت برا بھلا کہنا شروع کیا، گالیاں سنکر شیخ جہاں یار کارگذار خاں، حبیب بیگ، محمد سعید خاں، شیخ سعداللہ، میر سلطان خلیل وغیرہ سردار چار ونا چار آگے بڑھے، اور باوجودیکہ درمیان میں بہت بڑی جھیل حائل تھی اور سخت دلدل تھی جس میں گھوڑوں کا آگے بڑھنا تقریباً محال تھا کسی طرح آگے بڑھتے رہے، سخت دلدل میں گھوڑے بری طرح پھنس گئے، دوسری طرف سراج الدولہ کی فوجوں نے گولوں کی بوچھاڑ شروع کر دی، شوکت جنگ اپنی فوج سے بالکل بے پروا بھنگ کے کش پر کش لگاتا رہا، اور رقص و سرود کی مجلس میں داد عیش دیتا رہا، حالات جنگ کی نزاکت کے پیش نظر شوکت جنگ کے سرداروں نے اس کو نشہ ہی کی حالت میں ہاتھی پر سوار کر دیا، ایک نوکر اسے پکڑے رہا، اسی حالت میں اس کا ہاتھی آگے بڑھا، اور غنیم سے تاب مقابلہ نہ لاکر شوکت جنگ مارا گیا۔[1]

غلام حسین صاحب سیر المتاخرین کا بیان صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں :-

"میں اور چند اشخاص لڑائی میں شوکت جنگ کے ہمراہ تھے، ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ رات کو ہم سب اکٹھے ہو کر شوکت جنگ کو طریقۂ جنگ کی تبدیلی پر مجبور کریں گے اور وہاں سے ایک ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر جہاں میرا چھوٹا بھائی نقی علی خاں وغیرہ تھے، جانے کا ارادہ کیا، کچھ دور آگے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ جہاں یار، کارگذار خاں حبیب بیگ

---

[1] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۲۸۱ - ۲۸۳

محمد سعید خاں، شیخ سعد اللہ، میر سلطان خلیل اور دیگر سرداران لشکر شوکت جنگ کے حقارت آمیز کلمات سے آزردہ ہوکر سراج الدولہ کی فوج پر دھاوا کر بیٹھے ہیں، اور نصف جھیل کو طے کرکے سراج الدولہ کی فوج کے قریب پہنچا ہی چاہتے ہیں، عنقریب جنگ کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے، نواب شوکت جنگ کی فوج کو اس خستہ حالی میں دیکھکر میں سخت گھبرا گیا اور نواب مذکور کو اس صورت حال سے باخبر کرنے کے لیے خیمہ گاہ کی طرف دوڑا، قریب پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ نواب مذکور شراب کے نشے میں چور آشفتہ سر و دستار ہاتھی پہ سوار ہے، اور ان کے ہمرکاب بھی جلد جلد تیار ہو رہے ہیں، نواب کی یہ حالت تھی کہ لوکھلاہٹ میں دس پانچ قدم چلتا اور پھر فیلبان کو کھڑا ہونے کا حکم دے دیتا تھا، ادھر شوکت جنگ کی فوجیں دھڑا دھڑ موٹ کے گھاٹ اتر رہی تھیں، اس کی فوج کا یہ ابتر حال دیکھکر میر محمد خاں میر کاظم خاں، عمر خاں، دلیر خاں و اصالت خاں پسران عمر خاں اور شیخ دین محمد جو راجہ رام موہن کی فوج کے ہراول تھے، شوکت جنگ کی فوج کا کام تمام کرکے آگے بڑھے، شیخ عبدالرشید، محمد سعید خاں خلف ابو تراب خاں تورانی و میر سلطان خلیل نے بھی لڑ بھڑ کر جانیں دیں، نقی علی خاں اور حبیب بیگ زخمی ہوکر دوست محمد خاں اور میر محمد جعفر خاں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، اور شیخ جہاں یار صحیح و سالم اور کارگذار خاں زخمی ہوکر بھاگے، شیام سندر داروغۂ توپ خانہ دستی بھی زخمی ہوا، اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا"[1]

کرم علی خاں مولف مظفر نامہ کا بیان جنگ کرم علی خاں یکے از وابستگان علی وردی خاں نہایت صاحب مظفر نامہ رقمطراز ہے، کہ" شیام سندر نے کچھ اس ڈھنگ سے لڑائی لڑائی کر وہ

---

[1] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲

اپنے ساتھ دو ہاتھیوں پر لادکر سونے اور چاندی کے چھلے لیتا آیا تھا، جب بندوق کی گولیوں کی بوچھار ہوتی اور کوئی سپاہی ہمت شکستہ ہوکر پیچھے ہٹتا نظر آتا تو اس پر فوراً ان چھلوں کی بارش کی جاتی تھی[1]،

آخرکار جب میمنہ شیام سندر اور میسرہ جہاں یار سے خالی ہوگیا اور مردان علی اور مٹھن لال اور بعض دوسرے سرداران فوج مقابلہ کی تاب نہ لاسکے اور بھاگ کھڑے ہوئے، جسارت خاں برادر شوکت جنگ بھاگ گیا، شوکت جنگ کا دوسرا بھائی مرزائی خاں بھی زنبورک سے گھائل ہوگیا تو شوکت جنگ آگے بڑھا، اور دوست محمد خاں کے مقابلے میں صرف چھ سات سوار لیکر لڑنے لگا، آخرکار بائیں ابرو پر گولی لگی اور اس کا کام تمام ہوگیا،

بعضے کہتے ہیں کہ شوکت جنگ کی موت اس وقت ہوئی جب کہ وہ سراج الدولہ کی فوج پر حملہ آور تھا، جس میں سراج الدولہ خود شریک تھا، مگر بعض مورخین کا بیان ہے کہ سراج الدولہ بذات خود اس جنگ میں شریک نہیں ہوا بلکہ میر بسیر میر جعفر کو اپنا لباس پہنا کر غنیم کو فریب دینے کیلئے بھیجدیا اور خود ایک منزل دور تھا،

کرم علی خاں مولف مظفرنامہ کا بیان ہے کہ شوکت جنگ کے سر پیچ ممنی اور دستار زعفرانی کو جو اس کے زیر سر تھا، لوگوں نے سراج الدولہ کو بطور ہدیہ پیش کیا تھا، جو میدان کارزار سے ایک منزل دور تھا[2]،

شوکت جنگ کے قتل کے بعد بھی جنگ جاری رہی اور شیخ بہادر نارنولی قدیم وفادار شوکت جنگ نے جس کو زخمی ہو جانے کی وجہ سے مور چال میں لاکر ڈال دیا گیا تھا جب شوکت جنگ کو مردہ پڑا دیکھا تو بے قابو ہوگیا، اور دو سو سواروں کو لے کر مورچال

---

[1] مخطوطہ مظفرنامہ کرم علی خاں ورق ۵۵ [2] غلام حسین صاحب سیرالمتاخرین نے کسی کے اٹھانے کا ذکر تو کیا ہے مگر بطور ہدیہ پیش کرنے کا ذکر نہیں کیا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہی صحیح ہو کیونکہ شوکت جنگ کے قتل کے فوراً ہی بعد غلام حسین گھر کو روانہ ہو (پورنیہ چل دیے تھے)، (اکمل یزدانی)

سے میدان جنگ کی طرف بھاگا، لیکن جب اس کے سوار بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ بے دست و پا ہو گیا تو بے عزتی سے مرنے کی بجائے خود کو ہاتھی پر سے گرا دیا[1]

بعض بیانات کے مطابق سراج الدولہ کے ۵ ہزار سپاہی اس جنگ میں کام آئے گو شوکت جنگ کے سرداران لشکر نے کافی پامردی اور دلیری دکھائی، مگر شوکت جنگ کی نادانی، تند خوئی، درشت مزاجی اور بے جا پندار کی وجہ سے اسے نہ صرف سلطنت بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا،

سوز نامہ شوکت جنگ بہادر :-

شوکت جنگ لڑنے کو چلا منہاری کے میدان

ہرول ہوئے شیخ[2] جہاں تسکے پیچھے سندر[3] جاں
تسکے پیچھے میداں رشید[4] ا زور لائے نئی نشاں

شیخ بہادر نارنولی، قدرت اللہ[5] بیرم خاں[6]
تسکے پیچھے میر شرف[7] الدین سنبر برق ہو نشاں

دوسرے بازو شیخ سعد اللہ حبیب[8] یکہ جواں
تسکے پیچھے سیتارام ما مدالتا شمشیر خاں

تسکے آگے سلطان[9] خلیل اور امین خاں جانباز[10] خاں
تسکے پیچھے بھورمل او بخشی آگے ہاتھی میر مرداں[11]

ہر سبکہ او بھوانی سنگھ شیر[12] خاں، منسا رام
لوہا[13] سنگھ کا پیارا تس کے پیچھے بادل خاں

---

[1] مخطوطہ مظفر نامہ ورق ۵۵ تا ۶۴

[2] شیخ جہاں یار، شوکت جنگ کا تجربہ کار فوجی سردار [3] ہسیام سندر بخشی داروغہ توپخانہ دستی (شوکت جنگ)

[4] عبدالرشید نواسہ شیخ جہاں یار [5] قدیم وفادار و غمخوار شوکت جنگ

[6] داماد شیخ جہاں یار [7] غالباً سیف الدین محمد خاں نواسہ آقا عظیما قائم مقام علی ہزاری

[8] مہابت جنگ کا قدیم ملازم جو سراج الدولہ کے عتاب سے خائف ہو کر شوکت جنگ کے ملازموں میں شامل ہو گیا تھا،

[9] میر سلطان خلیل خاں تیر انداز شوکت جنگ [10] جانباز بیگ خاں [11] میر مردان علی عمدہ رستم علی خاں بہزادہ خواجہ معظم

[12] مراد شیر خاں (ریاض السلاطین ۳۶۰) [13] لوہا سنگھ ہزاری، سردار شوکت جنگ،

تسکے پیچھے مرزائی[1] کا ہاتھی بائیں ہاتھی ہادی خاں — تسکے پیچھے نواب[2] جان کا ہاتھی ماہی مراتب لیے نشان
کلی تمام تن زیب کا سر باندھو سو ہا بیٹا خاں — سبز ہودے اوپر بیٹھا جوں سوبھے چاند پورنیا ر

ادھر کے ہرول جعفر[3] تس کے پیچھے عمر[4] خاں — تسکے بائیں رام نرائن[5] کا ہاتھی ماہی مراتب لیے نشان
تسکے ڈہنے راجہ بہادر محکم سنگھ اور رحم خاں — تسکے پیچھے رامجی بیٹا اور دوست محمد یکہ خاں
پہر دیں کے اوپر فتو جاں ہو لڑائی کے ہنمان — سیام سندر نے توپیں ڈاکا بیچ منہاری کے میدان
پہلے چھوٹی چھوٹی توپیں تب توں چھوٹی بڑی کمان — گولی تیر تب چھوٹن لاگے لاگے جہوٹن اور کمان
گولی برسی بوند ساون تردار چلی گھماسان — میاں رشید اتب کھیت ہوں کو دا اڑ سیا جا چوں سور
تسکے پیچھے قدرت اللہ دی بھی کردی رن کی ہانہہ — بیٹے کے غم میں جان دیا گیا زندگی اس جہان
شیخ بہادر اوڈگیا اوڈ گئے کیسے کیسے جوان — سلطان خلیل توں چنچل ہوا بیٹھ دیا جانباز خاں
جاں باز خاں کے بیٹھ دیے رم کئے سائے جہان — شوکت جنگ تب یوں کے بولا کتنا نمک آنو بابا خان
گھوڑا روپیوں خلعت دیوں تو دل دہوں ہر جوان — مرشد آباد کا لوٹ بخشا دیوں ہاتھی اور نشان
اٹھی ماہی بہائی جان کا لے چلو مجھے اوس میدان — شوکت جنگ نے یوں کہا سوں بات میر فیلبان
پہلے ہاتھی نواب نے ہو لا تب ہو لیں سپہ سران — برابر پہنچا دوست محمد پوچھا کہاں مرا بھائی جان
دوست محمد یوں کر بولا لو اب میرا کہا مان — پہلے میل کے ہم سوں جاؤ تب یوں پاؤ بھائی جان
شوکت جنگ تب یوں کر بولا ہو موڑے دوست محمد خاں — موڑی پا ایں کو جب پہلن جوں دیکھئے او بہائی جان
تیر کمان تب ہاتھ کر لیا کھینچ کر مارا کر نشان — دانتوں اوپر کھاڈ بیٹھا سہری ڈوبا پہر پیکان

---

[1] مرزائی خاں برادر شوکت جنگ [2] نواب شوکت جنگ بہادر [3] میر محمد جعفر خاں
[4] سردار سراج الدولہ [5] راجہ رام نرائن موزون صوبیدار عظیم آباد

تسکے آگے نالا آیا موت کا وہ تہا مکان یک سلح میں زخمی ہوئے شیخ جہاں یار بادی خان
سعد اللہ زخمی ہوئے کہالی کہا و شمشیر خان میر شرف الدین کہیت آئے ہوئے زخمی تمام رجان
ہوا زخمی بہور مل اور سیتا رام لوہا سنگھ کا جان تس کے پیچھے بہوتے خلقت نام کہان تک میں کروں بیان
ہولو ہاتھی بابا میرا لے چلو مجھے اوس مکان خدا ہی چاہے سو کرے لیکر چلو جہاں بہائی جان
عمر خان نے زخم کہایا کٹ گئے کتنے جوان دوست محمد نے ہاتھی ہولا ہولا ہاتھی زخم خان
بہائی جان کو دیکھے ماؤن ٹک کہول دو پگڑیاں تمنے صورت مجکو کہتا دیکہ نشان اب سور مان
ہتلا ہتلا کر کے بیٹھا چلا لینے کون نشان اس ضمن میں گولی بیٹھی دہول کیا شاہ جوان
خدا کا کرنا یوں کر تہا تون بندہ کا کیا ہے گمان میاں حاضر نے چادر ڈہانکا پہیرا ہاتھی استہان

دار المصنفین کا سلسلۂ تاریخ ہند

اس سلسلہ میں ابتک بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ بزم مملوکیہ	قیمت	معہ
۲۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	"	عہ
۳۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	"	۲۵ پیسے
۴۔ ہندوستان کے سلاطین، علما، و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	"	للعہ پیسے
۵۔ ہندوستان کے سلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے	"	عہ
۶۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں		پیسے
۷۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (حصہ اول)		صہ
۸۔ مقالات سلیمان (تاریخی جلد اول)		پیسے

منیجر

پنجاب میں اردو غزل کی تاسیس

حضرت نوشہ گنج بخش قدس سرہٗ کا اردو کلام

از
جناب سید شریف احمد شرافت نوشاہی

حضرت شیخ الاسلام سید العارفین شاہ حاجی محمد نوشہ گنج بخش قدس سرہ العزیز اکابر سادات علویہ اور اعاظم مشائخ قادریہ سے تھے، اسلام شاہ خلف شیر شاہ سوری کے عہد میں ۹۵۹ھ / ۱۵۵۲ء میں بمقام گھوگانوالی (تحصیل پھالیہ، ضلع گجرات) پیدا ہوئے[1]،

حافظ قائم الدین قادری اور حافظ بڈھا قادری سے موضع جاگوتارڑ کے درس میں قرآن مجید حفظ کیا[2] اور علوم معقول و منقول سے فارغ التحصیل ہوئے[3]،

حضرت سخی شاہ سلیمان نوری قادری بھلوالی[4] کے دست حق پرست پر بیعت کرکے

---

[1] مناقبات نوشاہی قلمی، مصنفہ شاہ عمر بخش نوشاہی رسول نگری متوفی ۱۳۱۱ھ، یہ کتاب صاحبزادہ محمد ظہور ولد سید چراغ علی صاحب نوشاہی کے پاس موجود ہے [2] تحقیقات چشتی، مصنفہ مولوی نور احمد چشتی لاہوری،

[3] رسالہ الاعجاز فارسی قلمی، مصنفہ مرزا احمد بیگ لاہوری، سال تصنیف ۱۱۰۷ھ، مملوکہ شرافت ۱۲

[4] ثواقب المناقب فارسی قلمی، مصنفہ شیخ محمد ماہ صداقت کنجاہی، متوفی ۱۱۴۸ھ سال تصنیف ۱۱۲۶ھ مملوکہ شرافت صداقت مرحوم مولانا غنیمت کنجاہی متوفی ۱۱۱۰ھ کے برادر زادہ اور شاگرد تھے، ۱۲

[4] حضرت سخی شاہ سلیمان قادری سلسلہ میں مخدوم شاہ معروف خوشابی متوفی ۹۸۷ھ کے مرید و خلیفہ تھے،
(باقی حاشیہ ص ۳۸۴)

قال سے مرتبہ حال تک پہنچے اور مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھکر مخلوق خدا کی رہنمائی کی[۱]، اور بے شمار غیر مسلموں کو حلقۂ اسلام میں داخل کیا، ہندوؤں کے ایک رہنما جوگی کو مسلمان کیا، اسکے ساتھ ہزاروں چیلے بھی زیور ایمان سے آراستہ ہوئے[۲]۔ ایک فرانسوی مستشرق گارساں دتاسی نے بھی آپ کی تبلیغ اسلام کا اعتراف کیا ہے[۳]۔

آپ نے ممالک اسلامی کی بھی سیر و سیاحت کی۔ سندھ میں کچھ عرصہ گذارا[۴]۔ قاہرہ کی جامع مسجد میں چالیس روز اعتکاف کیا، وہاں حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا، اور اس علاقہ میں اکثر مشائخ سے ملاقاتیں کیں[۵]، اپنے والد ماجد حاجی الحرمین الشریفین سید علاء الدین حسین علوی کی طرح سات حج سے مشرف ہوئے[۶]۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۳) ۹۸ سال کی عمر میں، ۲ رمضان ۱۱۰۲ھ کو انتقال کیا، (تحفۃ الزکیہ مصنفہ سید حافظ الٰہی بخش نوشاہی ساہن پالوی متوفی ۱۲۵۳ھ، نسخہ قلمی مملوکہ شرافت نوشاہی۔ نوٹ:- خزینۃ الاصفیا، جلد اول، مصنفہ مفتی غلام سرور لاہوری متوفی ۱۳۰۷ھ میں شاہ سلیمان کی وفات ۱۰۶۵ھ میں لکھی ہے، جو خاندانی تذکروں اور مخطوطات کے خلاف ہے اسلیے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

[۱] تذکرہ نوشاہی فارسی قلمی، مصنفہ سید حافظ محمد حیات نوشاہی متوفی ۱۱۷۳ھ سال تصنیف ۱۱۴۶ھ۔ اسکے تین قلمی نسخے ایک قدیم، دو جدید راقم السطور شرافت نوشاہی کے کتبخانہ میں ہیں اور ایک نسخہ مکتوبہ ۱۱۹۰ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں موجود ہے جس کا نمبر ۶۱۸ ہے

[۲] مثنوی تحائف قدسیہ فارسی منظوم، مصنفہ شیخ پیر کمال لاہوری، سال تصنیف ۱۱۸۶ھ۔ مملوکہ شرافت نوشاہی،

[۳] خطبات گارساں دتاسی شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۵ء خطبہ ۱۶ ص ۱۵۰ اصل عبارت یہ ہے:-

"ایک شخص نے جس کا نام حاجی محمد ہے پنجاب میں دو لاکھ ہندوؤں کو زمرۂ اسلام میں شامل کیا۔"

[۴] تشریف الفقرا فارسی قلمی مصنفہ فقیر سید غلام محی الدین بخاری لاہوری، متوفی سنہ (مورث خاندان فقیر صاحبان لاہور) اس مخطوطہ کا ایک نسخہ فقیر سید مغیث الدین بخاری لاہوری کے اور ایک نسخہ راقم سطور شرافت نوشاہی کے کتب خانہ میں ہے۔

[۵] چہار بہار فارسی قلمی۔ ملفوظات حضرت نوشہ گنج بخش، مرتبہ شیخ ہاشم شاہ شہر پالوی سال تصنیف ۱۲۰۹ھ، اس مخطوطہ کے دو نسخے شرافت نوشاہی کے کتب خانہ میں ہیں، اور ایک نسخہ ماسٹر غلام نبی کے پاس دھنی پورہ لاہور میں ہے۔

[۶] ہفتاد اولیاء، مصنفہ شاہ شریف احمد مرحوم سہروردی

حضرت نوشہ صاحب کے دو فرزند تھے:۔

(۱) سید حافظ محمد برخوردار بحر العشق[1]، (۲) سید محمد ہاشم دریا دل[2]،

حضرت نوشہ گنج بخش قدس سرہٗ کی وفات شاہ جہاں کے عہد حکومت ۸ ربیع الاول ۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۴ء کو ہوئی،[3] آپ کا روضۂ مبارک دریائے چناب کے شمالی کنارے پر بمقام ساہن پال شریف تحصیل پھالیہ ضلع گجرات (مغربی پاکستان) زیارت گاہ خلائق ہے[4]،

حضرت نوشہ صاحبؒ علوم تصوف و توحید کے علاوہ فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے، اس مضمون میں آپ کے اردو کلام سے متعارف کرانا مقصود ہے، اہل قلم میں آجکل یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ اردو غزل گوئی میں اہل پنجاب میں کون سب سے مقدم ہے، بعض نے حضرت شاہ مراد خانپوری متوفی ۱۱۴۲ھ کو غزل کا موسس قرار دیا ہے، مگر کچھ محققین کو اس سے انکار ہے، اور ان سے پہلے غزل کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ محمد صدیق صاحب سالک نے رسالہ سیارہ ڈائجسٹ

---

[1] سید حافظ محمد برخوردار بحر العشق خوشنویس، ولی کامل تھے، حضرت نوشہ صاحب کے بعد سجادہ نشین ہوئے، ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۹۳ھ کو وفات پائی (لطائف گل شاہی قلمی، مملوکہ شرافت نوشاہی)،

[2] سید محمد ہاشم دریا دل نے ۲۲ ذی الحجہ ۱۰۹۲ھ کو اپنے بڑے بھائی صاحب سے ایک سال پہلے وفات پائی (لطائف گل شاہی قلمی) مملوکہ شرافت نوشاہی،

[3] لطائف گل شاہی قلمی، مصنفہ سید گل محمد نوشاہی متوفی ۱۱۷۰ھ، مملوکہ شرافت نوشاہی،

نوٹ: حضرت نوشہ صاحب کی تاریخ وفات صاحب خزینۃ الاصفیاء نے ۱۱۰۳ھ لکھی ہے، طرفہ یہ کہ مفتی صاحب حوالہ تذکرہ نوشاہی کا دیتے ہیں، حالانکہ اس میں بتصریح لفظ "خاتم پاک" سے تاریخ برآمد کی گئی ہے جس سے ۱۰۶۴ اعداد ظاہر ہوتے ہیں، ایسے ہی سید حافظ محمد برخوردار اور سید محمد ہاشم کی تاریخیں بھی جو خزینۃ الاصفیاء میں ہیں، وہ صحیح نہیں

[4] کنز الرحمت فارسی منظوم، مطبوعہ ۱۳۳۳ھ، عبرت نامہ فارسی جلد دوم، مصنفہ علی الدین لاہوری۔ چار باغ پنجاب فارسی مصنفہ گنیش داس بڈہیرہ قانون گوئے گجرات،

ی ۱۹۶۸ء میں "کلام شاہ مراد" مصنفہ شاہ مراد خانپوری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"مرتبین نے گفتنی میں یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ شاہ مراد اردو غزل کے صرف موسس ہی نہیں، بلکہ ریختہ کے پہلے مکمل شاعر ہیں، مجھے ڈر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ تحقیق کے ترازو میں آکر مات کھا جائے گا، کیونکہ کئی جانے پہچانے نام مثلاً حضرت نوشہ گنج بخش (۹۵۹ھ - ۱۰۶۴ھ)، شیخ خوب محمد چشتی (۹۸۶ھ[1] - ۱۰۰۰ھ) اور احمد دکنی (۹۸۸ھ - ۱۰۲۰ھ) جو شاہ مراد پر زمانی فوقیت رکھتے ہیں، کسی محقق کے ہاتھوں غزل کی تاسیس کے بھی دعویدار ہو سکتے۔"

اس کے جواب میں انور بیگ اعوان صاحب روزنامہ نوائے وقت لاہور، جمعرات ۶ر جون ۱۹۶۸ء میں بعنوان "صوفی شاعر شاہ مراد اردو غزل کے موسس ہیں" لکھتے ہیں،

"سیارہ ڈائجسٹ بابت مئی ۱۹۶۸ء کے شمارے میں جناب صدیق سالک نے کلام شاہ مراد پر تبصرہ کے دوران اس دعویٰ پر اپنے ڈر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ [یہ دعویٰ تحقیق کے ترازو میں آکر مات کھا جائے گا، کیونکہ کئی جانے پہچانے نام مثلاً حضرت نوشہ گنج بخش (۹۵۹ھ - ۱۰۶۴ھ)، شیخ خوب محمد چشتی ۹۸۶ھ - ۱۰۰۰ھ) اور احمد دکنی (۹۸۸ھ - ۱۰۲۸ھ[2]) جو شاہ مراد پر فوقیت زمانی رکھتے ہیں، کسی محقق کے ہاتھوں غزل کی تاسیس کے بھی دعویدار ہو سکتے ہیں] اس ضمن میں گزارش ہے کہ دنیائے تحقیق میں کوئی بات بھی حرف آخر کی حیثیت کی مالک نہیں ہوا کرتی ،

---

[1] یہ تاریخ قابل نظر ہے، کیونکہ اس حساب سے شیخ خوب محمد چشتی کی عمر صرف چودہ[۱۴] سال ہوتی ہے

[2] جناب محمد صدیق سالک نے احمد دکنی کی وفات ۱۰۲۰ھ لکھی ہے، مگر انور بیگ صاحب نے اسی کا حوالہ دینے میں اس کو ۱۰۲۸ھ بنا دیا ہے۔ شرافت نوشاہی

انسانی تحقیق کی عرق ریزی اور علم کی دیدہ وری نت نئے گوشے بے نقاب کرتی رہتی ہے، لیکن تادم تحریر جو مواد ہمارے پیش نظر ہے، اس کی بنا پر اس دعویٰ کو جھٹلانا سردست کافی مشکل نظر آرہا ہے، جناب صدیق سالک نے حضرت نوشہ گنج بخش کے حالات زندگی پتہ نہیں کہاں پڑھے ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے محولہ بالا تبصرہ میں کسی ماخذ کا حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا، میرے سامنے اس وقت تذکرۃ الاولیاء[1] سوم جلد کے صفحہ ۷۰-۷۱ پر حضرت نوشہ گنج بخش کے حالات درج ہیں، ان کی رو سے آپ کا شاعر ہونا ثابت نہیں ہوتا، نیز اسی کتاب میں تذکرہ نوشاہی کے حوالے سے آپ کی تاریخ وفات بعہد عالمگیری ۱۱۰۴ھ دی ہوئی ہے، نہ ۱۰۲۴ھ[2]، جیسا کہ صدیق سالک نے لکھا ہے، بادشاہ مراد کی تاریخ وفات بحوالہ تحفہ قادریہ[3] ۱۱۱۴ھ ہے، بنا بریں ہر دو بزرگ قریباً ہمعصر ہیں۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ انور بیگ صاحب کے دعویٰ کا سارا دارومدار

---

[1] اس کتاب کا صحیح نام تذکرہ اولیائے ہند ہے، جو مرزا احمد اختر کی تالیف ہے، دوسرے ایڈیشن میں اس کا نام تذکرہ اولیائے ہند و پاک لکھا گیا ہے، انور بیگ صاحب نے اسی کو تذکرۃ الاولیا لکھ دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے تذکرۃ الاولیا نام کی کتاب شیخ فریدالدین عطار متوفی ۶۲۶ھ کی تصنیف ہے، وہ تین جلدیں نہیں، صرف ایک ہی جلد ہے، اور اولیائے متقدمین کے حالات پر مشتمل ہے، اس میں حضرت نوشہ صاحب کے حالات کہاں۔ [2] جناب صدیق سالک نے ۱۰۶۴ھ لکھا ہے، مگر انور بیگ صاحب نے ان ہی کا حوالہ دے کر اس کو ۱۰۲۴ھ بنا دیا ہے۔ [3] انور بیگ صاحب نے تحفہ قادریہ کے متعلق یہ نہیں لکھا کہ کس کی تصنیف ہے، ایک مشہور کتاب تحفہ قادریہ موجود ہے، جو شاہ ابوالمعالی لاہوری متوفی ۱۰۲۴ھ کی تصنیف ہے اور وہ شاہ مراد سے سو سال پہلے کی ہے۔ شرافت نوشاہی

تذکرہ اولیائے ہند جلد سوم پر ہے ، اور خاندان نوشاہی کے بنیادی تذکروں سے وہ واقف ہیں ، اگر ان کو ان پر عبور ہوتا ، تو وہ حضرت نوشہ گنج بخش کی شاعری سے انکار نہ کرتے ، آپ کا کلام خاندانی مخطوطات میں بکثرت پایا جاتا ہے ، جو اس زمانہ کے تمام اصناف سخن غزل ، چھپیہ ، چوپئی ، ماجھ ، جھولنا ، سویا وغیرہ پر مشتمل ہے ، آپ کے منظوم رسالوں میں سے حق پرکاس ، حکم پرکاس ، ڈنکا توحید ، سادہ کہانی ، مرشد بانی ، مرشد تپا مرشد پروان ، وحدت پرکاس ، وحدت نامہ ، یادنامہ وغیرہ بیسیوں رسائل اردو زبان میں موجود ہیں ،

جناب صدیق سالک کا یہ خیال کہ " حضرت نوشہ گنج بخش ....جو شاہ مراد پر زمانی فوقیت رکھتے ہیں ، کسی محقق کے ہاتھوں غزل کی تاسیس کے بھی دعویدار ہو سکتے ہیں " بالکل صحیح و درست ہے ، یہاں حضرت نوشہ گنج بخش کے کلام سے دو غزلیں لکھی جاتی ہیں :-

(۱)

ایک طالب مرشد بھی آیا ۔۔۔ وہ طالب جس اور نہ پایا
ہاتھ باندھ یوں طالب بولا ۔۔۔ بنتی کردوں سچے بادشاہا
صفت نام کی مہر کر بولو ۔۔۔ تسبیح ذکر کردوں ہرگاہا
جب طالب مرشد سوں پوچھا ۔۔۔ تب مرشد یوں نام صلاہا
للہ الاسماء الحسنیٰ ۔۔۔ دخل الجنۃ من احصاہا
نام کی چاہ رہے من اندر ۔۔۔ اور چاہ پہ تیگا باہا

نام لیے سکھ پائے نوشہ
سوئی پاک مرشد سوں چاہا

(۲)

ہم سب تیرے بھکیاری جتا سب تیرے بھکیاری ۔۔۔ تجھ داتے سوں نت نت مانگیں لیویں جو نر ناری

آدم کیا خلیفہ اپنا شسنت سجدے سوں ڈاری — سلیمان کوں دی بادشاہی دین و دنیا ساری
موسیٰ کوں رن جیت دلایا دشمن کی کل گاری — یوسف کوں کھوہ سوں ڈھا بخشی تس ہزاری
یونس کوں مچھلی سوں کاڈھا رچھیا کینی بھاری — ابراہیم چھے سوں کاڈھا آگ کئی پھلباری
احمد کی فتح دی حضرت کوں اپنی بر دسنبھاری — ہیر پیغمبر سبھے نوازے کرپا کینی بھاری

سن یہ عرض غریب نوازا اب نوشہ کی باری

یہ دونوں غزلیں کتاب الحقایق والانوار کے قلمی نسخے سے نقل کی گئی ہیں[1]،

اس کے علاوہ انور بیگ صاحب نے حضرت نوشہ گنج بخش کا سنہ وفات بحوالہ تذکرۃ الاولیا، (اگرچہ یہ نام صحیح نہیں) سنہ ۱۱۰۳ھ لکھ کر آپ کو حضرت شاہ مراد صاحب متوفی ۱۱۳۲ھ کا معاصر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ خاندان نوشاہی کے تمام تذکرے مثلاً لطائف گلشاہی، تذکرہ نوشاہی، تحائف قدسیہ، کنز الرحمت، حقائق نوریہ، روضۃ الزکیہ، ثمرات الافکار، وسائط العلوم، بیاض قادری، مناقبات نوشاہی، کتاب الفوائد وغیرہ حضرت نوشہ گنج بخش کی وفات ۱۰۶۴ھ میں لکھتے ہیں، اور یہ سب تذکرے میرے سامنے موجود ہیں، اور کنز الرحمت کے سوا سب مخطوطات کی صورت میں ہیں،

(۱) تذکرہ نوشاہی میں حضرت نوشہ صاحب کے سنہ وفات کے متعلق یہ شعر درج ہے:

ز تاریخ وصال او دلم در جستجو چوں شد
بگوش دل ندا آمد کہ "خاتم پاک" بر خوانش
۱۰۶۴ھ

[1] حضرت نوشہ گنج بخش کا کلام متفرق بیاضوں سے جمع کر کے راقم سطور نے کتاب الحقائق والانوار فی نور التوحید والاسرار" کے نام سے مرتب کیا ہے جس کے دو حصے ہیں، اردو کلام اور پنجابی کلام، یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے۔

(۲) کنز الرحمت میں ہے :-

چو شد رحلت آں شہ نامدار ز تاریخ شاں "فیضِ قدسی" شمار[۱]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوشہ گنج بخش کی وفات سے پورے پچاس سال بعد حضرت شاہ مراد صاحبؒ کی وفات ہوئی، اس لیے وہ حضرت نوشہ صاحبؒ کے پوتوں حضرت سید سعد اللہ صاحبؒ متوفی ۱۱۲۵ھ وغیرہ کے ہم عصر شمار کیے جا سکتے ہیں، اور انور بیگ صاحب کا ان کو حضرت نوشاہ عالیجاہ کا معاصر بتانا ہرگز صحیح نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ حضرت شاہ مراد صاحبؒ سے ایک صدی بھی پہلے سے پنجاب میں حضرت نوشہ گنج بخش اردو زبان میں غزل کہتے تھے، اس لیے آپ ہی کو پنجاب میں اردو غزل کا موسس قرار دینا صحیح ہے۔

---

[۱] حضرت نوشہ صاحبؒ کی وفات کے متعلق میں نے تحقیقی مضمون اپنی کتاب اذکار نوشاہیہ مطبوعہ استقلال پریس لاہور ۱۹۶۴ء کے صفحہ ۳۳ پر لکھا ہے، اور جن لوگوں نے خزینۃ الاصفیاء کی اتباع میں نوشاہی بزرگوں کی تاریخیں لکھنے میں غلطی کی ہے، ان کتابوں اور مورخوں کی فہرست صفحہ ۳۹ پر دے دی ہے۔ جن میں تذکرہ اولیائے ہند مصنفہ مرزا اختر بھی شامل ہے، جس کو انور بیگ صاحب سند میں پیش کرتے ہیں۔

(شرافت نوشاہی)

ادبیات

غزل

از جناب محوی صدیقی لکھنوی

باز آئے اب نمائشِ زخمِ جگر سے ہم
کیا کیا نہ منفعل ہوئے اس چشمِ تر سے ہم

بھولے کبھی نہ عظمتِ افسانۂ خلیل
کھیلا کیے ہیں شعلۂ و برق و شرر سے ہم

تیری طرح اسے بھی ہے اپنی خودی پہ ناز
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ خود نگر سے ہم

شاید ابھی ہوں منتظرِ وقت حوصلے
کیوں بدگماں ہوں طائرِ بے بال و پر سے ہم

دیکھا کہ سجدے بکھرے ہیں ہر نقشِ گام پر
گذرے تھے ایک روز تری رہگذر سے ہم

پہنچا دیا کہاں سے کہاں ایک نگاہ نے
کچھ کم نہیں ہیں آج کسی دیدہ ور سے ہم

لے آتی ہے یہ آپ کے گیسو کی خوشبوئیں
رکھتے ہیں ساز باز نسیمِ سحر سے ہم

مل جائے اب تو رخصتِ نظارۂ جمال
پیاسے بس اک نگاہ کے ہیں عمر بھر سے ہم

اب یہ ہجومِ ماہ وشاں ہے مزار پر
یا چھپتے پھرتے تھے نگہِ ہر بشر سے ہم

خوبانِ شہر ہنستے ہیں کیوں دیکھ دیکھ کر
آئے ہیں خاکِ پاکِ محبت نگر سے ہم

رگ رگ میں دوڑ جاتی ہے اک برقِ طور سی
اپنی نظر ملاتے ہیں جب اس نظر سے ہم

اس کارواں کو آنچ نہ آئے خدا کرے
رہبر سے راہرو ہیں خفا ہمسفر سے ہم

محوی خدا کی دین ہے یہ دولتِ سخن
محفل سجاتے ہیں ان ہی لعل و گہر سے ہم

غزل

جناب بسنت کمار بسنت

کبھی یک بیک تغافل کبھی التفاتِ پیہم
نہ سمجھ سکا زمانہ، تری طبع کا یہ عالم

ترے تابدارِ گیسو، ہے گھٹا فلک پہ جیسے
ہے عرق تری جبیں پر کہ ہے پنکھڑی پہ شبنم

مرے پاس رک نہ پائی کبھی تلخیٔ زمانہ
رہی عشرتِ مقدر مرے پیش پیش ہر دم

یہ نظامِ میکدہ ہے یہ ہے رسمِ بزمِ ساقی
کوئی مے نہ پھر پئے گا اٹھے میکدہ سے گر ہم

کبھی خوش تو اتنے خوش وہ نہیں ہم بھی ستم کا
کبھی ہیں خفا تو اتنے کہ ہے کائنات برہم

جو ہیں تیرے سرخ عارض وہ ہیں پنکھڑیاں کنول کی
وہ کرن ہے مہرِ نو کی، ہے جبیں پہ جو ترے خم

وہ شبیہِ حسن پیکر، مہ و گل کا ایک منظر
ہے خیال و خوابِ دلبر کہ فسوں کوئی مجسم

یہی تلخیٔ زمانہ، ہے خوشی کا اک فسانہ
یہ ظلمتِ شبانہ ہے پیامِ صبحِ عالم

کبھی اک فسونِ عبرت کبھی اک طلسمِ قدرت
یہی کارہائے فطرت، یہی ہیں رموزِ عالم

وہ ملیں تو کیفِ عشرت، نہ ملیں تو رنجِ فرقت
کبھی ہے سکونِ جنت، کبھی ہے غمِ جہنم

مرا کیا بنا سکیں گے یہ مصائبِ زمانہ
مجھے کیا ڈرا سکیں گے کبھی حادثاتِ عالم

مرے سامنے خزاں کا نہ بسنتؔ بس چلا کچھ
گل و خار مسکرائے جو چمن میں آ گئے ہم

باب التقریظ والانتقاد

مجموعۂ قوانین اسلام } مرتبہ جناب تنزیل الرحمن صاحب ایڈوکیٹ ضخامت حصہ اول و دوم بالترتیب ۳۴۰ - ۸۲۱ صفحات، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، قیمت مجلد ۲۰؍ اور ۳۵؍ - پتہ:- ادارۂ تحقیقات اسلامی، طارق آباد راولپنڈی، پاکستان۔

یہ دونوں کتابیں عرصہ ہوا ریویو کے لیے آئی تھیں، خیال تھا کسی صاحب نظر فقیہ سے ان پر ریویو کرایا جائے، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، اس لیے ریویو میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی، جس کے لیے ہم فاضل مؤلف سے معذرت خواہ ہیں،

انسانی تہذیب و معاشرہ میں ترقی کے ساتھ نئے نئے مسائل کا پیدا ہونا قدرتی ہے، یہ ہمارے فقہاء و مجتہدین کا بڑا کارنامہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں ان کا حل نکالتے رہے، اور اپنے زمانہ کے تمام معاملات اور زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق اسلامی قوانین کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع و مرتب کر گئے، جس کی مثال اس دور کی قوموں میں نہیں مل سکتی، اور آج بھی بہت سے مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کیا سکتی ہے، لیکن جب سے مسلمانوں میں تفقہ و اجتہاد کا دروازہ بند ہوا، نئے مسائل کے حل کا دروازہ بھی بند ہو گیا اور ہمارے فقہاء پرانے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئے۔

اس دور کی ترقی کے اعتبار سے زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق اتنے کثیر اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا حل اسلامی معاشرہ کی بقا کے لیے ضروری ہے، ورنہ ہماری نئی نسلیں اس سے دور ہوتی چلی جائیں گی۔ اس لیے فقہ کی جدید تدوین کا مسئلہ عرصہ سے اسلامی مفکرین کی نگاہ میں ہے۔ اور اسلامی حکومتوں نے اسی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے پرسنل لا کے مجموعے بھی مرتب کیے جن کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے، فقہ کی تدوین جدید کو تین قسم کے مسائل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) ان مسائل کا حل جو بالکل نئے اور اسلامی قوانین سے متصادم ہیں،

(۲) وہ مسائل جن کا حل فقہی مذاہب میں موجود ہے، لیکن تقلید شخصی نے ان کے حل میں دشواری پیدا کر دی ہے،

(۳) جدید طرز پر فقہی مسائل کی تدوین،

پہلے کام میں بڑی دشواریاں ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے، اسکو اسلامی حکومتیں وسیع النظر فقہاء اور جدید ماہرین قانون کی مدد سے انجام دے سکتی ہیں لیکن دشواری یہ ہے کہ سعودی عرب کے علاوہ تمام اسلامی حکومتوں کا نقطۂ نظر مغربی ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ جدید مسائل اور اسلامی قوانین میں ممکن حد تک مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کے بجائے مغربی قوانین کو اختیار کر لیتی ہیں۔ اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے ان مسائل کا حل آجتک نہ ہو سکا،

دوسرے دونوں کام نسبتاً آسان ہیں۔ اس لیے ٹرکی، مصر اور شام وغیرہ کی حکومتوں نے مسلمانوں کے پرسنل لا کے نئے مجموعے مرتب کئے، مگر اسکا نقطۂ نظر بھی عام طور سے مغربی ہے،

اب پاکستان کے ادارۂ تحقیقات اسلامی نے اس اہم کام کو شروع کیا ہے۔ اور دس جلدوں میں اسلامی قوانین کو جدید طرز پر مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کی تین جلدیں اب تک

شائع ہو چکی ہیں، پہلی اور دوسری جلدیں ہمارے پیش نظر ہیں، پہلی جلد قانونِ ازدواج پر ہے اور دوسری طلاق پر،

فاضل مرتب پرانے، تجربہ کار وکیل ہیں، عربی سے بھی واقف ہیں، اور اسلامی قانون کے ماخذوں پر انکی پوری نظر ہے، اس لیے انھوں نے ازدواج اور طلاق کے جملہ مسائل اور انکے متعلقات پر قرآن مجید، حدیث و سنت، آثار صحابہ اور ائمہ و مجتہدین کے اقوال کی روشنی میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، اور ان کو مختلف ابواب میں دفعہ وار مرتب کیا ہے، ان کا نقطۂ نظر حنفی ہے، لگر ہر مسئلہ کے متعلق دوسرے ائمہ اور شیعوں کا مسلک بھی بیان کر دیا ہے، بعض مسائل جنہیں دوسرے ائمہ کا مسلک قوی نظر آیا ہے بحث و تحقیق کے بعد اس کو اختیار کیا ہے، مگر کسی مسئلہ میں اسلامی ماخذوں سے باہر قدم نہیں نکالا ہے، البتہ بعض مسائل میں جن کی سند ان ماخذوں میں نہیں ہے اور وہ فقہاء کی رائے اور ان کا اجتہاد ہے، دلیل کے ساتھ اختلاف کیا ہے، مگر اسکی مثالیں بہت کم ہیں، اسی کے ساتھ پاکستان کے رائج الوقت قانون میں جو چیزیں اسلامی قوانین کے خلاف ہیں ان کی پوری مخالفت اور ان میں ترمیم کی تجویز پیش کی ہے، درحقیقت یہ کام علماء کے کرنے کا تھا جو ایک وکیل کے ہاتھوں انجام پایا،

اتنے گوناگوں مسائل میں ہر مسئلہ میں مولف سے اتفاق ضروری نہیں ہے، مگر عام طور سے ان کا نقطۂ نظر اسلامی ہے، اور مجموعی حیثیت سے مجموعۂ قوانین اسلام کی ترتیب ان کا بڑا کارنامہ ہے، اور پاکستان میں فتاویٰ عالمگیری کے بعد اسلامی قوانین کی تدوین کی یہ دوسری کامیاب کوشش ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، یہ مجموعہ وکلاء، مفتیوں اور فقہ کے اساتذہ اور طلبہ سب کے مطالعہ کے لائق ہے۔

مطبوعات جدیدہ

رسالہ اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان } از مولانا سید برکات احمد صاحب ترجمہ محمود احمد صاحب برکاتی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۸، قیمت ؎، پتہ اقبال اکاڈمی، کراچی

مولانا حکیم سید برکات احمد (م ۱۳۴۷ھ) معقولات کے مشہور امام مولانا عبدالحق خیرآبادی کے ممتاز شاگرد اور خود بھی اس فن کے اساطین میں تھے، درس و تدریس کے ساتھ ان کی تصنیفی یادگاریں بھی ہیں، جن میں یہ عربی رسالہ بھی ہے، یہ پہلے ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا تھا، اور اب ان کے لائق نبیرہ محمود احمد برکاتی صاحب نے اس کا ترجمہ شائع کیا ہے، یہ رسالہ سات فصلوں میں منقسم اور زمان کی ماہیت، حقیقت، موہومیت، عدم ازلیت و ابدیت، حرکت و زمان میں عدم تلازم وغیرہ اہم فلسفیانہ و طبیعاتی مباحث پر مشتمل ہے، مترجم نے شروع میں اس موضوع کے متعلق تین مفید مضامین اور بھی شامل کر دیے ہیں، مصنف کو معقولات کی طرح کلام و تصوف سے بھی خاص ذوق تھا، اس لیے انھوں نے فلاسفہ و مشائیہ اور مسلمان حکماء میں بو علی سینا، نصیر الدین طوسی، میر باقر داماد، ملا صدرالدین شیرازی، ملا کمال الدین سہالوی اور امام رازی وغیرہ کے افکار کا ابطال کر کے متکلمین اور صوفیا کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے، ترجمہ اگرچہ سلیس ہے، لیکن رسالہ خالص علمی و فنی ہونے کی وجہ سے دقیق و غامض مباحث پر مشتمل ہے، اسلیے قدیم منطق و فلسفہ کے واقف کار ہی اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں،

معروف و منکر۔ از مولانا سید جلال الدین صاحب عمری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۴۰۱، مجلد قیمت عہ، پتہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ۶

امر بالمعروف و نہی عن المنکر امت کے مہمات فرائض میں ہے، زیر نظر کتاب میں اس کے مختلف گوشوں مثلاً اس کا مفہوم، اس کی اہمیت، وجوب، وسعت، جامعیت، اس کے شرائط، وسائل و آداب، آمر و ناہی کے اوصاف و خصوصیات، تجدید دین، جہاد فی سبیل اللہ، اسلامی ریاست اور دعوت الی الخیر کی مفصل وضاحت کی گئی ہے، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر امت کے فرائض منصبی میں ہے، اور اس کا دائرہ محض مسلمانوں تک محدود نہیں، بلکہ تمام بنی آدم کو معروف کا حکم اور منکر سے منع کیا جائے گا، اور اس کے اندر پورا دین، اس کے تمام ماموراًت اور منکرات و منہیات شامل ہیں، لیکن امر بالمعروف اور تواصی بالحق کی اصطلاحات گڈ مڈ کر دیگئی ہیں، اس لیے اول الذکر کو فرض کفایہ ماننے کے باوجود فرض عین بھی قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ تواصی بالحق ضرور ہر مسلمان کا فرض ہے، لیکن امر بالمعروف اصلاً امرائے امت کی ذمہ داری ہے، آیت ولتکن منکم امۃ الخ کے علاوہ اس کی تائید اس مشہور آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں مسلمانوں کو اللہ و رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس نوع کے اختلافی مسائل پر اتنی طویل بحث کی گئی ہے کہ اصل مسئلہ الجھ گیا ہے، اور مصنف کے نقطۂ نظر کا پتہ چلانا دشوار ہو گیا ہے، کہیں کہیں کسی خاص مزعومہ کو ثابت کرنے کے لیے تکلف سے بھی کام لیا گیا ہے، اس سے بیجا طوالت کے علاوہ مناظرانہ انداز بھی پیدا ہو گیا ہے، بعض آیتوں کی تعبیر میں بھی سہو ہوا ہے، تاہم کتاب محنت اور احتیاط سے لکھی گئی ہے، مصنف نے ہر بحث میں آیات و احادیث سے استدلال اور انکی وضاحت مفسرین، محدثین اور ائمۂ سلف کے

اقوال سے کی ہے۔

اقبال کے ابتدائی افکار - مرتبہ جناب ڈاکٹر عبد الحق شعبۂ اردو دہلی

دہلی یونیورسٹی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۹۴، مجلد

مع گرد پوش، قیمت عـلـہ پتہ: عبدالحق شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر اقبال مرحوم پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن اس نئی کتاب میں غالباً پہلی مرتبہ ان کے ابتدائی دور (انگلستان جانے سے پہلے یعنی ۱۹۰۵ء) کے منظومات اور تحریروں کا تجزیہ کرکے ان کے اس وقت کے افکار و خیالات کی وضاحت کی گئی ہے، یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے اور دوسرے باب میں فکر اقبال کے تدریجی ارتقاء کی سرگذشت، اس کی پختگی کے مراحل، ڈاکٹر صاحب کے ابتدائی ماحول تعلیم اور ان پر کیے جانے والے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، تیسرے باب میں ان افکار پر بحث کی گئی ہے جو ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے شروع دور میں ملتے ہیں اور جن سے ان کی بیچینی، موجودہ حالت پر بے اطمینانی اور ان مقاصد کی تلاش و جستجو ظاہر ہوتی ہے، جو بعد میں ان کے فکر کا خاص محور بنے، چوتھے باب میں عرفانِ نفس کا ذکر ہے، جس نے آگے چل کر فلسفۂ خودی کی شکل اختیار کی، آخری باب میں ان کے ابتدائی دور کے ملی و وطنی تصورات کا جائزہ لینے کے بعد یہ دکھایا گیا ہے کہ ان میں بعد میں کیا تبدیلیاں ہوئیں، لیکن اس باب کی تمہید اتنی طویل ہوگئی ہو کہ وہ اقبال کے بجائے سرسید اور حالی کے قومی و وطنی تصورات کا مرقع معلوم ہوتی ہے، لائق مصنف نے اقبال کے سوانح نگاروں اور نقادوں پر جا بجا مناسب انداز میں تنقیدیں بھی کی ہیں لیکن انکی بعض رائیں محل نظر ہیں، مثلاً مولانا عبد السلام ندوی اور خلیفہ عبد الحکیم (مرحومین) کی رایوں سے اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب

کی نثری تصنیفات کی تعداد زیادہ بتائی ہے، حالانکہ ابتدائی دور کی تحریریں اور خطوط کے جو مجموعے اب شائع ہوئے ہیں وہ ان لوگوں کے پیش نظر نہ تھے، اور نہ درحقیقت انکی حیثیت مستقل تصنیفات کی ہے، صفحہ ۴۲ پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں پر ان کا اعتراض غور و فکر کی کمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، مگر کتاب بڑے سلیقہ اور محنت سے لکھی گئی ہے، اور ہر باب اقبالیات کے متعلق دلچسپ اور مفید مباحث پر مشتمل ہے، مصنف ابھی نوجوان ہیں لیکن تحریر پختہ، متوازن اور شائستہ اور انداز بیان سلیس شگفتہ اور رواں ہے۔

اسلام کا نظام تقسیم دولت ۔ مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۷۰، قیمت عہ پیسے، ناشر مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴۔ ہندوستان میں: مکتبہ تالیفاتِ اشرفیہ، تھانہ بھون ضلع مظفرنگر۔

یہ رسالہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک مقالہ ہے، جو انھوں نے ۱۹۶۸ء میں راولپنڈی کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے لیے لکھا تھا، اور اسی زمانہ میں رسالوں اور اخباروں میں شائع اور بہت مقبول ہوا تھا، اب افادۂ عام کے خیال سے یہ کتابی صورت میں کیا گیا ہے، اس میں اسلام کے نظامِ تقسیم دولت کی شکلوں کا ذکر ہے، اور اس ضمن میں اسلام میں معاش کی نوعیت، تقسیم دولت کے اصول و مقاصد، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے معاشی تصورات اور ان کے تقسیم دولت کے طریقوں کی وضاحت اور ان نظریات کا اسلامی نظریہ سے فرق و اختلاف اور اسلامی نظریہ کی خوبیاں بھی بیان کی گئی ہیں، مولانا کی دوسری تحریروں کی طرح یہ رسالہ بھی نہایت پرمغز، جامع، مدلل اور عام فہم ہے، موجودہ زمانہ میں معاشی مسئلہ کی اہمیت کی بنا پر یہ رسالہ ہر شخص کے مطالعہ اور انگریزی میں ترجمہ کیے جانے کے لائق ہے۔

عکس شخص - از جناب عنوان چشتی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۸۴ مع گرد پوش، قیمت صہ پتے: مکتبہ عابض ۳۸۳ مادی پور دہلی- ۶ء، مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

یہ جناب عنوان چشتی لکچرار اردو جامعہ ملیہ دہلی کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں دس اصحاب شعر وادب کا سراپا اور ان کی شخصیت کے نمایاں خد وخال اجاگر کئے گئے ہیں، اور ان کے ادبی وفنی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے، دو مضامین کے علاوہ جن میں پروفیسر مجیب کی ڈرامہ نگاری اور کوثر چاند پوری کی کتاب "جہان غالب" پر نقد و تبصرہ ہے، باقی مضامین میں غلام ربانی تاباں، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ابر احسن گنوری، شفا گوالیاری، مکیش اکبرآبادی، تسکین قریشی، انور صابری اور نریش کمار شاد کی شاعری کی خصوصیات پر دلچسپ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے، اس حیثیت سے مصنف کی یہ کوشش قابل ستایش ہے کہ انھوں نے بعض ایسے شعراء کا انتخاب کیا ہے جنکو عموماً نظر انداز کر دیا گیا ہے، یا جنکی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے، بعض مضامین میں عقیدت کا رنگ غالب ہو گیا ہے، اور سراپا بیان کرنے میں غیر ضروری تشبیہ واستعارہ سے کام لیا گیا ہے، تاہم یہ مجموعہ دلچسپ اور مصنف کے خیالات متوازن اور تبصرے ناقدانہ ہیں۔

کاروان مدینہ - از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۳۰ قیمت سے ر پتہ: مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

یہ مجموعہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دس مضامین اور خطبوں پر مشتمل ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت اور آپ کے پیغام پر عمل کی نہایت دردمندانہ اور پرسوز انداز میں دعوت دیگئی ہے، اس سلسلہ میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں اور نبوت کے عظیم الشان کارناموں، عطیات واحسانات اور اس کے عالمگیر نتائج واثرات کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اکثر مضامین مصنف کی عربی تقریروں کا اردو ترجمہ ہیں جو عرب نیشنلزم کی تحریک کے جواب میں کی گئی ہیں، ان میں دنیا کی موجودہ بے اطمینانی، مادیت اور خدا فراموشی کی لائی ہوئی تباہی اور ہلاکت کا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات وتعلیمات کو تجویز کیا گیا ہے، آخر کے دو مضامین میں اردو وفارسی شعراء کے نعتیہ کلام کی مصنف نے اپنے شگفتہ اور موثر انداز میں تشریح کی ہے۔

ض

مصنفاتِ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: ؏ہ

اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) " ؏ہ

اسوۂ صحابیات: " ؏

تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: ؏

حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: ؏

حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: ؏

شعر الہند (حصہ اول) " ؏

شعر الہند (حصہ دوم) " ؏

۹- انقلابِ الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کی ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: ؏

۱۰- سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیر طبع)

۱۱- امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت ؏

۱۲- ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳- اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل یعنی فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اُردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ؏

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی تاریخی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۲۴۶ قیمت: ؏ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اُن کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دینِ اسلام ہی نہیں، بلکہ اُس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور اُن کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخِ اسلام میں اُن کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق، اور اُن کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، اُن کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۳۳۰ صفحے، قیمت :- للعہ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

دسمبر ۱۹۶۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

مجلسِ ادارت

جلد ۱۰۴ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۹ء عدد ۶

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

شذرات

پاکستان کے بعض غیر ذمہ دار ناشروں نے دارالمصنفین کی بہت سی مطبوعات چھاپ لی ہیں، جس سے اُن کو کچھ ذاتی فوائد تو ضرور حاصل ہو رہے ہوں گے لیکن اس علمی ادارہ کو بہت مالی نقصان پہنچ رہا ہے، مگر خوشی ہے کہ پاکستان میں اُس کے بہت سے مخلص قدردانوں نے اُس کی مطبوعات کے دست برد کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے، ان میں سب سے نمایاں نام جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کا ہے، جن کو پاکستان میں اپنی اعلیٰ علمی قابلیت کے ساتھ اپنی باوقار اور دلنواز شخصیت کی وجہ سے بڑی عزت، اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے، انھوں نے پاکستان کے اہم روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات میں دارالمصنفین کے ساتھ اس بدسلوکی کی طرف وہاں کے لوگوں کی توجہ دلائی، اُن کی ہم نوائی جناب ممتاز حسن صاحب سابق سکریٹری محکمۂ خزانہ حکومت پاکستان، جناب جمیل الدین عالی صاحب معتمد انجمن ترقی اردو پاکستان و رائٹرز گلڈ، جناب ابن انشا ڈائرکٹر نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، جناب حامد علی خاں صاحب ہوس مطبوعات فرینکلن اور جنگ، امروز، نوائے وقت، حریت، مشرق اور کتاب کے اڈیٹروں نے کی، جناب فضل اقبال صاحب (سابق ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان نئی دہلی) نے بھی دارالمصنفین کے ساتھ اس بے انصافی کی طرف اپنی حکومت کو توجہ دلائی،

اس پرزور احتجاج کے بعد حکومت پاکستان کی طرف سے ایک آرڈیننس بھی جاری ہوا ہے، جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ پاکستان کا کوئی ناشر حکومت کی اجازت کے بغیر کسی غیر ملکی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں کر سکتا، اس سے وقتی طور پر بعض ناشروں کی غلط قسم کی سرگرمیوں کی روک تھام تو ضرور ہوگئی ہے، پھر بھی ضرورت تھی کہ

دار المصنفین کی مطبوعات کی مستقل نگہداشت کے لئے کوئی موثر کارروائی کی جائے، یہ خاکسار گذشتہ دو مہینے پاکستان میں رہا تو اس سلسلہ میں جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کے حسن وساطت اور اخلاص سے بہت سی مفید باتیں انجام پاگئیں، جن کے لئے دار المصنفین ان کا مزید شکر گذار ہے،

سید حسام الدین راشدی صاحب نے اپنے دولت کدہ پر ایک پر تکلف ڈنر میں کراچی کے ممتاز اہل علم اور دوسرے اکابر کو مدعو کیا، جن میں سے کچھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں، جناب ممتاز حسن صاحب سابق سکریٹری محکمۂ خزانہ حکومت پاکستان جناب جمیل الدین عالی صاحب معتمد رائٹرز گلڈ، انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر معین الحق سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، جناب شان الحق حقی صاحب ڈائرکٹر اردو ترقی بورڈ، جناب الطاف بریلوی صاحب سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ابن انشا صاحب ڈائرکٹر نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، حکیم احمد سعید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ، ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی بانی انجمن الفلاح، جناب ابن الحسن صاحب چیف پبلک رلیشنز افیسر، جناب مشفق خواجہ صاحب انجمن ترقی اردو، جناب یٰسین خاں صاحب ڈائرکٹر کالی پارٹ، پروفیسر ریاض الاسلام شعبۂ تاریخ کراچی یونیورسٹی، جناب ایوب قادری صاحب لکچرر اردو کالج، جناب اعجاز الحق قدوسی صاحب مصنف صوفیائے سندھ و پنجاب و جناب رازق الخیری صاحب ایڈیٹر عصمت، ان کے علاوہ اخبارات کے کچھ نمایندے اور ناشرین کتب بھی تھے، جناب سید حسام الدین صاحب نے دار المصنفین کی خدمات پر ایک پر مغز تقریر کی، ان کے بعد خاکسار نے حاضرین کی توجہ دار المصنفین کی ان مشکلات کی طرف دلائی جو پاکستان کے بعض ادبی تاجروں کے اس کی مطبوعات کے چھاپ لینے کے بعد پیدا ہو گئی ہیں، تمام حاضرین نے اس ادارہ سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا، اور اس کی مطبوعات کی نگہداشت کی تجویزیں پیش کیں، مباحثہ میں جناب ممتاز حسن، جمیل الدین عالی صاحب، ابن انشا اور الطاف حسین بریلوی صاحبان نے خاص طور پر حصہ لیا،

ایک دوسری نشست میں یہ طے پایا کہ دارالمصنفین سے باضابطہ اختیارات لیکر ایسے ناشرین کے خلاف آئندہ قانونی کارروائی کی جائے، جو اس کی مطبوعات چھاپ کر اس کو نقصان پہنچاتے ہیں، راقم نے دارالمصنفین کی طرف سے ایسے اختیارات جناب ابن الحسن صاحب کو تفویض کئے ہیں، جو جناب ظہور الحسن صاحب سابق رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کے صاحبزادے ہیں، اُن کو دارالمصنفین کی علمی سرگرمیوں سے بڑی دلچسپی ہے، امید ہے کہ اُن کی توجہ سے دارالمصنفین کی مطبوعات کی دست برد رک جائے گی اس کی ساری علمی خدمات زیادہ تر اس کی مطبوعات کی آمدنی سے انجام پاتی ہیں اگر پاکستان کے ناشرین اسی طرح اس کی کتابیں چھاپ کر اس کو نقصان پہونچاتے رہے تو علوم و فنون کی خدمت کرنے والا یہ پرانا ادارہ موت کے منھ میں آجائے گا،

معارف کے ناظرین کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ پاکستان کے کچھ ممتاز اہل علم نے شبلی وسلیمان یادگار سوسائٹی قائم کی ہے، جس کا مقصد مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیقی اور علمی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے، اس کے صدر جناب ممتاز حسن، سکریٹری جناب ابن الحسن، خازن جناب جمیل الدین عالی، اور ارکین سید حسام الدین راشدی، مولانا عبد الوہاب جمال الدین، حمید احمد، حکیم سعید احمد، حبیب احمد صدیقی، اور ظہور الحسن صاحبان ہیں، ہم اس سوسائٹی کی تاسیس کا خیر مقدم کرتے ہیں، ہندوستان و پاکستان کے سیاسی تعلقات اس وقت خوشگوار نہیں ہیں لیکن آئندہ جب خوشگوار رہیں گے اور رہنے چاہئیں تو پھر ہم ثقافتی طور پر اس سوسائٹی سے امید رکھیں گے کہ اس کے ذریعہ سے شبلی وسلیمان کا جو ادارہ ہندستان میں قائم ہے اس کی مطبوعات کے حقوق کی نگہبانی پاکستان میں ہوتی رہے، اور پاکستان کے خود غرض ناشرین اُن کو چھاپ کر اس ادارہ کو مالی پریشانیوں میں مبتلا نہ کریں، یہ دارالمصنفین کے ساتھ شبلی وسلیمان کی بھی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ پاکستان کے سفر میں بہت سے ارباب علم سے ملنے کا اتفاق ہوا، اس کا ذکر انشاء اللہ آئندہ ایک مضمون میں ہوگا۔

مقالات

معالم السنن امام خطابی

از

مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

حدیثوں کی جمع و تدوین کی طرح اُن کی فہم و معرفت کے لئے شرح و توجیہ بھی حدیث کی اہم اور ضروری خدمت ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:-

وامر ثانی یعنی احتیاط در فہم معانی حدیث (عجالۂ نافعہ) — اور دوسری چیز یعنی حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں احتیاط ضروری ہے،

اس لئے محدثین کی ایک جماعت نے اس کی جانب بھی توجہ کی، چنانچہ امام ابو سلیمان بستی خطابی کا شمار جو چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر محدثین میں ہیں، بلند پایہ اور مستند شارحین حدیث میں ہوتا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں:-

"حدیثوں کی شرح و توجیہ میں رطب و یابس ہر قسم کی باتیں تحریر کی گئی ہیں، اس لئے ان علماء سے واقفیت ضروری ہے، جو اس باب میں قابلِ اعتماد ہیں، تاکہ اُن کی تصنیفات سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے، علمائے شافعیہ میں امام نووی، علامہ بغوی اور ابو سلیمان خطابی نہایت قابلِ اعتماد ہیں، اُن کے اقوال محکم اور بحثیں بڑی پر مغز ہوتی ہیں"

امام خطابی کی متعدد تصنیفات یادگار ہیں، ان میں اعلام السنن اور معالم السنن جو شروح حدیث میں ہیں، زیادہ مشہور ہیں، پہلی کتاب میں صحیح بخاری کی، اور دوسری میں صحاح ستہ کی اہم ترین کتاب سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی شرح اور ان کے مشکلات حل کئے گئے ہیں، اعلام السنن غالباً نایاب ہے لیکن معالم السنن کی چار جلدیں اعلام النبلاء کے فاضل مصنف محمد راغب طباخ نے چند مخطوطہ نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کرکے مطبعہ علمیہ حلب سے ۱۳۵۱ھ و ۱۳۵۲ھ میں شائع کی ہیں، اس کے شروع میں انھوں نے امام ابوداؤد اور امام خطابی کے حالات و کمالات بھی تحریر کئے ہیں، یہ چاروں جلدیں تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں :-

امام خطابی کی تصنیفات میں معالم السنن سب سے زیادہ اہم اور مشہور ہے، اس مضمون میں اس کے خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے،

اکثر علمائے فن کے نزدیک امام ابوداؤد کو جملہ محدثین میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے سنن والاحکام کی حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا، ان سے پہلے مسانید اور جوامع وغیرہ مرتب کرنے کا رواج تھا معالم السنن سنن و احکام کے اسی اولین مجموعہ اور صحاح ستہ کی ممتاز ترین کتاب کی غالباً سب سے قدیم اور سب سے اہم اور مستند شرح ہے سنن ابی داؤد کی اس سے زیادہ قدیم کسی شرح کا ذکر نہیں ملتا بعد میں متعدد شرحیں لکھی گئیں لیکن وہ سب زیادہ تر اس سے ماخوذ و منقول ہیں، والفضل للمتقدم،

امام ابوداؤد نے ایمانیات و عقائد کے بجائے صرف احکام و مسائل کی حدیثیں جمع کی ہیں، اس لئے امام خطابی نے بھی فقہیات کی تخریج اور احکام و مسائل کے استنباط کی جانب زیادہ توجہ کی ہے، علامہ شرف الدین طیبی فرماتے ہیں :-

واما فقہ الحدیث فھو ما تضمنہ نقہ حدیث سے وہ احکام و آداب

من الاحكام والآداب المستنبطة	مراد ہیں، جن پر حدیث مشتمل ہوتی ہے،
منه هن اٰداب الفقهاء	اور جو اس سے مستنبط کئے جاتے ہیں،
الاعلام كالائمة الاربعة	یہی ناموَر فقہاء جیسے ائمہ اربعہ وغیرہ
رضی الله عنهم و فی هذا	کا طریقہ ہے، اور اس فن میں بہت
الفن مُصنّفات كثيرة كمعالم	سی کتابیں لکھی گئی ہیں، جیسے امام
السنن للخطابی والتمهيد لابن	خطابی کی معالم السنن اور ابن عبدالبر
عبد البر،	کی تمہید،

(مقدمہ ناشر معالم السنن ج ۱ ص ۳)

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں :۔

"بعض مصنفین نے دقیق و غریب الفاظ اور مشکل معانی پر مشتمل حدیثوں کا استخراج کرکے اُن کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، ان لوگوں نے صرف حدیثوں کا متن نقل کیا ہے، اور ان کے اعراب، غریب الفاظ اور مشکل معانی کی تشریح کی ہے جیسے ابو عبید قاسم بن سلام اور ابن قتیبہ وغیرہ[1] اور بعض مصنفین نے اس پر فقہائے آراء اور احکام و مسائل کا بھی اضافہ کیا ہے جیساکہ معالم السنن اور اعلام السنن میں امام خطابی نے کیا ہے، ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اس قسم کی کتابیں لکھی ہیں"

(کشف الظنون ج ۱ ص)

امام خطابی کے زمانہ میں فقہاء و محدثین دو گروہوں میں منقسم تھے، انھوں نے اس کتاب کو فقہ و حدیث دونوں کی جامع بناکر ان دونوں طبقوں کی تفریق ختم کرکے اُن کو ایک دوسرے

[1] غریب الحدیث میں امام خطابی کی بھی ایک مستقل تصنیف ہے،

کے قریب لانے کی کوشش کی، کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے زمانہ کے علما دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک اصحاب اثر و حدیث کا اور دوسرا اہل فقہ و نظر کا طبقہ ہے، ان دونوں طبقوں کو اس طرح ہونا چاہئے تھا، کہ ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا، کیونکہ یہ دونوں درحقیقت ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں، ان میں سے کوئی جماعت بھی دوسری جماعت سے بے نیاز ہو کر اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ حدیث کی حیثیت بنیاد اور اصل کی ہے، اور فقہ دراصل اس کی دیوار اور فرع ہے، تم خود غور کرو کہ جو عمارت کسی بنیاد اور اساس پر تعمیر کی گئی ہو، اس کو ڈھ جانے سے کون بچا سکتا ہے، اسی طرح جس بنیاد پر کوئی عمارت ہی تعمیر نہ کی گئی ہو اس میں اور ویرانہ میں کیا فرق ہو سکتا ہے،

لیکن ان دونوں جماعتوں کو جن میں اتنی زیادہ وجہ قربت اور نقطۂ اتحاد پایا جاتا ہے اور جن میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے انتہائی ضروری ہے، آج وہ الگ تھلگ، اور راہ حق میں ایک دوسرے کی معاونت سے بالکل دست کش ہو گئی ہیں"،

پھر ان دونوں جماعتوں کی باہمی کشمکش اور افسوسناک طرز عمل کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مجھے امید ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو کچھ ثابت کیا ہے یعنی حدیث کے معانی اور اس سے مستنبط ہونے والے فقہی اصول و طرق ان پر جب فقیہ غور کرے گا تو وہ حدیث کی طلب اور علوم حدیث کی جستجو اور تتبع کے لئے آمادہ ہوگا، اور صاحب حدیث کو فقہ سے رغبت ہوگی، اور وہ اس کی تحصیل میں جد و جہد کرے گا"

(مقدمہ خطابی معالم السنن ج اول ص ۳ تا ۶)

فقہ اور احکام کے علاوہ اس میں سنن ابی داؤد کے تمام ضروری اور مشکل مسائل پر بحث کی گئی ہے

۔ وگوناگوں فوائد، مختلف النوع مباحث اور حدیث سے متعلق اہم تحقیقات پر مشتمل بڑی جامع اور شرح ہے، امام خطابی کا خود بیان ہے کہ انھوں نے اس میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں رمائش پر اُن کے لئے سنن کی حدیثوں کی تفسیر، اُن کے مواقع استنباط، وجوہ معانی کی دلالت الفاظ اور دقیق متون کی شرح اور فقہی مباحث اور علماء کے اقوال و اختلافات کی تشریح ہے، چنانچہ علامہ محمد بن حسن صغانی لاہوری (م ۶۵۰ھ) کا بیان ہے کہ خطابی نے اس میں کچھ جمع کر دیا ہے۔" (فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ)

اگر کسی باب کی متعدد حدیثوں کا مآل و منشا یکساں ہے تو اُس کی صرف ایک ہی حدیث رح پر اکتفا کیا گیا ہے، جو گویا پورے باب کی شرح ہے لیکن اگر کسی باب کی حدیثوں سے جدا سائل اور مختلف نتائج مترتب ہوتے ہیں تو ان سب کی الگ الگ تشریح و توضیح کی گئی ہے

اس شرح کی صحیح نوعیت اور مصنف کے طریقہ بحث اور احادیث کی تشریح و تفسیر کا اندازہ کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مایا :-

اذا قام احدکم من اللیل	جب تم میں سے کوئی شخص رات میں
فلا یغمس یدہ فی الاناء	سو کر اٹھے تو وہ اپنے ہاتھوں کو تین
حتی یغسلھا ثلاث مرات	دفعہ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالے،
فانہ لا یدری این باتت	کیونکہ اس کو پتہ نہیں کہ رات میں
یدہ،	اس کے ہاتھ کہاں تھے؟

امام خطابی اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں :-

"داؤد (ظاہری) اور محمد بن جریر (طبری) نے مطلقاً پانی میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہی کو دھونا ضروری قرار دیا ہے، ان دونوں بزرگوں کا خیال ہے کہ اگر ہاتھ نہ دھویا گیا تو پانی نجس ہوجائیگا، مگر امام احمد نے صرف رات میں سونے کے بعد ہاتھ دھونا ضروری قرار دیا ہے، کیونکہ حدیث میں رات ہی کا ذکر ہے، دوسرے عموماً لوگ دن میں سونے کے لئے کپڑے نہیں اتارتے، بلکہ رات میں اتار کر سوتے ہیں، سونے میں ہاتھ بدن کے مختلف حصوں بلکہ ان جگہوں پر بھی پہنچ جاتا ہے، جہاں کلوخ سے استنجا لینے کی وجہ سے ممکن ہے مکمل صفائی نہ ہوئی ہو، اور نجاست کے اثرات باقی رہ گئے ہوں، ایسی صورت میں ہاتھ دھوئے بغیر اگر پانی کے اندر ڈال دیا گیا، تو نجاست لگ جانے کی وجہ سے پانی خراب ہو جائے گا لیکن اگر ہاتھ اور مخصوص جگہ کے درمیان کپڑا حائل ہو تو اس قسم کا کوئی خدشہ نہیں رہ جاتا،

مگر عام علما، کے نزدیک اگر دھوئے بغیر بھی ہاتھ پانی میں ڈبو دیا جائے تو پانی پاک رہے گا، الاآنکہ ہاتھ میں نجاست لگے ہونے کا یقین ہو کیونکہ حدیث میں (لایدری این باتت یدلا) کہکر اس کو شک وارتیاب سے معلق کر دیا گیا ہو اور جس امر میں شک واحتمال ہو جائے، وہ واجب نہیں ہو سکتا، پانی کی اصل طہارت ہے یہی حال انسان کے جسم کا بھی ہے، اور جب طہارت یقینی طور پر ثابت ہوگئی تو اس قسم کے شبہات اور احتمالات سے وہ زائل نہیں ہوسکتی "

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑے پانی میں اگر نجاست شامل ہوگئی تو چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو پانی کا حکم بدل جائے گا، کیونکہ جو نجاست ہاتھ میں اس طرح لگی ہو کہ دکھائی بھی نہ دے تو وہ یقیناً کم ہی ہوگی،

اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر نجاست کے اوپر تھوڑا پانی بھی اس طرح ڈالا جائے کہ وہ اس پر غالب ہوجائے تو نجاست زائل ہو جائے گی، اور وہ خود نجس نہ ہوگا، کیونکہ برتن کے جس پانی کو آپؐ نے گرانے کا حکم دیا ہے وہ برتن میں باقی رہنے والے پانی سے بھی کم ہے، مگر آپؐ نے اس کم کی بھی طہارت ہی کا نہیں بلکہ مطہر ہونے کا بھی حکم صادر فرمایا ہے، اور اس کے مقابلہ میں اس سے زیادہ پانی کو نجس قرار دیا ہے، جس میں نجاست لگا ہوا ہاتھ ڈالدیا گیا ہو، اس سے وارد (نجاست پر ڈالے جانے والے) اور مورود (جس پانی میں نجاست پڑ جائے) کا فرق صاف ظاہر ہوتا ہے،

حدیث میں یہ دلیل بھی موجود ہے، کہ نجاست کو سات دفعہ دھونے کا جو حکم بعض حدیثوں میں دیا گیا ہے، وہ صرف بعض ہی نجاستوں کے ساتھ مخصوص ہے، ہر نجاست کیلئے یہ تعداد ضروری نہیں ہے، بلکہ سات دفعہ سے کم تعداد بھی نجاست کو زائل کرنے کے لئے کافی ہے، اس حدیث میں تین دفعہ دھونے کا ذکر احتیاطًا اور نجاست کے یقینی طور سے زائل ہوجانے کے لئے دیا گیا ہے، کیونکہ عمومًا متواتر تین بار دھولینے سے نجاست زائل ہوجاتی ہے، اس مسئلہ میں نجاست چونکہ غیر مرئی ہے اس لئے تین دفعہ دھونے کی صراحت کی گئی ہے تاکہ نجاست کے زائل ہوجانے کا یقین ہوجائے ورنہ اگر وہ مرئی ہوتی تو ایک دفعہ دھولینا بھی بشرطیکہ وہ زائل ہوجائے کافی تھی،

اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مقام استنجاء میں اگر نجاست کا اثر باقی رہ گیا ہو تو اس حالت میں بھی نماز کے جواز کے لئے رخصت ہے، لیکن اس پر مزید چیزوں کو قیاس کرنا درست نہیں ہے،

حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادات کے معاملہ میں احتیاط و اطمینان کا طریقہ اختیار کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے،[۵]

---

۵ معالم السنن ج اوّل ص ۴۷ و ۴۸،

ایک اور مثال ملاحظہ ہو، اس سے اندازہ ہوگا کہ مسائل کے تجزیہ و تنقیح اور دقتِ نظر اور حدیث کی فہم و معرفت میں اُن کو کتنا کمال حاصل ہے،

ایک مرتبہ حضرت قبیصہؓ صحابی جنھوں نے کوئی ذمہ داری لے لی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ تم رُکے رہو تاکہ اگر ہمارے پاس صدقہ کی کوئی رقم آئے تو تم کو دیدی جائے، پھر فرمایا،

يا قبيصة إنّ المسئلة لا تحل	اے قبیصہ تین ہی آدمیوں کے لئے سوال
الا لاحد ثلاثة رجل تحمل	کرنا جائز ہے ایک وہ آدمی جس نے کوئی
بحمالة فحلت له المسئلة	ذمہ داری سنبھالی ہو تو اس کے لئے
فسأل حتى يصيبها ثم يمسك	سوال کرنا جائز ہے پس ایسا شخص
ورجل اصابته جائحة اجتاحت	جب سوال کرے تو اس کو صدقہ دیا
ماله فحلت له المسألة	جائے، تاکہ وہ سوال سے رُک جائے،
فسأل حتى يصيب قواماً	اور دوسرا وہ آدمی ہے جس کو کوئی آفت
من عيش او قال سداداً من	پیش آگئی تو اس کے لئے مانگنا حلال ہوگیا،
عيش ورجل اصابته فاقة	پس وہ سوال کرے گا تاکہ اس کی حالت
حتى يقول ثلاثة من ذوي	بہتر ہو جائے، اور تیسرا وہ شخص ہے جسکو
الحجى من قومه قد اصابت	فوری ضرورت اور احتیاج لاحق ہوگئی
فلاناً الفاقة فحلت له المسألة	تو اس کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے،
فسأل حتى يصيب قواماً من	اور یہ بھی اپنی حالت سدھارنے کے لئے
عيش او قال سداداً من	سوال کرے گا تاکہ اس کی حالت بہتر

عيش ثم يمسك وما سواهن	ہو جائے اور تیسرا وہ شخص ہے جس کو ایسی
من المسألة يا قبيصة سحت	ضرورت اور احتیاج لاحق ہوگئی تو اس
يأكلها صاحبها سحتا،	کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے، اور
	یہ بھی اپنی حالت درست ہونے کے لئے سوال
	کرے گا، اور جب حالت سنبھل جائے
	تو سوال سے رک جائے، اے قبیصہ
[illegible]	ان تینوں صورتوں کے سوا ہر سوال
	باطل ہے، اور اس کو کھانے والا حرام

اس کی تشریح میں امام موصوف لکھتے ہیں :-

"یہ حدیث گوناگوں فوائد و معلومات اور علم و حکمت کے ذخائر پر مشتمل ہے، اس میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان لوگوں کی تین قسمیں بتائی ہیں، جن کے لئے سوال کرنا جائز ہے، ایک قسم اغنیا کی اور دو قسمیں فقرا کی ہیں، فقر کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں، فقر ظاہر اور فقر باطن،

جس غنی کے لئے مانگنا حلال ہے، اس کو صاحب الحمالہ یعنی کسی ذمہ داری کا کفیل اور اہم معاملہ کا بوجھ اٹھانے والا کہا گیا ہے، مثلاً کسی قوم کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے اور ان کی عداوت و دشمنی اتنی سخت ہو جائے کہ قتل و خونریزی یا اور کسی نہایت شدید قسم کے فتنہ کا اندیشہ پیدا ہو جائے، اس نازک مرحلہ پر اگر کوئی شخص درمیان میں پڑ کر اختلاف رفع کرنے اور اصلاح ذات البین کی کوشش کرے، اور اس کو فتنہ فرو اور فریقین کو رضامند کرنے کے لئے کثیر مصارف برداشت کرنا پڑے، یا کسی خطیر سرمایہ کا ضامن

ہونا پڑے تو چونکہ اس نے ایک اچھا اور بھلے کام یعنی اصلاح ذات البین کی کوشش کی ہے اس لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے خود زیر بار ہو، بلکہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں اس کی امداد و اعانت کی جائے گی، اور صدقہ وخیرات میں سے بھی اس کو اس قدر رقم دیجا سکتی ہے جس سے اس کی زیر باری ختم ہو اور وہ اپنی ضمانت سے عہدہ برآ ہو جائے،

اہلِ حاجت کی پہلی قسم میں وہ آدمی شامل ہے جو جائحہ کا شکار ہو گیا ہو، جائحہ کا اطلاق عام طور سے ناگہانی آفت پر کیا جاتا ہے، جیسے سیلاب میں کسی کا مال واسباب بہہ جائے، یا آگ میں جل جائے، یا ژالہ باری سے کھیتی اور باغ کے پھل تباہ ہو جائیں یہ سب ایسی صورتیں ہیں، جن کے اثرات پوشیدہ نہیں رہتے، بلکہ عام لوگوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے، اس قسم کی افتاد سے اگر کسی کا مال برباد ہو گیا ہو، تو اس کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے، اور لوگوں کو اس کے فقر کا ثبوت اور مستحق صدقہ ہونے کا ثبوت کئے بغیر اس کو صدقہ دینا ضروری ہے،

تیسرا آدمی وہ ہے جو بظاہر خوش حال اور صاحبِ حیثیت ہو لیکن اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ چوروں اور رہزنوں نے اس کا مال لوٹ لیا، یا ان لوگوں نے خیانت کی ہے جن کے پاس اس نے اپنا مال امانت رکھا تھا، یہ ایسی شکلیں ہیں کہ جن کا عموماً لوگوں کو علم نہیں ہوتا اور نہ آثار و قرائن سے ان کا پتہ چلتا ہے، اس لئے جب کسی شخص کیساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آئے اور لوگوں کے دلوں میں اس کے بارہ میں شبہات ہوں، تو ان کو ان لوگوں سے جن کو اس سے خصوصیت و قربت حاصل ہو، اور جو اس کے حالات کے متعلق واقفیت رکھتے ہوں، دریافت کرنا چاہئے، حالات کی تحقیق اور تفتیش کئے بغیر اس کو صدقہ نہیں

دینا چاہئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک (حتی یقول ثلاثۃ من ذوی الحجا من قومہ قد اصابت فلانا الفاقۃ) کا یہی مطلب ہے، آپ نے حجی (عقل) کی شرط اسی لئے لگائی ہے کہ اس کے حالات بالکل محقق اور ثابت ہو جائیں یعنی یہ لوگ ایسے غبی، بلید اور بے خبر نہ ہوں، جن سے اندرونی معاملات اور داخلی حقائق مخفی رہتے ہوں، یہ معاملہ تبیین و تحقیق کی نوعیت کا ہے، اس کو شہادت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ شہادت میں تین کی تعداد شرط نہیں ہے، اس قسم کے معاملہ میں اگر اس کی قوم یا قرب و جوار کے لوگوں اور اس کے حالات سے واقفیت رکھنے والوں نے اس کے دعوی کی تصدیق کر دی تو اس کو صدقہ دیا جائے گا،

اس روایت سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص کے ذمہ کوئی حق اور مطالبہ عائد ہوا ہو، اور اس کو قاضی کے سامنے لایا گیا، وہ اپنے افلاس کا دعوی کرے تو اس کے معاملہ میں غور کرنا ضروری ہے، اگر اس کے ذمہ کوئی ایسا حق ثابت ہو جو موجب تملیک ہو، جیسے مطالبہ کرنے والے نے قرضہ دیا ہو یا کوئی چیز فروخت کی ہو، تو چونکہ اس کا ان چیزوں پر قبضہ ثابت ہو چکا ہے، اس لئے اس کو قید کر دیا جائے گا، اور افلاس کے متعلق اس کی کوئی بات نہیں سنی جائے گی، کیونکہ قبضہ اور ملکیت ثابت ہونے کے بعد وہ بظاہر مفلس اور تنگ دست نہیں رہا، لیکن اگر قید کے بعد اس کے افلاس کا کوئی ثبوت مل جائے، تو رہا کر دیا جائے گا، لیکن اگر اس کے ذمہ عورت کی مہر جنایت یا اور کسی قسم کے تاوان وغیرہ کی نوعیت کا حق عائد ہو تو چونکہ ان صورتوں میں قبضہ اور تملیک کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لئے اس کو قید نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کے معاملہ میں غور کیا جائے گا، اگر وہ صاحبِ ملکیت ہے تو اس کے ذریعہ مطالبہ ادا کیا

جائے گا، ورنہ وسعت کشادگی کے وقت تک کے لئے مہلت دی جائے گی،

یہ واضح رہنا چاہئے کہ لوگوں کی اصل حالت فقر و افلاس کی ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب آدمی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو اس کے جسم پر کچھ بھی نہیں ہوتا، پھر اللہ اس کو روزی اور غنی بخشتا ہے" آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ "غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے" اور "مالدار آدمی اگر ادائگی قرض سے انکار کرے یا اس میں تاخیر کرے تو اس کی عزت و آبرو مباح اور اس کو سزا دینا جائز ہو جاتا ہے" ظاہر ہے جب آپ نے آسایش اور غنی کی موجودگی میں انکار یا تاخیر کرنے والے کو ظالم قرار دیا ہے تو اس شخص شخص کو کس طرح قید کر سکتے اور سزا دے سکتے ہیں، جب کہ یہ ظالم نہیں ہے،

آپ کا حضرت قبیصہ کو صدقہ دینے کے لئے روکنا اس بات کی دلیل ہے، کہ صدقہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کیا جا سکتا ہے، حدیث میں صدقہ کی حد کفایت بتائی گئی ہے، یعنی اتنا صدقہ دیا جائے جس سے لینے والے کی ضرورت رفع اور اس کو فراغت میسر ہو جائے، اس میں ہر شخص کی حالت اور حیثیت کا اعتبار کیا جائے گا، اس کی کوئی ایسی مقدار نہیں متعین کی جا سکتی، جو سب کے لئے ضروری قرار دیجائے، کیونکہ ہر شخص کے حالات جدا جدا ہوتے ہیں"

(معالم السنن ج ۲ ص ۶۶ تا ۶۸)

بعض حدیثوں میں سوال اور اس کا جواب مذکور ہوتا ہے، مصنف نے ایسی حدیثوں پر خاص طور سے بہت اچھی بحثیں کی ہیں، اور بڑے دلچسپ نتائج اور حقائق اخذ کئے ہیں، مثلاً:-

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم لوگ کشتیوں پر سمندر میں سفر کرتے ہیں، ہمارے ساتھ اتنا کم پانی

ہوتا ہے کہ اگر اس سے وضو کرلیں تو پینے کے لئے نہ رہ جائے، اس صورت میں سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں، آپ نے فرمایا:۔

هو الطهور ماؤه الحل ميتته، اس کا پانی پاک اور مردہ حلال ہے'

اب امام خطابی کی تشریح ملاحظہ ہو:۔

اس حدیث میں مختلف النوع معلومات پائے جاتے ہیں:۔

(الف) قرآن مجید کی آیت (اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوهكم) سے مخاطب اور سامع کے ذہن میں جس طاہر اور غسول پانی کا تصور آتا ہے، وہ ایسا قدرتی پانی ہے جو اپنی اصل حالت پر اور ان تمام عوارض و اثرات سے پاک ہو جو اس کو بدل دیتے ہیں، اسی بناء پر ان لوگوں کو سمندر کے پانی کے متعلق جس کا رنگ اور مزہ بدلا ہوا ہوتا ہے شک و شبہ پیدا ہوا، اور انھوں نے اس کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس پانی سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے؟

(ب) عالم و مفتی سے جب کوئی چیز دریافت کی جائے، اور وہ محسوس کرے کہ سائل کو۔۔۔ مسئولہ چیز کے سوا ان چیزوں سے بھی واقف ہونے کی ضرورت ہے، جن کا اسی مسئلہ سے تعلق اور واسطہ ہے، ....

تو ایسی صورت میں مناسب اور مستحب ہے کہ وہ دریافت طلب مسئلہ کے علاوہ اس کے متعلقہ مسائل کا جواب بھی دیدے، اس کو غیر متعلق نہ سمجھا جائے گا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف سمندر کے پانی کے متعلق سوال کیا گیا تھا، آپ نے محض اسی کے جواب پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ سمندر کے کھانے کے متعلق بھی جواب دیا، کیونکہ آپ کے

معلوم تھا کہ جو دشواری اس وقت ان لوگوں کو شیریں پانی کے بارہ میں پیش آئی ہے، وہی دشواری آئندہ سمندر کے زادِ راہ کے سلسلہ میں بھی پیش آئے گی، اس لئے اُس پیش آنے والی ضرورت کے متعلق بھی جواب دیدیا،

اس کے علاوہ پانی کی طہارت کا مسئلہ تو اتنا مشہور ہے کہ اس سے عموماً عام و خاص سب واقف ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں سمندر کے میتہ اور اُس کے حلال ہونے کا معاملہ مشکل ہے، جب آپ نے دیکھا کہ سوال کرنے والا کھلے اور ظاہر مسئلہ سے بھی ناواقف ہے، تو مشکل مسئلہ سے اور بھی ناواقف ہوگا، اس لئے آپ نے اُس کو بھی بیان فرمادیا،

اسی سے ملتا جلتا یہ واقعہ بھی ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک شخص سے جس نے نماز صحیح طریقہ سے ادا نہیں کی تھی، فرمایا کہ (صل فانک لم تصل) یعنی تم پھر سے نماز پڑھو کیونکہ تم نے ٹھیک طریقہ سے نماز نہیں پڑھی، اس شخص نے تین دفعہ نماز پڑھی، اور ہر دفعہ آپ نے اُس کو دوبارہ پڑھنے کی تلقین کی، یہاں تک کہ آخر میں اُس نے درخواست کی کہ آپ اس کو نماز پڑھنا سکھا دیں، چنانچہ آپ نے نماز سکھائی، اور اس سے پہلے طہارت اور وضو کا طریقہ بھی بتایا، اُس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نماز کا مسئلہ تو زیادہ واضح اور مشہور تھا، ہر شخص روزانہ اس کا مشاہدہ کرتا تھا، اُس کے مقابلہ میں طہارت اور وضو کا مسئلہ زیادہ واضح اور مشہور نہیں ہے، کیونکہ عموماً تخلیہ میں کیا جاتا ہے، اس لئے جب آپ نے دیکھا کہ وہ نماز سے بھی واقف نہیں ہے، تو یہ قیاس کرکے کہ طہارت سے بھی ناواقف ہوگا، اس لئے اس کو بھی واضح فرمادیا،

ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو سمندر کے پانی کی طہارت سے آگاہ فرمایا اور وہ جانتے تھے کہ سمندر میں حیوانات بھی ہوتے ہیں جو اسی کے اندر مرجاتے ہیں، اور مردہ نجس ہوتا ہے، تو ضرورت کا اقتضا تھا کہ ان لوگوں کو اس قسم کے مردہ کا حکم بھی بتا دیا جائے، کہ وہ دوسرے مردار کے برخلاف حلال ہوتا ہے، اور یہ وہم نہ ہو کہ مردار کی وجہ سے پانی نجس ہوگیا،

(ب) حدیث میں اُس کی دلیل بھی ہے کہ سطح آب پر مرجانے والی مچھلی اور پانی سے باہر مرجانے والی مچھلی دونوں حلال ہیں، اس لئے پانی کے حیوانات کے پانی کے اندر اور باہر مرنے میں کوئی فرق نہیں،

(ج) یہ حدیث اس کا بھی ثبوت ہے کہ سمندر میں رہنے والے تمام حیوانات اگر اس کے اندر مرجائیں، پاک ہیں، کیونکہ حدیث میں عام حکم ہے کسی نوع کو دوسری نوع سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا ہے،

مگر بعض علمائنے یہ تفریق کی ہے، کہ سمندر کے جو جانور خشکی کے ان جانوروں کی طرح ہیں جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا جیسے انسان، کتا اور خنزیر وہ حرام ہیں، اور جو خشکی کے ان جانوروں کے مانند ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے، اُن کا گوشت اُن کے مردہ ہونے کے باوجود کھایا جائے گا،

بعض لوگوں نے تو اس میں اس قدر وسعت دی ہے، کہ سمندر کے جانوروں کی صورتیں چاہے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں وہ سب مچھلیوں کے حکم میں ہیں چنانچہ پانی کے اندر رہنے والا سانپ کا جس کی شکل بالکل سانپوں جیسی ہوتی ہے، اور جو مچھلیوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے، کھانا بھی جائز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان

لوگوں کے نزدیک شکل و صورت کا مختلف ہونا اباحت کے حکم کو مختلف نہیں بناسکتا، مگر ان لوگوں نے مینڈک کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مارنے سے منع کیا ہے،

(معالم السنن ج ۴ ص ۲۴۳ و ۲۴۴)

توضیح و تشریح کی ایک اور مثال یہ ہے :-

"ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک طور طریق اور میانہ روی نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے" امام خطابی اس کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ یہ سب عادتیں انبیاء کے شمائل و عادات میں شامل ہیں، اس لئے اُن کے فضائل و کمالات کے مختلف اجزاء میں سے ایک جزء یہ بھی ہیں، اس لئے تم لوگوں کو ان عادتوں میں اُن کی اقتدا کرنی چاہئیے، آپ کا یہ منشاء نہیں ہے کہ نبوت فی نفسہ کوئی اس قسم کی چیز ہے جس کے اجزاء اور ٹکڑے ہو سکتے ہیں، اور یہ مقصود ہے کہ جس شخص میں یہ عادتیں موجود ہوں اس کو نبوت کا کوئی جزء مل گیا، وہ کوئی کسبی چیز نہیں ہے، جس کو کسب سے حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک مخصوص موہبت اور عطا و بخشش ہے، جس سے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے سرفراز فرماتا ہے، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ نبوت و رسالت کا مہبط بننے کے لائق کون ہے،؟

پھر نبوت کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ختم ہو چکا ہے اگر

بہ فرض محال اُس کے اجزار بھی ہوتے، تو اب وہ کسی میں کس طرح پائے جاسکتے ہیں"
البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہاں نبوت سے اس دعوت اور پیغام کو مراد لیا جائے جو نبوت کا مقصود ہے، اور جس کی تبلیغ و اشاعت پر انبیار علیہم السلام مامور ہوتے ہیں، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اعتدال اور اچھے اطوار دعوت نبوت کے ۲۵ اجزا میں سے ایک جز ہے،

ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جس شخص میں یہ اوصاف پیدا ہوجاتے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں باوقار اور باعزت ہوجاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو تقوی کا وہی لباس پہناتا ہے، جو انبیاؑ کا ہوتا ہے، اس حیثیت سے گویا ان کو نبوت کا ایک جز کہا گیا ہے"

بعض حدیثوں میں حقیقی مفہوم کے مقابلہ میں ان کا مجازی مفہوم زیادہ دلنشیں اور مناسب ہوتا ہے، امام خطابی نے ایسی حدیثوں کی بھی بہت عمدہ پیرایہ میں وضاحت کی ہے مثلاً :-

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ :-

من نظر فی کتاب اخیہ بغیر اذنہ فانما ینظر فی النار،	جو اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کا خط دیکھتا ہے، وہ گویا آگ میں دیکھتا ہے،

فانما ینظر فی النار" دراصل تمثیل ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح آگ سے حذر کیا جاتا ہے، اسی طرح اس کام سے بچنا چاہئے،
ایک مفہوم یہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ نظر الی النار کے معنی آگ کے قریب ہونا

اور اس میں داخل ہونا"

ایک مشہور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے بارہ میں فرمایا :۔

" انھا لیست بنجس انھا من الطوافین علیکم والطوافات اسکی مشہور تاویل یہ کی جاتی ہے کہ بلی گھر کے خادموں کی طرح ہر وقت اس میں آتی جاتی رہتی ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے (طوافون علیکم بعضکم علی بعض) یہاں خدام اور ممالیک مراد ہیں، اور دوسری جگہ فرمایا (یطوفون علیھم ولدان مخلدون) ۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر کا ارشاد ہے کہ اُن کی حیثیت گھر کے لازمی جزء کی سی ہے،

لیکن اس کی تاویل بھی ہو سکتی ہے کہ بلی اِدھر اُدھر اسی طرح پھرا کرتی ہے جس طرح محتاج اور فقیر مانگنے کے لئے پھرا کرتے ہیں، اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ بلیوں کے ساتھ مواسات کرنے کا وہی اجر و ثواب ملے گا جو محتاجوں کی مدد اور سائلوں کی حاجت روائی کرنے کا ملتا ہے"

بعض حدیثوں کے ظاہری مفہوم کی گنجائش ہونے کے باوجود ان کا مجازی مفہوم لینا زیادہ انسب ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہر ذہن و مذاق کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہوتا ہے لیکن ظاہری اور اصلی معنی سے عدول و انحراف میں بڑی احتیاط اور فن اور زبان سے مکمل واقفیت ضروری ہے، ذیل میں اس کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں :۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے پاس آکر اُن کی تعریف شروع کی، مقدادؓ بن اسود نے مٹی لے کر اس کے چہرہ پر پھینک دی، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

اذا لقیتم المداحین فاحثوا فی وجوھھم التراب، — جب تم مبالغہ سے تعریف کرنے والوں کو پاؤ تو اُن کے چہروں پر مٹی ڈال دو۔

امام خطابی فرماتے ہیں :-

"اس سے مراد وہ مداحین ہیں جنھوں نے مدح کو پیشہ بنالیا ہے، اور وہ اس طریقہ سے ممدوح کو دھوکہ دے کر اپنی معاش اور روزی کا انتظام کرتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص کسی کے اچھے اعمال اور عمدہ کاموں پر اسکی تعریف کرتا ہے تو یہ اس کی جانب سے ممدوح کی حوصلہ افزائی اور اس کو کار خیر کے لئے مزید ترغیب دلانے پر محمول کیا جائے گا، کہ وہ اس قسم کے کام آیندہ بھی کرتا رہے، اس تعریف و توصیف سے دوسروں کو بھی اس قسم کے کاموں پر ابھارنا مقصود ہوتا ہے، تاکہ وہ بھی اس کو دیکھ کر اُس کے اچھے کاموں کی تقلید کریں،

اس واقعہ میں حضرت مقداد نے حدیث کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرکے فی الواقع مادح کے اوپر مٹی پھینک دی، اس سے قطع نظر ایک توجیہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں مدح کرنے والوں کو کچھ نہ دینے کی تلمیح ہے، یعنی جو شخص لوگوں کی مدح و توصیف کے درپے ہو اس کو دینے کے بجائے بالکل محروم کر دینا چاہئے گویا تراب کا لفظ کنایۃً استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے حرمان مقصود ہے، جیسے کہا جاتا ہے" مالہ غیر التراب یا ما فی یدہ غیر التراب (یعنی اس کے پاس کچھ نہیں ہے) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

اذا جاءک یطلب ثمن الکلب فاملاء کفہ — جب تمھارے پاس کوئی کتے کی قیمت مانگنے آئے تو تم اُس کی مٹھی میں مٹی

ثُرّاباً[1]، ڈال دو (یعنی اُسے کچھ بھی نہ دو)

اس کی ایک اور مثال یہ ہے :-

"حضرت ابوسعید خدریؓ نے اپنی موت کے وقت نئے کپڑے منگوا کر پہنے اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ

انّ المیّت یبعث فی ثیابه التی یموت فیھا، بیشک مردہ اپنے انہی کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں اس کی موت ہوتی ہے،

امام خطابی اُس کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"حضرت ابوسعیدؓ نے اس حدیث کو ظاہری معنی پر محمول کیا، اس میں شبہہ نہیں کہ اچھے کفن کے متعلق کئی حدیثیں مروی ہیں، لیکن بعض علماء نے اس کی بالکل دوسری تاویل کی ہے، اُن کے نزدیک ثیاب سے عمل مراد ہے، یعنی کفن کنایہ ہے، اور آپ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ انسان اسی چیز پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا، جس پر اُس کی موت ہوگی، اہلِ عرب جب کسی شخص کو طاہر الثیاب کہتے ہیں، تو اس سے اُس کی عفت، طہارت نفس اور عیب سے بری ہونا مراد ہوتا ہے، اور دنس الثیاب سے اس کے عیوب و نقائص مراد ہوتے ہیں، حدیث سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے، آپ نے فرمایا

تحشر النّاس حفاةً عراةً، یعنی قیامت میں لوگ ننگے پاؤں اور ننگے بدن جمع کئے جائیں گے،

---

[1] معالم السنن ج ۴ ص ۱۱۱،

یہ حدیث اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اوپر کی حدیث میں ثیاب سے کفن کے کپڑے نہیں مراد ہو سکتے ہیں، لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعث، حشر سے مختلف چیز ہے، اس میں بعث کے وقت کپڑوں کے ہونے کی نفی نہیں ہے،"

(ج ۱ ص ۳۰۱ و ۳۰۲)

بعض حدیثوں میں وسیع اور عام الفاظ و معانی سے مخصوص اور محدود معنی مراد ہوتے ہیں، اور کبھی خاص لفظ وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس کی بھی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ

لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت کی ہے

امام خطابی فرماتے ہیں کہ اس تہدید اور عقوبت کے یہ دونوں اس وقت مستحق ہوں گے جب وہ قصد و ارادہ میں برابر کے شریک ہوں، رشوت دینے والا اگر رشوت کے ذریعہ حرام اور باطل کی طلب و تحصیل کرتا ہے، اور اس کو ظلم و زیادتی کا ذریعہ بناتا ہے تو یقیناً اس لعنت اور تہدید کا مستحق ہوگا، لیکن جو شخص اپنے جائز حق کو طلب کرنے یا اپنے اوپر ہونے والے کسی ظلم کو دور کرنے کے لئے رشوت دے تو وہ اس وعید میں شامل نہ ہوگا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بلاد حبشہ میں گرفتار کرلئے گئے، تو دو دینار دے کر رہائی حاصل کی تھی، حسن، شعبی، جابر ابن زید اور عطاء رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ اگر آدمی اپنی ذات یا اپنے مال پر ہونے والی کسی زیادتی اور ظلم کو روکنے کے لئے رشوت دے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، اسی طرح رشوت لینے والا اس وعید کا اس وقت مستحق ہوگا جب وہ کسی ایسے حق کام کو

جس کی ادائگی اس کے فرائض میں ہے، بغیر رشوت کے نہ کرے یا کسی باطل کام کو جس کا ترک اس پر فرض تھا، بغیر رشوت کے ترک نہ کرے۔" (ج ۴ ص ۱۶۱)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ

المسلمون شرکاء فی ثلاث	یعنی مسلمان تین چیزوں میں برابر کے
فی الماء والکلاء والنار	شریک ہیں، پانی، چراگاہ، اور آگ

امام خطابی فرماتے ہیں کہ کلاء سے مراد افتادہ زمین کی چراگاہ ہے، اس چراگاہ میں ہر مسلمان اپنے مویشی چرا سکتا ہے، وہ کسی کے لئے مخصوص نہیں، اور نہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو اس سے روک سکتا ہے، زمانہ جاہلیت میں لوگ اس قسم کی چراگاہیں کو بھی اپنے لئے مخصوص کر لیتے تھے، اور دوسروں کو اس میں مویشی نہیں چرانے دیتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، اور اس قسم کی تمام چراگاہوں میں سب کا حق مساوی قرار دیا، لیکن اگر چراگاہ ایسی زمین میں ہو جو کسی متعین شخص کی ملکیت میں ہو، تو وہ اس کی ذاتی ملک سمجھی جائے گی، اور اس کی اجازت کے بغیر دوسرا شخص اس میں اپنے مویشی داخل نہیں کر سکے گا۔"

(ج ۳۔ ص ۱۲۹)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ

"جس گھر میں تصویر ہوتی ہے، اس میں ملائکہ نہیں داخل ہوتے، لیکن یہاں ملائکہ سے وہ فرشتے مراد ہیں جو خدا کی رحمت اور برکت لے کر نازل ہوتے ہیں، کیونکہ نگرانی کرنے والے فرشتے تو ہر آدمی کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں۔"

(ج ا ص ۷۵)

امام خطابی نے حدیثوں کے مفہوم کی توضیح میں جو نکتہ آفرینیاں کی ہیں، اُن کے چند نمونے بھی ملاحظہ ہوں :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لولا ان اشق علیٰ اُمتی لامرتھم	اگر میری امت کے لئے شاق نہ ہوتا
بتاخیر العشاء و بالسواک عند	تو میں اُن کو عشا کی نماز دیر میں پڑھنے
کل صلوٰۃ،	اور ہر نماز کے وقت مسواک کرنے
	کا حکم (ضرور) دیتا،

امام خطابی اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "امر کی اصل وجوب ہے اگر آپ کا امر وجوب کو مستلزم نہ ہوتا، تو لامرتھم ایک بے معنی بات ہوتی" (ج ا ص ۲۹)

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ "ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وضو کیا، اور پیر دھونے میں ناخن کے پاس کچھ حصہ خشک رہ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ارجع فاحسن وضوءک، جاکر پھر سے ٹھیک سے وضو کرو،

امام خطابی اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ "وضو میں تفریق جائز نہیں ہے کیونکہ آپ نے شخص مذکور کو دوبارہ ٹھیک سے وضو کرنے کا حکم دیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ تمام اعضاء کو دھوئے، اگر تفریق جائز ہوتی تو آپ صرف چھوٹی ہوئی جگہ کو دوبارہ دھونے یا اس پر پانی پہنچا دینے کا حکم دینے ہی پر اکتفا فرماتے، اور اس جگہ واپس جانے کا حکم نہ دیتے، جہاں اس نے وضو کیا تھا" (ج ا ص ۶۳ و ۶۴)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان تشریف لے گئے، تو فرمایا (السلام علیکم دار قوم مومنین) امام خطابی ارشاد فرماتے ہیں، کہ اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ زندہ لوگوں کی طرح مردوں پر بھی سلام کیا جائے گا، اور دعا کو اس پر مقدم کیا جائے گا، اور ہر دعا خیر کے موقع پر اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مثلاً (رحمۃ اللہ و برکاتہ علیکم اہل البیت) دوسری جگہ ہے (سلام علی الیاسین) اس کے برعکس سلام و دعا کے بجائے تہدید اور بددعا میں اسم کو دعا پر مقدم کر دیا جائے گا جیسے (وان علیکم لعنتی الی یوم الدین)

(ج ا ص ۳۱۷) (باقی)

مدرسہ سراج العلوم

(جھنڈا نگر - نیپال)

اس دینی تعلیمی ادارہ میں جو جھنڈا نگر نیپال میں قائم ہے، اٹھارہ لائق آدمی جو اس کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں، کام کرتے ہیں، دو سو مقامی و بیرونی طلبہ زیر تعلیم ہیں، ان میں ۵۰ بورڈرس ہیں جن کے قیام و طعام اور دوسری ضرورتوں کا مدرسہ کفیل ہے، تیس ہزار سالانہ اس کا خرچ ہے، تعمیری مصارف اس کے علاوہ ہیں جن کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، اس وقت مسجد دار الاقامہ، اور کتب خانہ کی عمارتیں زیر تعمیر ہیں،

امید ہے کہ علم دوست و اہل خیر حضرات حدود نیپال کے اس واحد دینی و عربی مدرسہ کی طرف توجہ فرمائیں گے، اور رمضان عید و عید ضحیٰ کے موقع پر اپنا زر اعانت اس پتہ پر بھیج کر عند اللہ ماجور ہوں گے،

مولانا عبد الرؤف رحمانی، کیر آف خان کلاتھ ہاؤس،

(بڑھنی بازار بستی)

"مینیجر"

حضرت میر علی عاشقاں سرائمیریؒ

از جناب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

علوئے مرتبت: میر صاحب نے راہ طلب کی خاک چھانتے ہوئے دسویں صدی کے مشرقی علماء و فضلا سے اپنی استعداد و جستجو کے اکتساب فیوض و برکات کیا اور سمانہ، دہلی، بہار، جونپور اور نظام آباد کے علمی و روحانی مرکزوں سے حصہ وافر پایا اور پورب کی یہ سرزمین اس طرح پسند آئی کہ یہیں کے ہو رہے، سرائمیر آپکے نام سے مشہور قصبہ ہے، اس زمانہ میں پورب کے قصبات و دیہات بڑے پرکشش تھے، اور ارباب ذوق دور دور سے آکر یہاں آباد ہوتے تھے، چنانچہ اسی زمانہ میں میر صاحب کے شیخ الشیخ حضرت راجہ سید حامد شاہ مانکپوریؒ کی نسل سے ایک بزرگ راجہ سید مبارک شاہ ابن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ نے اس علاقہ کی ایک قدیم مسلم بستی قاسم آباد کو اپنے نام سے از سر نو آباد کرکے اس کا نام مبارک پور (اعظم گڈھ) رکھا اور یہیں بود و باش اختیار کی، گویا سرائے میر اور مبارک پور دونوں معاصر اسلامی قصبات ہیں، اور ان کا تاسیسی تعلق دو روحانی بزرگوں سے ہے، میر صاحب نے پہلے سرائمیر سے متصل کھریواں نامی بستی میں بود و باش اختیار کرکے اسی کے قرب مرتضیٰ آباد کے نام سے ایک گاؤں بسایا، پھر سرائمیر کو اپنا مسکن بنایا، کسی روایت سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کے بعد میر صاحب نے اپنے آبائی وطن سمانہ کا سفر کیا ہو، بلکہ سرائے میر ہی میں رہ کر خلق اللہ کی ہدایت میں پوری زندگی بسر کی، حتیٰ کہ یہیں وفات پائی، البتہ مبارکپور کے بانی راجہ سید مبارک شاہ کا وصال مانکپور میں ہوا،

میر صاحب نے علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کر کے دسویں صدی کے تمام مروجہ سلاسل میں خلافت پائی، اور شیخت کے سلسلہ میں چشتیت کے ساتھ شطاریت کو اپنایا اور پوری زندگی رشد و ہدایت، وجد و کیف اور شریعت و طریقت کی جامعیت میں بسر کی، اپنے معاصرین و اقران میں ممتاز و بلند مرتبہ کے وارث ہوئے، اور ارباب یقین و عرفان میں اپنے خصوصی اوصاف و کمالات میں مشہور ہیں، شاہ عبد الحق صاحب کے والد بزرگوار شیخ سیف الدین جو آپ کے معاصر اور ملنے والے تھے، اپنے خیالات یوں ظاہر فرماتے ہیں "من بملازمت او رسیدہ ام، و از دے سخنان شنیدہ، اثر ذوق و عرفان و طیبت قلب و سرگرمی محبت از کلمات او لائح بود"، خود شاہ صاحب جو میر صاحب کے پہلے سوانح نگار ہیں، لکھتے ہیں "وے از ارباب کمال وسکر و وجد و حال بود، دائم با خود حالتے و سرگرمی داشتے، سخن را مجذوبانہ گفتے"[۱] اورا تشکوہ نے لکھا ہی "از بندگان ارباب کمال وسکر و وجد و حال، و از کبار مشائخ ہندوستان بودہ اند"[۲]، صاحب اخبار الاصفیا کا قول ہے "میر سید علی قوام الدین بردا اللہ مضجعہ از سادات بزرگ، و از اولیائے کبار ہندوستان است و صاحب خوارق عادات"[۳]، مشکوٰۃ النبوۃ میں شیخ قاضن کے دو کامل خلفا میں میر صاحب کو بھی شمار کیا ہے "یکے میر سید علی قوام کہ کمالات او اظہر ست در نواحی جونپور بسرا ے میراں آسودہ است از وے مردم بسیار ارشاد یافتند"[۴]، میر صاحب میں سوز دروں اور عشق و محبت کی گرمی پائی جاتی تھی جس کے اثرات کم استعداد والے برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے آپ کا معمول تھا کہ جب میدان میں گھومنے پھرنے کے لئے تشریف لیجاتے تو کسی کو ساتھ نہیں لیتے تھے، عموماً اس وقت آپ پر غلبۂ حال ہوتا تھا، کلمات الاولیا میں ہے "ہر گاہ بصحرائے برآمدے، مردم را از ہمراہی خود منع فرمودے، واگر احیاناً کسے برخلاف ایشاں رفتے از آتش جلال بسوختے"

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۲۳ [۲] سفینۃ الاولیا ص ۱۹۱ [۳] اخبار الاصفیا قلمی ص ۹۵ [۴] مشکوٰۃ النبوۃ قلمی ص ۱۹۲،

اور جب وقت یہ کیفیت طاری ہوتی تھی، زبان پر یہ کلمہ ہوتا "محی الدین چنیں می فرمایند وچناں می نمایند"
یہ کہہ کر عجیب عجیب اسرار ورموز بیان فرماتے تھے[1] خزینۃ الاصفیاء میں ہے "سید علی قوام
قدس سرہٗ از ارباب کمال وصاحب جذب وسکر و وجد وحال[2]"، شیخ محمد امین بن فضل اللہ
محبی شامی نے خلاصۃ الاثر میں شیخ تاج الدین سنبھلی متوفی ۱۰۵۰ھ کے ذکر میں ان کے سلسلے
کے مشائخ میں میر صاحب کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے،

السید علی بن قوام الدین الھندی	سید علی بن قوام الدین ہندی نقشبندی
النقشبندی..... کان من	اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے، تصرفاتِ
اکابر اولیاء اللہ تعالیٰ صاحب	عجیبہ اور جذب قوی کے مالک تھے بعض
تصرفات عجیبۃ وجذب	صلحاء کا قول ہے کہ امت محمدیہ علی نبیہا الصلوٰۃ
قوی، قال بعض الصالحین،	والسلام میں حضرت شیخ عبدالقادر
ماظھر فی الامۃ المحمدیۃ علیٰ	جیلانی کے بعد آپ سے جس قدر
افضل الصلوٰۃ واتم السلام	کرامات ظاہر ہوئی ہیں کسی اور
من احد بعد القطب الربانی	سے ظاہر نہیں ہوئیں،
الشیخ عبدالقادر الجیلانی رضی اللہ	
عنہ من الخوارق والکرامات	
والتصرفات مثل ماظھر منہ[3]	

شیخ یوسف بن اسمٰعیل نبہانی نے بھی جامع کرامات الاولیاء میں میر صاحب کے متعلق یہی
الفاظ درج کئے ہیں، اگلزار ابرار میں شیخ محمد بن حسن غوثی نے لکھا ہے کہ آپ کا جذب سلوک پر

[1] کرامات الاولیاء ص ۱۶۱ [2] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۳۲ [3] خلاصۃ الاثر ج ۱ ص ۴۶۶،

غالب تھا، زیادہ زمانہ سکر میں گذرتا تھا، اور کمتر ہوشیاری میں ہوشیاری میں عجیب حال ہوتا تھا جب وجد وکیف اور انوار وتجلیات کی حالت ختم ہوجاتی تو نالۂ حسرت و ندامت آسمان تک پہنچاتے تھے، اور گریہ و زاری اور سوز وگداز سے ایک لحظہ بھی رہائی نہیں ملتی تھی[1]،

تاریخ الاولیاء میں ہے کہ آپ صاحبِ کمال وجد و حال تھے[2]

صاحب نزہۃ الخواطر نے آپ کے اوصاف وکمالات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے،

الشیخ الکبیر الزاھد المجاھد علی بن	شیخ علی بن قوام الدین حسینی سوانی جونپوری
قوام الدین الحسینی السوانی الجونپوری	مشہور بہ علی عاشقاں شیخ کبیر، زاہد ومجاہد
المشھور بعلی عاشقان السرائمیری	اور ہندوستان کے صوفیہ میں مشائخ
کان من کبائر المشائخ الصوفیۃ بالھند[3]	کبار میں سے ہیں،

ان بیانات کی روشنی میں حضرت میر علی عاشقاںؒ کے علم وعرفان، جذب وکیف، زہد و عبادت، کشف وکرامت اور روحانی سوز وساز کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے اور یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ اپنے دور میں ہندوستان کے مشائخِ کبار میں کیا مقام و مرتبہ رکھتے تھے،

میر صاحب نے علوم ظاہری کی تعلیم و تدریس کے بجائے علوم روحانی کی تلقین و ترویج اور ارشاد و ہدایت خلق کو اپنا مشغلۂ حیات بنایا، اور پوری زندگی اسی میں بسر کی، اور اس کا معیار علوم شرعیہ کو بنایا، اور پیروی سنت اور اتباع شریعت کی راہ سے باہر قدم نہیں نکالا،

ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے علی! تو اپنے دروازے پر نوبت بجواتا ہے، اور خلق اللہ کے حال سے بے خبر ہے، عرض کیا یا رسول اللہ! اگر نوبت ہے تو آپ ہی کی، اور دروازہ ہے تو آپ ہی کا، علی بیچارہ درمیان میں کون ہوتا ہے،

---

[1] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۱۰۹ [2] تاریخ الاولیاء ج ۲ ص ۲۳ [3] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴۴،

دینی جمال اور دنیاوی جلال | میر صاحبؒ کی زندگی دین اور دنیا دونوں کے بہترین امتزاج کا نمونہ تھی، آپ اُن خاصانِ خدا میں سے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے " آنا نکہ در فقیری شہنشاہی کردہ اند" آپ کا کاشانہ ایک طرف دنیاوی جاہ و جلال کا منظر پیش کرتا تھا، حشم و خدم تھے، صبح و شام نوبت بجتی تھی، حرم سرا میں چار چار بیویاں تھیں، ارباب دنیا آپ کے آستانہ پر حاضر ہوتے تھے، مگر آپ کسی بڑے سے بڑے انسان کے دروازے پر نہیں جاتے تھے، فتوحات اور نذرانے کا سلسلہ جاری تھا، جو خدام و متوسلین اور مستورات پر خرچ ہوتا تھا، دوسری طرف اہل عرفان و یقین کے لئے زاویہ اور خانقاہ تھا جس میں طالبین و مسترشدین غم روزگار اور فکر معاش سے یکسو ہو کر تزکیۂ نفس اور یاد خدا میں منہمک رہا کرتے تھے، خود میر صاحبؒ کا یہ حال تھا کہ آپ کے صحو پر سکر غالب تھا، اور اکثر اوقات وجد وکیف اور سکر حال کی کیفیت طاری رہا کرتی تھی، مگر اپنے متوسلین کی سربراہی پوری فرماتے تھے، اور وجد و حال سے اس میں خلل نہ پڑتا تھا،

سرائمیر میں مستقل قیام کے بعد میر صاحب کی معاش اور واردین و صادرین کی خدمت کی کیا صورت تھی، اس کی تصریح کتابوں میں نہیں ملتی، غالب گمان ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق آپ کو حکومت کی طرف سے کچھ جاگیریں ملی ہوں گی، بعد کے بعض قرائن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، تیرھویں صدی میں آپ کی اولاد میں ایک بزرگ دیوان فضل علی سرائمیری گذرے ہیں جو آپ کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے، سمات الاخیار کی روایت کے مطابق وہ صاحب ثروت و فراغت اور کئی مواضع موروثی کے مالک تھے[۱]،

فتوحات و عطیات | میر صاحب کے فتوحات و عطیات کی تصریح کتابوں میں ملتی ہے، جو بیوی بچوں اور خدم و حشم کے لئے کافی ہوتی تھی، شاہ عبد الحق صاحب نے لکھا ہے "وصول فتوحات بردے

---

[۱] سمات الاخیار حاشیہ ص ۱۱۴،

متصل و متوالی بودے، و ہرگز منقطع نگشتے[1]، خزینۃ الاصفیا میں بھی یہی لکھا ہے[2]، فتوحات عطیات کے بارہ میں میر صاحب کا عمل اس حدیث پر تھا کہ اگر حرص و طلب کے بغیر مال ملے تو اسے قبول کر لو، بعد میں اگر چاہو تو اپنے استعمال میں لاؤ، اور اگر چاہو تو صدقہ کر دو، اور جو مال اس طرح نہ آئے، اس کے فکر میں نہ پڑو، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اصول تھا کہ آپ خود کسی سے کبھی سوال نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی شخص کچھ دے دیتا تو اسے واپس بھی نہیں کرتے تھے[3]،

میر صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا، بغیر طلب و خواہش کے جو رقم آتی تھی، اسے لے کر حرم سرا اور خدام پر خرچ کر دیتے تھے،

آپنے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ دنیا میں کسی سے سوال نہ کرینگے، چنانچہ چالیس سال سے زائد مدت تک اس عہد پر اس طرح قائم رہے کہ اپنے کسی ملازم کو بھی کسی کام کا حکم نہیں دیا، حتیٰ کہ پیاس کی شدت میں ان سے پانی بھی نہ مانگتے تھے، اخبار الاخیار وغیرہ میں ہے، "گویند کہ درنیاہ چہل سال بیچ خادم امر نکرد"[4] جس انسان کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے خادم تک سے ذاتی خدمت نہ لیتا ہو وہ دوسروں سے مال و دولت کس طرح طلب کر سکتا ہے،

ذمہ داریوں کا ایفا: میر صاحب پر جذب و کیف کا غلبہ تھا، باتیں مجذوبانہ کرتے تھے، مگر زندگی کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے، آمدنی کو دو حصہ کر کے ایک حصہ بیویوں کو دیدیتے اور دوسرا خدام پر تقسیم فرماتے تھے، اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیا میں ہے "چہار منکوحہ داشت و وظیفہ داران بسیار بودند، ہرچہ از فتوح رسیدے بعضے بر وظیفہ داران اللہ قسمت یافتے و بعضے دیگر بر منکوحات[5]"، اس بارے میں آپ کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر تھا کہ سب سے افضل دینار وہ ہے جسے آدمی اپنے بال بچوں پر صرف کرتا ہے، اپنی سواری پر خرچ کرتا

---

[1] اخبار الاخیار ص۲۴۲ [2] خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص۲۲ [3] بخاری و مسلم [4] اخبار الاخیار ص۲۴۲ و خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص۲۲

اپنے دوستوں پر، اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے[۱] ایمان میں کامل ترین وہ مومن ہے، جو سب سے اچھے اخلاق رکھتا ہے، اور تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے، جو اپنی عورتوں کے بارے میں بہتر ہے[۲]

لباس میں تنوع | لباس میں میر صاحبؒ کسی خاص وضع کے پابند نہ تھے، بلکہ جلال و جمال کی کیفیات کے مطابق مختلف قسم کے کپڑے زیب تن فرماتے تھے، اگر نفقود ولیثی کی کیفیت ہوتی تو جبہ و دستار کے جمال میں نظر آتے اور اگر استغنا و بے نیازی کی حالت طاری ہوتی، تو فوجی اور سپاہیانہ لباس کے جلال میں نظر آتے، تقریباً سب ہی تذکرہ نگاروں نے آپکے لباس کے بارے میں اس کی تصریح کی ہے، اخبار الاخیار میں ہے " بلباس مقید نہ بودے، گاہے خرقۂ مشائخ پوشیدے، وگاہے بلباس سپاہیانہ در بر داشتے " (ص۲۲) سفینۃ الاولیاء میں ہے، " لباس ایشاں معین نہ بود، گاہے خرقہ مشائخ پوشیدند وگاہ لباس لشکریاں در بری کردند " (ص۱۹) خزینۃ الاصفیاء میں ہے " مقید بیک حال نبود گاہے خرقۂ مشائخ پوشیدے وگاہے بلباس سپاہیانہ در بر داشتے " (ج۲ ص۲۴) اور گلزار ابرار میں ہے کہ آپ کسی معین لباس کے پابند نہیں تھے، کبھی خرقہ پہنتے تھے، اور کبھی قبا زیب تن کرتے تھے، (اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار ص۲۰)

لباس کا یہ تنوع میر صاحب کی دین دنیا کی جامعیت کو ظاہر کرتا ہے، اس سے دونوں کی شان معلوم ہوتی تھی، خرقہ مشائخ کے زہد و تقوی کا نشان اور سپاہیانہ لباس دنیاوی جاہ و جلال کی علامت تھا، حدیث میں آیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے، کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کی علامت کو دیکھے، امام مالکؒ نہایت قیمتی کپڑے زیب تن کرتے تھے، اور اسے تحدیث نعمت سے تعبیر فرماتے تھے، بعض عارفین کا قول ہے، بعض اوقات مشایخ کو مخصوص لباس کے بجائے دوسرا لباس پہننا چاہئے، تاکہ مخصوص لباس کی وجہ سے خود اپنے کو اور دوسرے کو غلط فہمی نہ ہو، ایسے لباس سے

---

[۱] رواہ مسلم عن ثوبان [۲] رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃؓ

ریاکاری کا احتمال ہے،

دروازہ پر صبح و شام نوبت | میر صاحب کا کاشانہ شان و شوکت میں امرا و سلاطین کا دربار معلوم ہوتا تھا، صبح و شام دروازے پر نوبت بجتی تھی، یہ رسم آپ کے شیخ الشیوخ حضرت شیخ عبداللہ شطاریؒ کے اصول دعوت و ارشاد کے مطابق تھی، شیخ شطاریؒ کے یہاں دستور تھا کہ گھوم پھر کر ارشاد و تلقین کرتے تھے، اور نقارہ بجا کر لوگوں کو خداشناسی کی دعوت دیتے تھے، اور اعلان کرتے تھے کہ جس شخص کو خدا کی تلاش ہو میرے پاس آئے، اسے خدا سے ملا دوں، گویا میر صاحب کے دروازے پر جو نوبت بجتی تھی وہ اللہ و رسول کا بیانگ دہل اعلان تھا، اس سلسلہ کا خواب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال و جواب اوپر گذر چکا ہے،

دنیا داروں سے بے تعلقی | میر صاحب کسی دنیا دار کے گھر پر کبھی تشریف نہیں لیجاتے تھے، اگر کسی معاملہ میں ضرورت پڑتی تو اس کو اپنے یہاں بلا لیتے تھے، مگر اس میں بھی احتیاط کا حال یہ تھا، کہ اپنے کسی خادم کو اس کے یہاں نہیں بھیجتے تھے، بلکہ کسی دوسرے آدمی کو بھیج کر بلوا لیتے تھے، خود فرماتے ہیں:-

"من تا بودہ ام بخانۂ دنیا دارے نرفتہ ام و ہر کسے را از ایشاں بخانۂ خود طلبیدہ ام، خادم بخانۂ کس نفرستادہ ام"

اُن احادیث رسول پر شدت سے عمل کرتے تھے، جن میں علماء اور ارباب علم و فضل کو امراء و اغنیاء کے یہاں بلا ضرورت آنے جانے سے منع فرمایا گیا ہے، اور ان سے تعلق کو علماء کے حق میں فتنۂ عظیم بتایا گیا ہے،

اس بارے میں آپ نے اپنے زمانہ کے ان اہل طریقت کی اس روش پر تنقید کی ہے جو بظاہر دنیا داروں سے نہیں ملتے اور بے نیازی ظاہر کرتے تھے، مگر اندر اندر ربط و ضبط رکھتے تھے، آپ نے ایسی حیلہ بازی کی سخت مذمت کی ہے، فرماتے ہیں:-

"بعضے مردم کہ بخانۂ کس نمی روند، و رقعہ می نویسند و خادم می فرستند، ایں چیزے نیست

سلہ رواہ مسلم عن ثوبانؓ سلہ رواہ الترمذی عن ابی ہریرہؓ۔

"ممنوع تو تیہ بد نشان است ہبر وجہ کہ باشد[۵۵]"

غنا و سماع کے بارے میں اظہار خیال | آپ کے دور میں ایسے صوفیہ بھی تھے، جن کا ذوقِ تصوف نے نغمہ کا رہین منت تھا، اور وہ حظِ نفس کے لئے قوالوں سے فرمائش کرتے تھے کہ فلاں غزل سنائیں، اور اس سماع و غنا پر اُن کو وجد آتا تھا، آپنے ایسے صوفیہ پر بھی سخت تنقید کی ہے اور ان کے اس ذوقِ وجد و کیف پر تعجب ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"مرا عجب می آید ازاں طائفہ کہ بر قوالاں حکم رانند کہ فلاں غزل بگو، این را خوش دارم آنرا خوش ندارم ذوقِ من مقید نیست، مرا ہر چہ بگویند خوش آید، دہم بر آن ذوق کنم[۵۶]"

میر صاحب نے وجد و سماع کے بارے میں غیر محتاط صوفیا، کا احتساب کرتے ہوئے اپنے ذوق کے بارے میں نہایت صفائی سے ظاہر کر دیا ہے کہ میں بھی کبھی کبھی سماع سے ذوق کرتا ہوں، مگر میرا حال ان لوگوں سے جداگانہ ہے، .... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سماع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اور اس بارہ میں آپ کا حال مخدوم شیخ عبدالقادر بن شیخ محمد حسنی جیلانی ملقب بہ شیخ عبدالقادر ثانی "جیسا تھا کہ جب وہ مقام شیخت پر پہونچے تو سماع و غنار سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنے لگے، اور مریدوں کو بھی شدت سے منع کرتے تھے، اور اگر کبھی اتفاق سے سماع سے ذوق کر لیتے، تو گریہ و بکا اور بے تابی سے معلوم ہوتا تھا کہ روح پرواز کر جائے گی[۵۷]"

سوال نہ کرنے کا عہد | حقیقی ترک و تجرید یہ ہے کہ بندہ تمام مخلوقات سے یکسو ہو کر صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھے، کسی دوسرے سے کسی قسم کا سوال نہ کرے، میر صاحب توکل و تجرید کے اس مقام پر فائز تھے، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کیا تھا کہ میں دنیا میں تیرے سوا کسی سے سوال نہیں کرونگا،

---

۵۵ اخبار الاخیار ص ۲۲۲، ۵۶ ایضاً ۵۷ ایضاً ص ۱۹۰۔

اور چالیس سال سے زائد اسی پر قائم رہے، اس مدت میں ابتلا و آزمائش کے بڑے سخت دور آئے، مگر آپ کے عزم و استقلال میں سرمو فرق نہیں آیا، سوال نہ کرنے کے بارے میں احادیث میں سخت تاکید آئی ہے،

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے عہد و پیمان کرے کہ میں کسی سے سوال نہیں کروں گا، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت لیتا ہوں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد سے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا[۱] حضرت عوف بن مالک اشجعی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم نو یا آٹھ یا سات نفر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیعت لی کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گے، پانچ فرض نمازیں ادا کرو گے، اللہ و رسول کی اطاعت کرو گے، اور ایک بات آہستہ سے یہ فرمائی کہ کسی آدمی سے کسی چیز کا سوال نہ کرو گے، حضرت عوف بن مالک کا بیان ہے کہ میں نے ان میں سے بعض حضرات کو دیکھا کہ اگر ان کا چابک گر جاتا تھا، تو کسی سے اٹھانے کا سوال نہ کرتے تھے، اور کہتے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم دنیا میں کسی سے سوال نہیں کریں گے[۲]

تقسیم اوقات اور خدمتِ خلق | خدمتِ خلق مشائخِ عظام کا خاص شعار ہے، اور وہ افضل الاشغال خدمۃ الناس کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں، میر صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا، اپنے طالبین اور مسترشدین کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے، فجر کے بعد سے اشراق تک اور عصر سے مغرب تک مخصوص کیفیت رہتی تھی، اسلئے ان اوقات میں کسی سے نہیں ملتے تھے ان کے علاوہ پورا دن خدمتِ خلق میں صرف کرتے تھے، اخبار الاخیار میں آپ کا قول درج ہے۔

---

[۱] رواہ ابو داؤد عن ثوبانؓ [۲] رواہ مسلم

"من خادم فقرائم، تمام روز خدمت گاری ایشاں می کنم، غیر آنکہ درمیان عصر و مغرب مرا معذور دارند، و مزاحم احوال من نشوند کہ دراں یک ساعت بحال خود باشم"[۵۱]

خلاصۃ الاثر اور جامع کرامات الاولیا میں ہے کہ میر صاحب کے یہاں قاعدہ تھا کہ چاشت کے وقت تک کوئی شخص اُن کے پاس نہ جائے، اس وقت ان پر جذب کا غلبہ رہتا تھا، لوگ اس سے واقف تھے، اس لئے کوئی شخص اس وقت ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا تھا[۵۲] اس سلسلہ میں یہ حدیث پیش نظر رہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرے خاص خاص اوقات ہیں جن میں مقرب فرشتہ کی بھی گنجایش نہیں ہوتی،

کرامات وخوارق | ہندوستان قدیم زمانہ سے سادھوؤں، سنتوں کی سرزمین رہی ہے، جو تپسیا اور ریاضت سے کرتب دکھا کر عوام کو مسحور کرتے رہے ہیں، اس لئے اُن کے مقابلہ میں یہاں کے مشائخ اور بزرگان دین نے بھی بعض اوقات ضرورۃً کرامتیں ظاہر کی ہیں، جن کا مقصد یہاں کے عوام کو اُن کے قدیم اور موروثی ذہن و مزاج کے پیش نظر راہ راست پر لانا ہوتا تھا، انھوں نے اُن کے ذریعہ ہزاروں انسانوں کو خدا سے ملایا ہے، میر صاحب کے ہندی تذکرہ نویسوں نے اجمالی طور سے اُن کے کشف و کرامت اور خوارق کا تذکرہ کیا ہے، صاحب اخبار الاصفیا نے اُن کو "صاحب خوارق عادات" لکھا ہے[۵۳]، اخبار الاخیار خزینۃ الاصفیا اور اخبار الاصفیا میں صرف بعض کرامتیں مذکور ہیں،

وفات ۹۵۰ھ | میر صاحب کا وصال سلطان نصیر الدین ہمایوں متوفی ۹۶۳ھ کے دور سلطنت میں ۹۵۰ھ میں بمقام سرا سیر ہوا، اور وہیں دفن ہوئے، اخبار الاخیار میں ہے:-

---

[۵۱] اخبار الاخیار ص ۲۲۲ [۵۲] خلاصۃ الاثر ج ۱ ص ۶۹۴، وجامع کرامات الاولیا، ج ۲ ص ۲۰۲،
[۵۳] اخبار الاصفیا ص ۹۵،

" قبر او در جونپور است، وفات در سنہ خمسین وتسعمائۃ (ص ۲۲۲)

خزینۃ الاصفیاء میں بھی یہی تاریخ وفات درج ہے :-

" وفات آن جامع الکمالات بقول صاحب اخبار الاخیار نہصد و پنجاہ ہجری است"

"ومزار پرانوار در جونپور"   (ج ۱ ص ۴۲۳)

کرامات الاولیاء میں ہے :-

" وفاتش در سنہ نہصد و پنجاہ واقع شدہ و مرقد منورش در جونپور است" (ص ۴۲)

سفینۃ الاولیاء میں ہے :-

" وفات ایشاں در سال نہصد و پنجاہ ہجری بودہ ، و قبر او در حوالی جونپور در موضع کہ توطن داشتہ اند، و آن سرائے میراں مشہور است، ایزار و متبرک (ص ۱۹۱)

یہی تاریخ وفات تاریخ الاولیاء (ج ۲ ص ۲۳۸) اور سمات الاخیار (حاشیہ ص ۱۲ درج ہے، مگر اخبار الاخیار کے بعض مطبوعہ نسخوں میں غلطی سے خمسین (پچاس) کے بجائے خمس (چھپ گیا ہے، اور یہ تصحیف بہت پہلے سے اس کے بعض قلمی نسخوں میں چلی آتی ہے، اسی ک بعد کے بعض تذکرہ نگاروں نے بھی آپ کی تاریخ وفات ۹۰۵ھ لکھدی ہے، ہمارے علم سب سے پہلے گلزار ابرار میں یہ غلطی ہوئی ہے، (اذکار ابرار ص ۲۰۹)

اس کے بعد اخبار الاصفیاء میں بھی "نہصد و پنج ایجانی شد" لکھ گیا (نخ قلمی) اور ان سے برخلاف نزہۃ الخواطر میں رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے ۹ صفر ۹۵۵ھ درج ہے، (ج ۴ ص ۲۰ یعنی تسعمائۃ سے پہلے خمسین" صحیح اور خمس غلط کو ملا کر خمس وخمسین وتسعمائۃ" بنا دیا گیا، ہندسہ میں لکھے ہوئے اعداد میں اس طرح کی غلطیاں اکثر ہو جاتی ہیں، اسی لئے علمائے رجال و ت

تاریخ وسعۃ کے لفظوں میں لکھتے ہیں، اسی قسم کی غلطی میر صاحب کے پہلے مرشد شیخ قاضنؒ کے سنہ وفات میں ہوئی ہے، جو ۹۰۲ھ ہے، جیسا کہ انتصاح کے حوالے سے نزہۃ الخواطر میں درج ہے :-

"مات فی ثالث صفر سنۃ اثنتین وتسعین وثمانمائۃ،" (ج ۴ ص ۱۴۲)

مگر مشکوٰۃ النبوۃ میں سنہ ۹۰۲ھ درج ہے :-

"وفات ایشاں بتاریخ سیوم ماہ صفر سنۃ اثنی وتسعمائۃ" (ص ۱۰۲ قلمی)

اس میں "ثمان مائۃ" سے صرف نظر کرتے ہوئے "اثنتین وتسعین" کو "اثنی وتسعمائۃ" بنادیا گیا ہے، مفتی غلام سرور لاہوریؒ نے میر صاحب کی تاریخ وفات پر دو قطعات لکھے ہیں، جن میں سنہ ۹۵۰ھ درج ہے،

یافت زحق رتبۂ عالی بجلد | سید معصوم معلی علی
سال وصالش چو بجستم زدل | گفت کہ "مخدوم معلی علی"
۹۵۰ھ

زد نیا شد بفردوس معلیٰ | علی مخدوم عالی شاہ معصوم
وصال او "علی میر شریف" است | دگر فرما "علی سلطان مخدوم"[۱]
۹۵۰ھ | ۹۵۰ھ

میر صاحب کے چار بیویاں تھیں، جن سے اولادیں ہوئی ہونگی، مگر آپ کی کسی اولاد کا ذکر نہ مل سکا، البتہ آپ کی نسل سے گذشتہ صدی میں ایک بزرگ دیوان سید فضل علی سرا سپری گذرے ہیں، جن کا تذکرہ صاحب سمات الاخیار نے کیا ہے، کہ آپ سید علی قوام شاہ کی اولاد سے تھے، اور ان کے خاندانی

---

[۱] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۴۴۔

کے صاحب سجادہ اور حضرت محبوب الحق شاہ فصیح الدین قدس سرہ (متوفی ۱۲۰۰ھ) کے خلیفہ بھی تھے، صاحب ثروت و فراغت تھے، کئی مواضع موروثی کے مالک تھے، شاہ فصیح الدین نے اپنی بیٹی کی شادی سید فضل علی سے کی تھی۔[1]

چند مرید و خلفاء میر صاحب نے طلب و اکتساب کے بعد پوری زندگی سرائمیر میں ارشاد و تلقین میں بسر کی، اور ہندوستان کے مشائخ کی طرح آپ نے دیار پورب میں بڑا تبلیغی کام کیا، بہار میں شیخ قاضنؒ سے کسب فیض کرنے کے بعد جونپور میں شیخ بہاء الدین سے خلافت پائی، اور شہر جونپور میں مسند مشیخت بچھائی، پھر کچھ دنوں کے بعد نظام آباد میں شیخ عبدالقدوس کی خدمت میں حاضر ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور سرائے میر کو مرکز ارشاد و تلقین بنایا، اور بقول صاحب مشکوٰۃ النبوۃ "از وے مردم بسیار ارشاد یافتند" ان مردم بسیار میں جن چند بزرگوں کے نام و حالات مل سکے ہیں، وہ یہ ہیں،

شیخ مبارک محمدی ماہلیؒ شیخ مبارک بن خیرالدین محمد ماہلی جونپوری ؒ شیخ صدرالدین قریشی ظفرآبادیؒ کی اولاد سے ہیں، ان کے والد شیخ الدین ظفرآباد سے ترک وطن کرکے ماہل (اعظم گڑھ) چلے آئے، اور اس کے پاس ہی اپنے نام پر خیرالدین پور گاؤں آباد کرکے وہیں باپ بیٹے رہنے لگے، شیخ مبارک بعض کتابیں اپنے والد سے پڑھ کر جونپور گئے، اور وہاں کے اساتذہ و شیوخ سے تعلیم کی تکمیل کی، اور طریقت کی تلقین و تربیت اپنے والد سے پائی، اس زمانہ میں میر علی عاشقانؒ کی روحانی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، دور دور کے تشنگان علم و عرفان ان کے چشمۂ صفا سے سیراب ہو رہے تھے، جو شیخ مبارک کے گویا پڑوسی تھے، اس لئے انھوں نے ان کی طرف رخ کیا، اور ایک زمانہ تک ان کی خدمت و صحبت میں رہکر مرتبۂ مشیخت کو پہونچے، میر صاحب نے

[1] سبحات الاخیار ص ۱۱۱ و ۱۱۲،

لائق مسترشد و تلمیذ کو محمدی کے لقب سے نوازا، شیخ مبارک نے میر صاحب سے فیض حاصل کرنے کے بعد علائق دنیا سے یکسو ہوکر زہد و عبادت کو شیوۂ زندگی بنایا، اور پوری زندگی ارشاد و تلقین میں بسر کردی، آپ کی ذات سے بہتوں نے فیض حاصل کیا، ۱۴ شوال ۹۰۳ھ کو جونپور میں وفات پائی، "فخر زمانہ" تاریخ وفات ہے، تجلی نور میں آپ کے حالات موجود ہیں[۱]

قاضی حبیب اللہ عثمانی گھوسوی | شیخ قاضی حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین بن یحییٰ بن شرف بن نصیر الدین بن مفتی حسین عثمانی اصفہانی گھوسوی کا سلسلۂ نسب حضرت عمر بن عثمان بن عفان اور بقول بعض حضرت ابان بن عثمان بن عفانؓ تک پہونچتا ہے، فقہ، اصول اور علوم عربیہ (نحو، صرف، ادب، لغت وغیرہ) میں اپنے دیار کے ممتاز علماء میں اور علوم شرعیہ کے فاضل تھے گھوسی (اعظم گڑھ) کے قاضی مقرر ہوئے، اور پوری زندگی اسی عہدہ پر اسی مقام میں گذار دی، صاحب نزہتہ الخواطر نے شیخ علی عارف کے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے تصریح کی ہے، کہ قاضی صاحب موصوف نے طریقت کی تعلیم و تلقین شیخ علی بن قوام الدین جونپوری سے حاصل کی تھی[۲]، بعد میں آپکے خاندان میں شیخ عطاء اللہ عثمانی گھوسوی متوفی ۱۰۶۱ھ بڑے عالم و بزرگ گذرے ہیں۔

شیخ عبد الصمد سرہندیؒ | شیخ عبد الصمد سرہند کے رہنے والے تھے، جو سوانہ کے قریب ہے، اس اعتبار سے میر صاحب کے ہم وطن تھے، فقہ، اصول اور عربیت کے ممتاز عالم تھے، صاحب نزہتہ الخواطر نے رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے لکھا ہے، کہ شیخ عبد الصمد نے شیخ علی بن قوام الدین جونپوری سے ملاقات کی، اور ان سے اکتساب فیض کیا[۳]

شیخ مبارک جھنجھانوی جونپوریؒ | شیخ مبارک بن عبد المقتدر بن فاضل علوی جھنجھانوی جونپوریؒ طریقت و روحانیت میں اپنے علو مرتبت کی وجہ سے "بالا دست" کے لقب سے مشہور تھے، شیخ عبد الرزاق

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۴ ص ۲۷۰، [۲] ایضاً ج ۴ ص ۵۸، [۳] ایضاً ص ۱۸۲

جھنجھانوی کے چچا زاد اور رضاعی بھائی تھے، ظاہری و باطنی کمالات و فضائل کے جامع تھے، آپ کی ذات سے خلق اللہ کو بڑا فیض پہونچا، گلزار ابرار میں ہے کہ آپ نے طریقۂ شطاریہ سید علی ابن قوام الدین شطاری جونپوری سے حاصل کیا، اور مدتوں ان کی خدمت و صحبت میں رہ کر فیض اٹھایا، آپ کا مولد و مدفن دونوں جھنجھانہ ہے[۱] آپ کے خلفاء میں شیخ الہ بخش شطاری گڈھ مکتیسری متوفی سنہ ۱۰۰۲ھ بڑے صاحب فضل و کمال گذرے ہیں، جو شیخ تاج الدین سنبھلی کے مرشد تھے، اور محبی نے خلاصۃ الاثر میں شیخ تاج الدین سنبھلی کے تذکرہ میں ان کے شیخ الشیخ علی بن قوام الدین سرائمیری کا ذکر بھی کیا ہے،

قاضی منجھلہ جونپوری آپ علم فقہ اور علوم عربیہ کے ممتاز علماء میں تھے، جونپور کے قاضی مقرر ہوئے اور ایک مدت تک اس عہدہ پر رہکر خدمات جلیلہ انجام دیں، اس کے الگ ہونے کے بعد شیخ علی بن قوام الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے طریقۂ شطاریہ عشقیہ حاصل کیا،[۲]

شیخ منجھن شطاری کمال پوری آپ نہایت متقی و صالح عالم تھے، شرعی امور میں سخت دار و گیر فرماتے تھے، رسالہ عاشقیہ کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں ہے کہ شیخ منجھن نے طریقۂ شطاریہ عشقیہ میر علی بن قوام الدین جونپوری سے حاصل کیا، اور ایک مدت تک اُن کی خدمت میں رہکر مرتبۂ کمال کو پہونچے،[۳]

---

[۱] اذکار ابرار ص ۲۳۶، [۲] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۶۷، [۳] ایضاً ص ۳۷۰،

حیات شبلیؒ

حجۃ الاسلام علامہ شبلیؒ کے سوانح و حالات اور اُن کے علمی و عملی کارنامے، (مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ) (زیر طبع)

عروس البلاد بمبئی کی تاریخی سرگذشت

از

جناب انور احمد صاحب سوپاروی

بمبئی مغربی ہند کی اس ساحلی پٹی پر واقع ہے جسے مہابھارت نے اپرانت اور عرب سیاحوں نے کنکن اور کمکم لکھا ہے، اور جو عہد قدیم ہی سے دنیا کی مختلف اقوام کی تجارتی سرگرمیوں کی آماجگاہ رہی ہے، اجنبی قومیں اس خطہ میں آکر ایک دوسرے سے روشناس ہوئیں، اس کی بندرگاہوں نے صدیوں تک تجارتی قافلوں کا خیر مقدم کیا، مصر، عراق، یمن، یونان، چین اور ایران کے قدیم باشندے تجارت کے سلسلہ میں یہاں آئے، اس طرح دنیا کی قدیم ترین تہذیب کے پاسبانوں کو ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کا نہ صرف موقع ملا، بلکہ ایک دوسرے کے ثقافتی اثرات سے بھی متاثر ہوئے،

درحقیقت بمبئی جسے ہندوستان کا اسکندریہ تصور کیا جاتا ہے[۱]، اس کی قدیم تاریخ تاریکی میں ہے، اور اب تک جن حضرات نے اس خوشنما بستی کے ماضی کو کریدنے کی کوشش کی ہے، وہ اس کی تاریخ کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے ہیں، ایم، ایڈورڈز (S. M. Edwardes) نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کا آغاز ہی اس جملہ سے کیا، کہ بمبئی کی قدیم تاریخ وقت کی تاریکی میں گم ہے[۲]، اس کی وجہ تاریخی وسائل کی کمیابی ہے، بمبئی کا تعلق براہ راست

---

۱ The Origin of B'bay page 5 By Dr. G. Dacunha

۲ The Rise of B'bay by S. M. Edwardes

علاقہ کوکن سے ہے اور چونکہ خود کوکن کے بعض تاریخی پہلو اب بھی صیغۂ راز میں ہیں، اس لئے اس "اقدادہ" دور خطہ کے تاریخی انکشافات کی کیونکر توقع کی جاسکتی ہے، جو عہدِ قدیم میں سات جدا جدا جزائر پر مشتمل رہا ہے، چنانچہ غیر ملکی اقوام کی آمد تک کی تاریخ کوکن کا انطباق بمبئی کی تاریخ پر بھی کیا جاسکتا ہے،

عہدِ عتیق کے باشندے ثمرون کولی

ماہرین کا قیاس ہے کہ اول اول جب بنی نوع انسان نے ان جزائر میں بود و باش اختیار کی، وہ غالباً پتھر کا زمانہ رہا ہوگا، اس مفروضہ کی تصدیق بیک بے (Back Bay) اور کلابہ ضلع کے ساحلی علاقہ سے سنگی ہتھیاروں کی دریافت سے ہوتی ہے، یہ ہتھیار یورپ کے ان انسانوں کے ہتھیاروں سے مشابہت رکھتے ہیں، جو غاروں میں رہتے تھے، تاہم اس کی پوری تحقیق مشکل ہے، کہ یہ لوگ کہاں سے وارد ہوئے، اور کس قوم سے تعلق رکھتے تھے،؟ یہ محض ایک قیاس ہے، کہ وہ جنوبی ہند سے ترک سکونت کرکے یہاں آکر بستے تھے[1]

سب سے قدیم ترین حوالہ بطلیموس (Btolemy) (۱۵۰ء) کی تصنیف سے ملتا ہے جس نے اس مجموعۂ جزائر کو ہیپٹا نیسیہ (Heptanesia) کے نام سے تعبیر کیا ہے[2]، نامور مورخ لاسین (Laasex) کی رائے میں ہیپٹا نیسیہ سے مراد جزائر بمبئی ہی ہیں[3] اور کوکن کو اریک (Ariaka) کہا ہے، تاہم اس عہد میں بمبئی میں بجز چند ماہی گیروں کے تمدنی زندگی کے واضح آثار کا کوئی پتہ نہیں چلتا، ڈاکٹر ڈاکنا کی تحقیق ہے کہ یہ ماہی گیر (کولی) در اصل دراوڑی یا نیگرو سے بڑی حد تک مشابہ تھے[4]، امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہندوستان

---

[1] Bombay city Gazetteer Vol. II P. 1/2

[2] The Rise of Bombay By S. M Edward P. 3

[3] The origin of Bombay Dr Dacunha P. 23

[4] The origin of Bombay P. 40

کے مغربی ساحل کے بعض مقامات میں متوطن ہوگئے تھے، اُن کی نسل کے لوگ آج بھی بکثرت پائے جاتے ہیں، اور کولی کے نام سے موسوم ہیں،

اس سلسلہ کی ایک بات غور طلب اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے، وہ یہ کہ ضلع تھانہ کے ساحل پر بسنے والے کولیوں، کو سون کولی (Son-Kolis) یا شرون کولی (Sharon Kolis) کہا جاتا ہے، اور پرن کی کہانیوں (بدھ مت) میں شمالی کوکن کو "شرون یا سون اپرانت" لکھا جاتا ہے[۱]، اور سون یا سوناگ (Sonag) ڈراویڈی زبان میں یاون غیر ملکی (Yavan) یا گریک (Greek) کے ہم معنی ہے[۲]، اس زمانہ میں غیر ملکی عناصر کا اثر و رسوخ کافی بڑھ گیا تھا، اس لئے الفاظ کی اس غیر معمولی مماثلت سے ان کولیوں اور غیر ملکی قوم کے درمیان کسی ایسے رشتہ کا گمان ہوتا ہے، جو تاریخی نقطۂ نظر سے مزید تحقیق طلب ہے، ڈاکٹر ہا ی کہنا کولیوں کو ڈراویڈی نسل سے بتلاتے ہوئے لکھتا ہے، کہ کولی ذرحیاچل کے میدان مرتفع (حدب) (Plateau) گجرات اور کوکن کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، بمبئی میں یہ لوگ تین مختلف فرقوں پر مشتمل ہیں، جو ڈونگری سے مجگاؤں کے وسطی علاقے میں رہتے ہیں، لفظ کولی[۳] سے متعلق مختلف تصریحات ملتی ہیں، بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ سنسکرت لفظ کولا بمعنی پالتو سور سے مشتق ہے، جو آریہ قوم نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کے لئے حقارۃً استعمال کیا تھا، بعض کہتے ہیں کہ کول کشتی سے مناسبت رکھتا ہے، اور پھر خود ان کا پیشہ (ماہی گیری) کا تعلق بھی براہ راست کشتی سے بنتا ہے

---

[۱] Thana Gazetteer vol XIII Part II 1882 P. 407

[۲] سون کولی" ونیر ندی کے جنوب میں ساحلی علاقہ پر آباد ہیں، جو سمندر پار کی کسی قوم سے خونی رشتہ کی وجہ سے الگ سمجھے جاتے ہیں، یہ لوگ قد میں چھوٹے، مضبوط، قدرے خوبصورت ہ

رکھتا ہے، اور پھر خود ان کا پیشہ (ماہی گیری) کا تعلق بھی براہ راست کشتی سے ہے، یہ کولی لفظ کول (Kulkh بمعنی گروہ خیل) سے بنا ہے، یعنی ہم خیل (Clanman) جیسا کہ لفظ کُنبی (Kunbi) کُٹمب (Kutumb) بمعنی خاندان سے مشتق ہے[۵]، مگر چونکہ اس لفظ کا مسلمانوں کی آمد سے قبل تک رواج نہیں تھا اور راجپوتانہ شمالی گجرات میں ناپسند کیا جاتا تھا، اس لئے قیاس ہے کہ یہ ترکی لفظ کولیہ (Kolah) سے بنا ہوگا[۶]،

یہ جزائر (بجز سالیسٹ کے) صدیوں تک سنسان اور غیر آباد رہے[۳]، بعض ماہرین کا خیال ہے، ہزاروں سال قبل اس سرزمین میں زلزلے آئے ہوں گے، جن کے اثر سے یہ سات جدا جدا جزیروں میں منقسم ہوگئی، انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں پرنسس ڈاک کے لئے جب کھدائی کی جارہی تھی، تو ایک زمین دوز جنگل کے نشانات کا پتہ لگا، یہ جنگل سطح زمین سے بتیس فٹ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۴) بعض موٹے ہوتے ہیں، اور مرہٹی بولتے ہیں، اور اُن کی بول چال میں بعض الفاظ نہ صرف اجنبی ہیں، بلکہ ناقابلِ فہم پائے جاتے ہیں، گفتگو بلند آواز میں کرتے ہیں، چاول اُن کی مرغوب غذا ہے، وہ مذہباً ہندو ہیں، اور اُن کے دیوی دیوتاؤں میں کھنڈوبا، بھوانی، بھیسرو، بابا دیو، دیوی، کالکائے، جیدا، اور ماہوبائی مشہور ہیں۔

۳ـہ The Rise of Bombay By S. M. Edwardes P. 8

۴ـہ بمبئی کے کولیوں میں مورے اور چالکے خاندانی القاب پائے جاتے ہیں، جو موریہ اور چالوکیہ کی بگڑی شکلیں ہیں، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ موریہ اور چالوکیہ خاندان ان کولیوں کی سماجی زندگی پر کس قدر اثر انداز ہوئے تھے، یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ یہ خاندان (موریہ اور چالوکیہ) کولی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔

۵ـہ The origin of Bombay P. 40-41

۶ـہ Bombay city Gazetteer PT P. 142

کی گہرائی میں نکلا، اور مجموعی طور پر ۲۸۲ درخت ملے جن میں دو سو تیئیس[۲۲۳] درختوں کی جڑیں زمین میں پیوستہ تھیں، اور ایک سو انسٹھ[۱۵۹] درخت زمین پر اوندھے پڑے تھے، مگر اُن کی بھی جڑیں زمین میں سلامت تھیں[۱]۔

تاریخ دور اول کا آغاز سب سے اول یہ علاقہ اشوک کی وسیع قلمرو میں شامل تھا جس کے بعد جنوبی ہند کا سب سے طاقتور اور نامور خانوادہ ساتواہن برسر اقتدار آیا، اُن کے زمانہ میں بھی یہ جزائر (سالسٹ کے سوا) سنسان اور غیر آباد پڑے ہوئے تھے[۲]، البتہ سالسٹ میں واقع کنہری کے غار ان کے دور حکمرانی کی تاریخی یادگار ہیں[۳]، یہاں کے گپھا نمبر ۱۴ - اور ۸۱ میں یگن شری ساتکرنی گوتمی پتر کے سنگی کتبے بھی ملے ہیں[۴]، اشوک کے عہد میں یہ مقام بدھ مذہب کی تعلیمات اور علوم کی اشاعت کا سرچشمہ تھا، یہاں سے بدھ مذہب کے بھکشو آس پاس کے علاقوں میں جاکر نئے مذہب کے پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے تھے۔

ساتواہن کے زوال کے بعد چوتھی صدی عیسوی میں شمالی کوکن کی تاریخ مشتبہ ہو جاتی ہے[۵]، بلاشبہ گپت خاندان کی سلطنت کی حدود جنوب میں دور تک چلی گئی تھیں لیکن شمالی کوکن کا جہاں تک تعلق ہے، اُن کی حکمرانی سے متعلق کوئی تاریخی حوالہ نظر نہیں آتا، البتہ شمالی کوکن کے بعض مقامات سے اُس کے سکے ملے ہیں، پانچویں صدی بھی اس خطہ کی تاریخ کا دھندلا سا عکس پیش کرتی ہے، اس صدی میں تری کوٹک ("Trai KuTeKa") نامی ایک غیر معروف

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۸) [۷] قلابہ، [۸] بمبئی، [۹] مجگاؤں، [۱۰] پریل، [۱۱] ورلی، [۱۲] ماہم، [۱۳] سایَن،

[۱۴] The Gazetteer of Bombay city and island Vol II 1909 (ص ۱)

[۱] ایضاً ص ۶، [۲] Dynasties of the Kanarese Districts By Dr Fleet P. 24

[۳] Thana Gazetteer Vol XIII P 412

[۴] (بقیہ حاشیہ) [۵] Gazetteer Bombay city Part II Vol II P. 4

خاندان حکمراں نظر آتا ہے[1]

راشٹر کوٹ کے راجہ کرشن کے سکے | راشٹر کوٹ خاندان کے ایک حکمران کرشن (۳۷۵ تا ۳۰۰ء) کے سکے بمبئی (۱۸۸۱ء) اور سالسٹ (جون ۱۸۸۲ء) میں ملے، جن سے یہاں کے حکمراں خاندان کے دور حکمرانی میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی ہے[2]، ڈاکٹر فلیٹ (Dr Fleet) کی رائے ہے کہ یہ سکے کالاچوری خاندان کے کرشن راجہ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اس سے اس خانوادہ کے دور حکمرانی کے بارہ میں صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی[3]، البتہ اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں انسانوں کی آبادی اس خطۂ زمین پر موجود تھی، یہ سکے اپریل ۱۸۸۱ء میں کاول (Cannel) اسٹریٹ کے قریب پائے گئے تھے، اس مقام پر دوسرے سکوں کے بھی ملنے کے قوی امکانات تھے، مگر زمین کے بنیا مالک کے اعتراض کی بنا پر مزید تلاش سے احتراز کیا گیا، ان میں سے دو سکے ایشیاٹک سوسائٹی کی ایک نشست (۱۵ جولائی ۱۸۸۱ء) میں نمائش کے لئے رکھے گئے تھے[4] ایک سکہ کی عبارت حسب ذیل تھی،

"پرم مہا شور ماتا پتری پادو نو دھاتر شر، کرشن راجہ"

کرشن راجہ کے تعلق مختلف تاویلیں ملتی ہیں، مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کا کس خانوادہ

---

1. The Gazetteer of Bombay city and island vol II P. 7-8
2. Thana Gazetteer vol II P. 419
3. Dynasties of the Kanarese Districts by Dr Fleet P. 296
4. The origin of Bombay P. 7

سے تعلق تھا، وہ راشٹر کوٹ یا کالا چوری خاندان کا حکمراں تھا، اور اسکے سکوں کی بناوٹ گرکیہ سکوں کی ساخت سے بڑی حد تک مشابہت رکھتی ہے[۱]

پوری مودیہ کا خوبصورت پایۂ تخت | راشٹر کوٹ خاندان کے بعد غالباً چھٹی صدی عیسوی میں موریہ خاندان شمالی کوکن (مع جزائر بمبئی) پر قابض ہو گیا، ان کا پایۂ تخت جزیرۂ پوری (ایلی فنٹا) تھا، جہاں غاروں میں سیاحوں اور محققین کی دلچسپی اور کشش کا بڑا تاریخی مواد ہے، اگارشیہ ڈی اورٹا (Rase a iade orta) نے ۱۵۳۴ء میں اس خوبصورت جزیرہ کی سیاحت کی تھی، وہ لکھتا ہے:-

"یہاں پوری نامی جزیرہ میں ایک خوبصورت پگوڈا (Pagoda) ہے، اور ہم اسے ہاتھی کا جزیرہ (Island of The Elephant) کہتے ہیں، یہاں ایک بلند پہاڑی کو کاٹ کر اس کے اندر ایک خانقاہ بنائی گئی ہے، جس کی دیواروں میں سنگ تراشی کے نہایت عمدہ اور نفیس نمونے ہیں، جو قابل دید ہیں"[۲]

سماو بوٹلہو (Simao Botelho) رقمطراز ہے کہ جزیرہ پوری ۱۵۴۳ء میں جاو پیریز (Jao pirez) نامی ایک عیسائی کو ٹھیکہ پر دیا گیا[۳]، اس جزیرہ کے بارہ میں پرتگالی سیاحوں کے بیانات میں بڑی دلچسپ باتیں ملتی ہیں، فرائر اوڈرک (Frair oderic) ۱۳۲۲ء میں لکھتا ہے:-

---

۱۔ The origin of Bombay P. 13

۲۔ The Rise of Bombay Dr Dacunha P. No 18

۳۔ ایضاً ص نمبر ۲۱

"یہ (پوری) قدیم زمانہ میں ایک مشہور مقام تھا، یہ شہر دراصل پورس نے آباد کیا تھا جس نے سکندر اعظم سے جنگ کی تھی"[۱]

مگر گاوشیہ ڈی اودا کی رائے ہے کہ یہ (پوری) چینیوں نے بسایا تھا[۲]، اور گیہ بالبی (Gasparo Balbi) نے ۱۵۸۰ء میں اس کے بابت لکھا ہے، کہ سکندر اعظم نے اپنی فتوحات کی آخری حد پر یہ شہر بسایا تھا[۳]، موریہ خانوادہ کی اس خوشنما بستی پوری کے متعلق ہماری معلومات میں چالوکیہ خاندان کے ساتویں صدی عیسوی کے ایک کتبہ سے اضافہ ہوتا ہے، جس میں پوری کو "مغربی سمندر کی لکشمی" کہا گیا ہے، اور جس پر پولیکسی (Pulakesi) نے سیکڑوں بحری جہازوں کے ساتھ حملہ کیا تھا" اس عبارت سے پوری کے محل وقوع کی بارہ میں اختلاف رائے کا خاتمہ ہوجاتا ہے، وہ عبارت یہ ہے،

"پوری ایک دلکش اور دولت وثروت میں مشہور زمانہ شہر تھا، اورلب ساحل پر آباد تھا"

"اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مورہ بندر ہی قدیم "پوری" تھا، پچھلی صدی میں پورٹ ٹرسٹ کے قیام کے وقت جو کام ہورہا تھا، اس کے دوران میں تانبے کی دو تختیاں دستیاب ہوئی تھیں جو بدقسمتی سے ضائع ہوگئیں، ؟ اس کے علاوہ سونے کی انگوٹھی میں جڑی ہوئی یاقوتی رنگ کی ایک مہر بھی ملی تھی، جس پر نار ائن منقوش تھا، یہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے"[۴]

۱؎ The origin of Bombay by Dr Dacunha P.No 21

۲؎ The origin of Bombay P. 21 ۵

۳؎ ایضاً، ۴؎ The origin of Bombay P. 22

موریہ خاندان کی پُرسکون اور خوش حال حکمرانی شاید چالوکیہ کے لئے ناقابل برداشت تھی، چنانچہ کرتی ورمن اوّل (۵۶۷ء تا ۵۹۱ء) نے شمالی کوکن پر فوج کشی کردی، اور اس کے بیٹے پل کیشن دوم نے موریہ سلطنت کا کلی طور پر قلع قمع کردیا[1]، پوری قدرتی مناظر کی خوبصورتی و دلکشی اور اقبال مندی کے باعث اس زمانے میں مشہور تھا، تاہم اس مقام کی بابت اختلاف رائے ہے جیساکہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، پروفیسر ولسن (Wilson) کی تحقیق ہے کہ پوری ضلع تھانہ میں واقع تھا، اور سرجیمز کیمپ بل (Sir James Campbell) اسے ایلی فنٹا جزیرہ کے شمال مشرق میں واقع مورے بندر سے تعبیر کرتے ہیں، بہرحال جزیرہ ایلی فنٹا کی مشہور گپھاؤں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، کہ جزیرہ پوری ہی موریہ سلطنت کا مرکزی شہر رہا ہوگا، جیساکہ کوسن (Cousens) نے اپنی رپورٹ میں توضیح کی ہے[2]۔

چالوکیہ کی سلطنت پر نویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں زوال کے بادل چھانے لگے، چنانچہ ۸۱۰ء میں شمالی کوکن کے سلہار[3] خاندان کو عروج ہوتا گیا، جس کے بیس[20] حکمرانوں

---

[1] Thana Gazatteer Vol II P. 412

[2] Bombay Gazatteer Jani 1901

[3] سلہارا، شیلاہار، شریلار، شیلار، اور سیلار، دراصل ایک ہی خانوادہ کے نام ہیں، ان کے کتبوں میں بھی یہی نام ملتے ہیں، لاسین (Lassen) کی رائے میں سلہارا افغانی ہیں، افغانستان میں (Silar) کا فرقہ اب تک موجود ہیں، (Thana — Gazetteer Vol XIII P II P 422

لفظ سلہارا کس زبان سے تعلق رکھتا ہے؟ اس کے متعلق قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، غالباً یہ غیر سنسکرت مراٹھی لفظ ہے، مراٹھی میں شیل (Shel) بکرے کے لئے بولا جاتا ہے، اور شیلار چرواہا ( )

شمالی کوکن (مع جنا ربمبئی) پر ۸۱۰ء تا ۱۲۶۰ء حکومت کی، اُن کے زمانہ میں تھانہ، سنجان، سوپارہ، کلیان، بسین، اُرن، اور چول وغیرہ مشہور شہر اور تجارتی مرکز تھے، اس خاندان کے تمام حکمرانوں کے ناموں کی تفصیل ہنوز تاریکی میں ہے، ملک ارجن راجہ نے ۱۱۵۶ء سے ۱۱۶۰ء تک حکمرانی کی، جسے مہانند کا لڑکا بتایا جاتا ہے، اس کی راجدھانی شتانند تھی، جس کے چاروں طرف سمندر محیط تھا، شتانند غالباً "پوری" کا دوسرا نام تھا، شتانند کو ڈیگو دو کوٹو (Diogo do Couto) نے سولھویں صدی میں منتو لکھا ہوا ہے اس نام کی وجہ تسمیہ کی بابت لکھا ہے کہ بن سوز راجہ کے زمانہ میں اس قطعۂ ارض

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۳) قبیلہ کے افراد اب بھی اس صوبہ میں پائے جاتے ہیں، جو بکرے کا گوشت سے اجتناب کرتے ہیں، بنگال کے 'کولاری' قوم میں بھی یہ رواج ہے، دنبہ اُس کے قبیلے کا اتیہ نشان ہے، اس لئے وہ اس جانور کا احترام بھی کرتے ہیں، بحوالہ Thana Gazetteer Vol XIII P. P. 730
مگر جیمز برڈ (James Bird) نے سلہارا کو راجپوت بتایا ہے،
(مرآت احمدی، تاریخی تعارف ص ۱۶)
خانوادۂ سلہارا تین حکمراں گھرانوں پر مشتمل تھا، (۱) جنوبی کوکن کے سلہارا (۲) شمالی کوکن، اور کولہاپور کے سلہارا، اور کولہاپور کے سلہارا، تینوں خاندانوں میں کیا تعلق تھا، اس کا کو علم نہیں، البتہ تینوں گھرانے اپنے آپ کو خرافانی جیموت واہن کی نسل سے (Jimuta vahana) بتاتے ہیں، بحوالہ The Silaharas of western By A. S Altekar P. 393

تقریباً تین گھنٹوں تک خالص سونے کی بارش ہوتی رہی، جس کے باعث اس کا نام سنتوپوری رکھا گیا [۵۱]، مگر اس دلچسپ روایت کی تاریخی حیثیت ظاہر ہے، خانوادہ سلہارا کے حکمراں فن تعمیر سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ شمالی کوکن میں ان کے عہد کے آثار جابجا نظر آتے ہیں، بمبئی میں بھی والکیشور کا مندر انہی کے زمانہ کی یادگار ہے،

سومیشور (Someshwar) اس خاندان کا آخری تاجدار تھا، جس نے دیوگیری کے راجہ مادیو کے ہاتھوں ۱۲۶۰ء عیسوی میں شکست کھائی تھی، اس کی موت کے بعد اس کا سارا علاقہ سلطنت دیوگیری میں ضم کر دیا گیا [۵۲]، ۱۲۷۱ء میں مادیو فوت ہوگیا، اور رام دیو سریرآرائے سلطنت ہوا، ڈاکٹر فلیٹ کے بیان کے مطابق ۱۲۷۲ء میں مہاپردھان (وزیر اعلیٰ) اچوت نایک (Chyuta Nayaka [۵۳]) علاقہ سالسٹ پر راجہ رام دیو کی طرف سے گورنر مقرر تھا، مگر شہر تھانہ میں پائی گئی تانبے کی ایک تختی سے جسے سب سے پہلے واتھن (Wathan) نے شائع کیا تھا، پتہ چلتا ہے کہ شک ۱۲۱۲ (بمطابق ۱۲۹۰ء) میں کرشن نامی ایک بھاردواج (Bhardwaja) برہمن رام دیو کی طرف سے پورے کوکن پر ناظم اعلیٰ کے فرائض ادا کرتا تھا، اس خاندان کے ایک حکمران کے متعلق کنہری گپھاؤں کی گپھا نمبر ۸ میں ایک کتبہ (۱۲۴۰ء) ملا ہے، اس میں تحریر ہے کہ

---

۵۱ The origin Bombay P 32

۵۲ The Silaharas western India by A. S Altakar P No 417

۵۳ Dynasties of The Kanarese Districts D Fleet P 529

تسلما راجہ شمالی کوکن پر حکمران ہے جس کا پایہ تخت پوری ہے، اور اس کے وزیر کا نام سنو؟ اس حکمران نے بدھ مت کے ماننے والوں کے لئے عبادت گاہیں تعمیر کرائیں، ان کو عطیات دیئے، اور وقتاً فوقتاً بھکشوؤں کی مالی اعانت بھی کرتا رہتا ہے" ایسا ہی ایک کتبہ پریل (Parel) (بمبئی) کے علاقے میں پرانے گورنمنٹ ہاؤس کے قریب میں ملا تھا جس پر اپرادتیہ (A. Paraditya) کے ایک گرانقدر عطیہ کا ذکر ہے، یہ کتبہ سنہ ۱۰۸۱ء سے تعلق رکھتا ہے[51]

علاؤالدین خلجی کا حملہ سنہ ۱۲۹۴ء میں علاؤالدین خلجی دیوگیری پر بلائے بے درماں کی طرح نازل ہوا، اور اس کے مقابلہ میں رام دیو کو ہزیمت اٹھانی پڑی، اس شکست سے یادو خاندان کی سلطنت کا نظام برہم ہوگیا، اس کے دو لڑکے شنکر دیو اور بمب دیو (بھیم دیو) تھے، بھیم دیو نے شمالی کوکن کی طرف راہ فرار اختیار کی اور اس پر مسلط ہوگیا، اور جب اس کا اقتدار مستحکم ہوگیا، تو اس نے ماہم (بمبئی) کو پایہ تخت بنایا اور (۱۶۲۴) گاؤں پر مشتمل شمالی کوکن کو پندرہ ضلعوں پر تقسیم کردیا[52]، بھیم دیو کے ساتھ پیٹھن سے نو پیرو یدی برہمن خاندان اور مختلف ذات والے کل ۶۵ خاندان آئے تھے، جن میں سوم ونشی، سُریہ ونشی، بھنڈاری، وغیرہ قابل ذکر ہیں[53]

بھیم دیو کے شمالی کوکن پر قابض ہونے کا تذکرہ مرہٹی کتابوں میں پایا جاتا ہے، جسے بعض مورخین نے غیر مستند قرار دیا ہے، ڈاکٹر سن ڈکنا کے بیان کے مطابق بھیم راج سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ہزیمت اٹھاکر جنوب کی جانب فرار ہوگیا، اور ماہم (بمبئی) پر قابض ہوگیا[54]، اور یہ بھو

---

[51] The origin of Bombay P. 26

[52] Early History of The Town and Island of Bombay by P.B. Joshi P. 10

[53] The origin of Bombay P. 39

[54] ایضاً ص ۱۱

جو اپنے آپ کو "پاٹھارے" یا "پاٹھے" کہتے ہیں، ان کا تعلق گجرات کے شہر پاٹن سے ہے، نہ کہ دکنی شہر پیٹھن سے[1]، مگر تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، محمود غزنوی کے کوچ کے بعد بھیم راج انہل واڑا لوٹ گیا، اور سومناتھ کے مندر کو از سر نو تعمیر کرنے کی تدبیر پر غور کرنے لگا[2]، یہ مندر پہلے لکڑی کا تھا، جو محمود غزنوی کے ہاتھوں تباہ ہوا، بھیم راج ۱۰۶۴ء تک حکمرانی کرتا رہا، اس نے اس کے جنوب کی جانب آنے کے واقعہ میں صداقت نظر نہیں آتی ہے، اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ محمود غزنوی کے حملہ کے وقت کوکن پر سلہارا خاندان حکمراں تھا، تھانہ کی تختی (۹۴۸ شک مطابق ۱۰۲۵ء) سے اس کا انکشاف ہوتا ہے کہ چھتراج کوکن کے ۱۴۰۰ دیہاتوں پر قابض تھا، اور کسی تاریخ میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ گجرات کے سالنکی خاندان کے کسی راجہ نے کوکن پر اس عرصہ میں حکمرانی کی تھی[3]،

صوبۂ دمن کے نواب چاند خان کے ایک فرمان (۹۰۱ھ مطابق ۱۴۹۵ء) کے مطابق جب بمب دیو کو علاء الدین خلجی کے ہاتھوں اپنے باپ رام دیو کی شکست کا علم ہوا تو وہ راج گرو پرشتم پنت کولے اور گیارہ چیدہ امیروں کو لے کر براہ سمندر قلعہ پانیرا (Panera) پاردی، سنجان، دمن اور شیر گاؤں پر قابض ہوگیا، اس کے بعد ماہی ماہم (بمبئی) پہنچا، اور اپنی ریاست کو بارہ منطقوں میں تقسیم کر دیا، مالاڑ (بمبئی) اور اس کے اطراف کے چند گاؤں اپنے راج گرو کولے (Kavale) کو بخش دیئے، ایک دوسری فارسی سند (جس پر سلطان بیدر علاء الدین کے دیوان محمد دلیل کی مہر ثبت ہے)

---

[1] The origin of Bombay P. 39
[2] ہسٹری آف گجرات ص ۶۱
[3] Rise of Bombay By S.M. Edward P. 24

میں بھی ایب دیو یا بھیم دیو کے شمالی کوکن پر متصرف ہونے کا ذکر ہے کہ ۱۲۹۴ء میں راجہ بھیم شاہ نے گرسن ( ) سے یہ علاقہ اپنے اقتدار میں لے لیا، یہ مملکت سارت بھاٹ سے دمن تک کل چودہ پرگنوں پر مشتمل تھی،[1]

جب بھیم دیو جزیرہ ماہم میں وارد ہوا، تو یہ علاقہ سنسان اور خاردار جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا، اور اس کی آبادی کولیوں اور کوکنی مسلمانوں پر مشتمل تھی، اور صرف دو مندر تھے، جزیرہ ماہم نوالے (Newale) اور بارد بیٹ (Barad Bet) کے نام سے موسوم تھا، بھیم دیو نے ماہم یا ماہی کاوتی (mahi Kavati) کا نام تجویز کیا، اس نے اپنے لئے ایک محل تعمیر کرایا، باغات اور ناریل کے درخت لگوائے، اپنی خاندانی دیوی، پربھا دیوی کا مندر بنایا، دراصل اسی عہد سے بمبئی کی ترقی کا آغاز ہوا،

راجہ بھیم دیو ۱۳۰۳ء میں فوت ہو گیا، اور اس کا بیٹا پرتاپ ببب یا پرتاپ شاہ[2]

---

[1] The Rise of Bombay P. 25

[2] بھیم دیو کو بھیم شاہ یا ایب شاہ بھی کہتے ہیں، ایک فارسی دستاویز کی رو سے ۱۲۰۱ء (؟) میں راجہ رام دیو اپنے بیٹے بھیم دیو کے ساتھ علاء الدین خلجی کے دربار میں گیا تھا، جہاں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، بادشاہ دہلی نے اسے اپنا بیٹا بنا کر "شاہ" کے خطاب سے سرفراز کیا، یہ سچ ہے کہ راجہ رام دیو نے دہلی کا سفر کیا تھا، مگر دستاویز مذکورہ کا سنہ متند قرار نہیں دیا جا سکتا، دہلی دربار میں اس کی بڑی عزت افزائی ہوئی، اور اسے اس کا کھویا ہوا ملک بھی لوٹا دیا گیا تھا، اور نوساری کا علاقہ بھی اس میں مزید شامل کر دیا گیا تھا، اور ایک لاکھ ٹنکہ (سکۂ رائج) اس کے ذاتی مصارف کے لئے بادشاہ کی طرف سے منظور کئے گئے تھے،

(Bombay Gazetteer vol. I Part II

تخت نشین ہوا، اس کی حکمرانی کے دور سے کوئی قابل ذکر واقعہ وابستہ نہیں ہے، البتہ اس نے اپنے عہد میں ماہم کے علاوہ ماروِل (Marol) کو بھی اپنا مرکزی شہر قرار دیا تھا، اور اسے پرجا پوریا پرداپور کا نام دیا، ۱۳۲۱ء میں چیول کے حکمراں ناگردیو (Nagerdev) نے اسے شکست دے کر اس کی حکومت چھین لی، تاہم خود ناگردیو کو اس کی اس ریاست کا جبری انضمام راس نہیں آیا، ۱۳۴۷ء میں یہ سارا علاقہ سلطان دہلی کے صوبہ گجرات میں شامل کر دیا گیا، اور چند ہی سالوں بعد گجرات میں ایک جداگانہ آزاد مملکت کا قیام عمل میں آیا، گجرات کا یہ حکمراں خانوادہ ۱۵۳۴ء تک ان جزائر پر قابض رہا،

(باقی)

ہندوستان عربوں کی نظر میں

ہندوستان کی قدیم تاریخ سے متعلق قدیم عرب مصنفین خصوصاً عرب جغرافیہ نویسوں، سیاحوں اور مورخین کی کتابوں، سفرناموں اور تاریخوں میں جو بیش قیمت مواد پھیلا ہوا ہے، اور جو تاریخ کے طالب علموں کے لئے بہت کارآمد ہے، اس کو دارالمصنفین نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ دو جلدوں میں جمع کرایا ہے، ان میں ابن ندیم، عبدالقادر بغدادی، قاضی صاعد اندلسی، عبدالکریم شہرستانی، قاضی رشید، ادریسی، ابن ابی اصیبعہ، ابن بطوطہ، قلقشندی وغیرہ کی کتابوں اور سفرناموں کے اقتباسات اور ان کا اردو ترجمہ ہے، تاکہ جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں،

جلد اوّل ضخامت: ۴۰۱ صفحے قیمت: ـ ۳۰ؔ/

جلد دوم " " قیمت: ـ ۲۰ؔ

"منیجر"

اردو میں ترکی زبان کے الفاظ

از

جناب ڈاکٹر اکمل ایوبی، ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی

ترکی ایک سیدھی سادی اور جامع زبان ہے، اس کا تعلق نہ تو عبرانی، اور عربی جیسی سامی زبانوں سے ہے اور نہ ہی سنسکرت اور فارسی جیسی آریائی زبانوں سے۔ یہ بذات خود ایک مستقل زبان ہے اور یورال الطائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے، جس کو تورانی خاندان بھی کہتے ہیں، اس وقت ترکی زبان تقریباً پچیس[25] ممالک میں بولی جاتی ہے، اور دس[10] ملکوں میں اُسے قومی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے، اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بھی اس وقت تقریباً بارہ[12] کروڑ ہے، جو ولاڈی واسٹک سے لے کر یوگوسلاویہ تک پھیلے ہوئے ہیں، ہمارے ہندوستان میں البتہ ترکی زبان بولنے والوں کی تعداد صفر کے برابر ہے لیکن ہم ہندوستانیوں کے لئے ترکی قوم کوئی نئی یا گمنام قوم نہیں ہے، ترکوں سے ہمارے قدیم روابط رہے ہیں، اور ان تعلقات کی ابتدا پہلی صدی قبل مسیح میں "یوچی" نامی ترکی قبیلے کی آمد سے ہوئی، اور یہ کسی نہ کسی طرح بہادر شاہ ظفر کے عہد کے خاتمہ تک برقرار رہے، اس دو ہزار سال کی طویل مدت میں "ترک شاہی" کے علاوہ غزنوی، غوری، ایبک، التمش، بلبن، خلجی، تغلق، تیموری، برید شاہی، قطب شاہی جیسی ترکی حکومتیں ہندوستان میں قائم ہوئیں، ان ترکی حکومتوں کے شہنشاہوں کی مادری زبان ترکی تھی جو اپنے تمام ترقی یافتہ اسالیب، زور بیان اور حسن ادا کے ساتھ ہندوستان بھی آئی، اور یہاں

کے تمدن، معاشرت، سماج، اخلاق، ادب اور زبان پر گہرا اثر ڈالا، اسی کی وجہ سے ہندوستان کا لسانیاتی ڈھانچہ متاثر ہوا، اور ایک ایسی نئی زبان نے جنم لیا، جس کو خود ہندوستان کے ترک حکمران شاہجہاں نے "اردو" کے شاندار نام سے سرفراز فرمایا[۵۱] اس زبان کو ترکوں نے پروان بھی چڑھایا ہے، اردو زبان کے دو مشہور ادیب و شاعر امیر خسرو اور مرزا غالب سے کون واقف نہیں ہے؛ ان دونوں ہستیوں کا تعلق ترک خاندان سے تھا،

ہمارا اردو داں طبقہ اس امر سے اچھی طرح واقف ہے، کہ لفظ "اُردو" اصل کے اعتبار سے ہندوستانی نہیں ہے، اردو لفظ خالص ترکی ہے، اور اُس کے معنی سانپ کا بل، کھیل کی صف، بادشاہ کا محل، فوج یا لشکر، فوجی دستہ، اور کیمپ کے ہیں[۵۲] لیکن یہ سُن کر ضرور تعجب ہوگا کہ ترکی اور اردو زبانوں کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب عموماً ایک جیسی ہوتی ہے، اور ایک زبان کا ترجمہ اگر دوسری زبان میں لفظ بہ لفظ کر دیا جائے، تو وہ خود بخود با محاورہ ترجمہ ہو جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں یہ دعویٰ کر رہا ہوں کہ اردو زبان فارسی اثرات

---

۵۱ ڈاکٹر تاراچند کا کہنا ہے کہ "لفظ اُردو کو ہندی کے معنی میں غالباً سب سے پہلے مصحفی نے استعمال کیا ہے، میر اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں زبان اردوے معلّٰی کا نام استعمال کرتے ہیں، یہ نام قائم کے مخزن نکات (۱۷۵۴ء) میں بھی ملتا ہے، دکن کا ایک شاعر باقر آگا لفظ اردو ۱۷۷۲ء میں استعمال کرتا ہے اور علی ابراہیم خان صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیم میں بھی ۱۷۸۳ء میں یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، عطا حسین، تحسین مصنف نو طرز مرصع (۱۷۷۵ء - یا ۱۷۹۸ء) زبان اردوے معلّٰی کا ذکر کرتے ہیں۔ میرامن اپنی باغ و بہار (۱۸۰۱ء) کی زبان کا نام اردو بتاتے ہیں، (دیکھئے معارف نمبر ۳ - جلد ۴۰، بابت ستمبر ۱۹۳۷ء - ص ۲۱۴)

۵۲ ہندوستان کے ایک مشہور اسکالر کا خیال ہو کہ لفظ اردو ترکی لفظ (Ordu) سے ماخوذ ہے،

ہے پاک ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اردو زبان کو فارسی نے بڑی حد تک متاثر کیا ہے، اس کے علاوہ اردو پر عربی اور سنسکرت کے اثرات بھی موجود ہیں، لیکن میرے خیال سے ترکی اثرات ان زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں، اور ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ قول صحیح ہے کہ (Urdu is more turkish than Persian) یعنی اردو میں ترکی عناصر فارسی کے مقابلہ میں زیادہ ہیں[۵]،

اردو زبان ہندوستان کی پیداوار ہے، اس کا تعلق آریائی زبانوں سے ہے، اس کی صرف نحو مقامی ہے، اس کے افعال، ضمائر اور روابط وغیرہ بھی ترکی نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود ہماری اردو زبان ترکی سے براہ راست اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے بڑی حد تک متاثر ہوئی ہے، اردو زبان میں فارسی کی اضافت جیسے صاحب قلم اور عربی کی اضافت جیسے بیت المال دونوں کا استعمال بکثرت ملتا ہے، لیکن ان صورتوں کے علاوہ اردو زبان میں بغیر علامت اضافت کے دو اسموں کو ملاکر مرکب لفظ بنانے کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں، جیسے بوٹ پالش، جیب گھڑی، سبزی منڈی، ڈاک گھر، گھنٹہ گھر وغیرہ، چونکہ یہ قاعدہ فارسی اور عربی کے بجائے ترکی زبان میں موجود ہے، اس لئے میرے خیال سے یہ ترکی زبان ہی کا اثر ہے، جو اردو نے قبول کر لیا ہے،

ترکی زبان میں وصفیت یا فاعلیت کی علامت "چی" اور "جی" ہے، اس سے بنے ہوئے متعدد الفاظ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۱) دیکھئے پروفیسر سید مقبول احمد صاحب کا مضمون "موجودہ ہندوستان میں اردو کی حیثیت" جو رسالہ فکر و نظر علی گڑھ کے شمارۂ مسلسل ۳۰ (جلد ۸، نمبر ۲) بابت ماہ جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے، خود ترکی کے چند اہل قلم حضرات نے لفظ اردو کی بنیاد کو لفظ ... بمعنی تخت یا قلعہ بتایا ہے، اور بعض نے اس لفظ کا رشتہ ترکی مصدر (urmak) یعنی مارنا سے ملایا ہے، لیکن لفظ اردو کا ان مصدر کا بھی واسطہ نہیں، جیسے لفظ مرکب اسم نہیں ہے، بلکہ مفرد اسم ہے،
۵ Die Welt Des Islams, N.S. Vol. ..., 3-4, P. 132 a.

اردو میں مستعمل ہیں، اردو میں اُس کے اضافے سے بہت سے نئے الفاظ بنائے گئے ہیں جن کو ہم عام گفتگو میں بلا تکلف استعمال کیا کرتے ہیں، مثلاً بندوقچی، نقارچی، نقل چی، مشعل چی، طبل چی، خزانچی، توپچی، ایلچی وغیرہ، اسی طرح ترکی الفاظ پر ہندی افعال لگا کر نئے مصادر بھی آزادی کے ساتھ بنائے گئے ہیں، اور اس طرح ذخیرۂ الفاظ میں قابلِ قدر اضافہ کیا گیا ہے، اُس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، "قرق" ترکی لفظ ہے، اس میں "کرنا" کا اضافہ کرکے "قرق کرنا" مصدر بنایا گیا ہے، "قابو" بھی ترکی لفظ ہے، اس میں "پانا" کا اضافہ کرکے "قابو پانا" مصدر بنایا گیا ہے، اسی طرح "چلکہ" سے "چلکہ لینا"، افسوس سے افسوس کرنا، تلاش سے تلاش کرنا، سُراغ سے سراغ لگانا، نافذ سے نافذ کرنا یا ہونا، یورش سے یورش کرنا، تلاشی سے تلاشی لینا، کوچ سے کوچ کرنا، جیسے مصادر بنائے گئے ہیں۔

ترکوں کا ابتدائی مذہب آسمان پرستی یا آتش پرستی تھا، لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے شامانیت، بدھ مت، مسیحیت اور آخر میں مذہب اسلام اختیار کر لیا تھا، اسلام کے حلقہ بگوش ہونے اور مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں نے اپنی مادری زبان میں عربی و فارسی زبانوں کے صرف الفاظ ہی شامل نہیں کئے، بلکہ ان زبانوں کا طرز تحریر بھی اپنا لیا تھا، اسی اسلامی جوش و خروش کی وجہ سے انھوں نے اپنا مخصوص قدیم رسم الخط بھی ترک کر دیا، اور عربی رسم الخط کو اپنا لیا، اس کے معنی اُن کے تمدن، معاشرت، سماج، اخلاق، ادب اور زبان کی تبدیلی کے تھے، لیکن ترکوں نے اسے برداشت کیا، اس کا ایک طرف تو یہ اثر ہوا کہ ترکی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی تعداد بڑھ گئی لیکن دوسری طرف عربی و فارسی زبانوں میں بھی ترکی الفاظ کے داخلے کی راہیں کھل گئیں، ترکی حکومتوں کے قیام سے اس کو اور فروغ حاصل ہوا، چنانچہ ہماری اردو زبان میں ترکی الفاظ مستعمل ہیں، وہ فارسی زبان کے ذریعہ بھی اُردو میں داخل ہوئے ہیں اور اُس کا سرا اصل میں ان دیوان اور شاعروں کے سر ہے، جن کا تعلق ایوان شاہی اور فوج کے ساتھ

ہی ساتھ ہندوستانی عوام سے بھی تھا، اور جنھوں نے ترکی زبان کے الفاظ اپنی فارسی شاعری و نثر میں استعمال کئے، اور بعد میں انھیں اردو میں منتقل کر دیا،

ہندوستان میں ترکوں کے ابتدائی دور میں فوج کا اکثر و بیشتر حصہ ترکوں ہی پر مشتمل ہوتا تھا، جو ترکستان سے مسلسل آتے رہتے تھے، بعد کے زمانہ میں ہندی عناصر کو فوج میں غلبہ حاصل ہوا، لیکن سپہ سالار اور دوسرے اہم افسر عام طور پر ترک ہی ہوا کرتے تھے، اور چونکہ فوجیوں کا تعلق عوام سے بھی ہوتا تھا، اس لئے آپس کے لین دین کے باعث فوجیوں کی زبان علاقائی زبانوں پر اثر انداز ہوئی، اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترکی الفاظ داخل ہو گئے، اس کام میں ان ترکی ادیبوں، شاعروں اور عالموں اور فن کاروں نے بھی ضرور مدد کی ہوگی، جو منگولوں کے طوفانی حملوں کی وجہ سے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر ترک سلاطین ہند کے زیر سایہ پناہ لینے کے لئے آگئے تھے، اور ہندوستان ہی میں آباد ہو گئے تھے، اس کام میں افضلیت کا شرف ترکی فوج ہی کو حاصل ہے، اس کی اصل وجہ غالباً یہ ہے کہ ہندوستان کی زبانوں میں جو ترکی الفاظ داخل ہوئے ہیں، وہ ادبی و دینی نہیں ہیں، بلکہ عام ترکی تہذیب و تمدن اور خاص کر فوج سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً توپ، چاقو، قینچی، چقماق، چقمق، توپچی، ایلغار، اردو، داروغہ، یورش، سپاہی، نقارہ، تمغہ، قاب، لیغار، غول، بچی، قمہ، قنات، چق، چچہ، توشک، غالیچہ، جاجم، جرگہ، لاش، کرتہ، نقیب وغیرہ کو دیکھئے، جس طرح ہم کھانا پکانے والے خانساماں کو "باورچی" کہتے ہیں، جو ترکی لفظ ہے[۱]، اسی طرح ہمارے بہت سے کھانوں کے نام بھی ترکی ہیں، قورمہ، قیمہ، دولمہ، قلفی، باقرخانی وغیرہ کا مزہ ہم سب لیا ہی کرتے ہیں، یہ سب ترکی الفاظ

---

[۱] لفظ باورچی، "باور" اور "چی" سے مرکب بنا ہے، باور کے معنی یقین کرنا، اعتبار کرنا ہیں، اور چی کلمۂ نسبت ہے، اس طرح باورچی کے معنی جس پر اعتبار کیا جائے، ہیں، اور اس اعتبار کا تعلق کھانے پینے کے ساتھ ہے،

ہی ہیں، ہماری اردو زبان میں ترکوں کے سماجی القاب بھی موجود ہیں جن میں سے باجی، خان، خانم، بیگ، خاتون، آتالیق، اَنّا، بی بی، آپا، آغا، خاقان، آفندی، آقا، پاشا، بیگم، بابا، بیوی وغیرہ ہم روزمرہ استعمال کیا کرتے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی ترکی زبان کے الفاظ اردو زبان میں موجود ہیں، اور اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم لغت مرتب ہو سکتی ہے[1] پھر بھی قارئین کی تفریح طبع کے لئے چند مزید ترکی الفاظ پیش کئے جاتے، جو ہماری اردو زبان میں رچ بس گئے ہیں، چشمہ، چچک، بلاق، بکشی، بقچہ، قلی، قزاق، پائچہ، جیب، تزک، تلاشی، تومان، چاق، چادرش، چپقلش، ساچق، سودا، سوداگری، سوغات، قاز، قاش، کلابتو، قینچی، کمرہ، کگ، کوچک، کوتک، کوک، لال، لالہ، شال، تندور، ناغہ، نقب، نقارہ، سپاہی، آوارہ، تنکہ، شلوار، پاشالوار وغیرہ،

---

[1] عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر یوسف الدین صاحب ایسی ہی لغت تیار کر رہے ہیں،

الدرۃ الیتیمہ

کا

ایک تنقیدی مطالعہ

از

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم اے پی ایچ ڈی لکچرر شعبۂ عربی، ونکٹیشور یونیورسٹی، آندھرا

اگرچہ عربوں نے نقد شعر پر غیر معمولی کاوش سے کام لیا، مگر نثر کی تنقید پر انھوں نے توجہ نہیں کی، بعد میں جب سرکاری ضرورتوں کے باعث نثر کی اہمیت بڑھ گئی، اور توقیعات کا رواج ہوا، تو سرکاری مراسلت کے متعلق کئی کتابیں محاسنِ نثر پر لکھی گئیں، اس لئے نقد نثر کا آغاز چوتھی صدی میں ہوا، جب کہ نظم کی تنقید کے آثار عصر جاہلیت ہی سے نظر آنے لگتے ہیں، عبدالرحمن بن عیسیٰ ہمدانی نے اپنی کتاب الفاظ الکتابیۃ میں نثر کی اہمیت کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"ادب بہترین پیشہ ہے جس کے ذریعہ ادیب دنیا میں عزت و عظمت حاصل کر سکتا ہے،
اس کا قلم اس کو اعلیٰ درجات تک پہنچ سکتا ہے"[1]

نثر کی تنقید کے سلسلہ میں ابن مقفع کی کتاب "الدرۃ الیتیمۃ" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ کتاب قعر گمنامی میں پڑی تھی، امیر البیان علامہ امیر شکیب ارسلان نے اس پر مقدمہ لکھ کر اس کو شائع کیا، اس کی اہمیت کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] الفاظ الکتابیۃ مصنفہ ہمدانی (بیروت ۱۸۸۵ء) ص ۰ ہ

قد جمعت بین اعلى طبقات
البلاغة واسمى درجات
الحكمة وتضمنت من الحكم
البوالغ والحجج الدوافع ما لم
يتضمنه كتاب قبلها و
لا بعدها فكانت حرية
بان يتخذها الكاتب منهج
لبه وحماطة قلبه وان
يجعلها دستور انشاءه
ومثال احتذاءه[1]

یہ رسالہ اعلیٰ طبقات بلاغت اور بلند
کلماتِ حکمت کا جامع ہے، اس میں
ذہن نشین ہو جانے والے کلمات
اور ایسے بلند دلائل موجود ہیں، جو
اس سے قبل یا اس کے بعد کی کسی
کتاب میں نہیں ملتے، یہ اس لائق
ہے کہ منشی اس کو فن کا مرجع اور
قلب کا مرکز بنائیں، اور اس کو
اپنے انشار کا دستور قرار دیں، اور
اس کی پیروی کریں،

یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ عرب ناقدوں کا نظریہ یہ تھا کہ اگر کسی شخص کو شاعری یا نثر نگاری کے اصول و قواعد سے واقف کرا دیا جائے، اور اس کے عمدہ نمونے پیش کر دیئے جائیں تو ان فنون پر کافی قدرت حاصل ہو سکتی ہے، اسی بنا پر وہ فنِ تنقید کو "صنعت" کہتے ہیں، ابوہلال عسکری نے اپنی کتاب کا نام اسی نظریہ کے تحت "کتاب الصناعتین" رکھا ہے، یہ تصور عرب ناقدوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، بلکہ قرونِ وسطیٰ اور اس کے بعد کے دور میں دنیا کے سارے ناقدین کے بارہ میں ادیب اسی انداز سے سوچتے تھے، "الدرة الیتیمة" بھی اسی تصور کے ماتحت لکھی گئی، البتہ اس کتاب پر امیر شکیب کا تبصرہ موجودہ عصری رجحانات سے مطابقت نہیں رکھتا، جس کا

[1] الدرة الیتیمة لعبد اللہ بن المقفع تعلیق امیر شکیب ارسلان محمود علی صبیح الازهر، مصر ص ۱۵-۱۶

لحاظ ضروری تھا، موجودہ دور میں تنقید و ادب کے پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں،

اب ناقدین ادب صرف ادیبوں اور شاعروں کی رہنمائی کے لئے نہیں لکھتے، بلکہ تنقید کے پڑھنے والے بھی اُن کے پیشِ نظر ہوتے ہیں، ابن مقفع نے جو اپنے دور کا زبردست انشا پرداز ادیب اور مترجم ہے، اپنی تنقید میں اپنے دور کے رجحانات کا پورا لحاظ رکھا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ثقیل کلام "مردم آزاری" کا باعث ہوتا ہے، اس لئے لوگوں پر اس کو لادنے سے احتراز لازم ہے[۱]،

اس نے اس عبارت کی تعریف کی ہے جس سے پڑھنے والے کو بات چیت کا لطف حاصل ہو، وہ لکھتا ہے کہ متقدمین کی کتابیں جاندار اسلوب بیان کی حامل ہیں، ان میں فن و بلاغت ہے، جب نئے دور کے ادبا ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ انکو مکالمہ معلوم ہوتا ہے[۲]، یعنی وہ صحیح و سلیس زبان لکھتے تھے،

ابن مقفع اپنے دور کے رجحانات کی ترجمانی کرتا ہے، اس دور میں بادشاہوں، امیروں اور ذی اقتدار اشخاص کی اہمیت تھی، اس کا اندازہ ان تمام کتابوں سے ہوتا ہے، جو نثر کی تنقید میں تصنیف کی گئیں، ان سب میں بادشاہوں اور امیروں سے متعلق القاب، آداب طرز تخاطب اور ان کے حسب مراتب الفاظ کی پوری فہرست درج کی گئی ہے یا اس بارے میں مفصل ہدایات دی گئی ہیں، صیرفی نے قانون دیوان الرسائل میں اور ہمدانی نے الالفاظ الکتابیۃ میں یہی انداز اختیار کیا ہے، اسی بنا پر ابن مقفع نے ہدایت کی ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کے لئے ان کے مرتبے کے مطابق الفاظ و القاب استعمال کرنا ضروری ہے،

ایک مقام پر لکھا ہے کہ ادیب کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کلام کو حفظ کرلے جو اس کو پسندیدہ معلوم ہو جو کلام لوگوں کو ناپسند ہو اس کا رُخ نہ کرنا چاہئے، ورنہ وہ لوگوں سے دور ہو جائے گا،

---

[۱] الدرۃ الیتیمۃ ص ۴ تا ۷، [۲] ایضاً ص ۱۴ - ۱۵.

مدح وستایش کی حرص بعض اوقات ادیب کی پوزیشن خراب کر دیتی ہے، اور زود نگاری میں غیر معیاری باتیں اس کے قلم سے نکل جاتی ہیں، ادیب کو عجلت میں ایک جملہ بھی نہ لکھنا چاہئے، جلدی میں غلطی کا امکان بڑھ جاتا ہے، بلکہ غور و فکر کے بعد ہی لکھنا چاہئے، کسی بات کو شستہ کہنا غلط طرز اظہار سے بہتر ہے، ایک صحیح جملہ ان بہت جملوں سے بہتر ہے، جو عجلت میں نامناسب الفاظ سے لکھے گئے ہوں۔[۱]

ابن مقفع عام عرب ناقدوں کی طرح اس امر کا شاکی ہے، کہ متقدمین نے متاخرین کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، اور ہر ممکن عنوان پر انھوں نے اپنے نشر و فن کے جوہر دکھائے ہیں[۲] ان کا یہ خیال کہ معانی محدود ہیں، اور متقدمین نے سارے معانی استعمال کر ڈالے اور متاخرین کے لئے کوئی موضوع نہیں چھوڑا، یہ تصور صحیح نہیں، دراصل یہ زندگی کی وسعتوں اور انسانی افکار کی گہرائیوں سے ناواقفیت کی دلیل ہے، یہ ایسا ہی تصور ہے جیسا کہ جاحظ نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ عربوں کے علاوہ اقوام عالم میں خطبار نہیں ہوتے، حتیٰ کہ یونان کے بارے میں لکھ دیا کہ وہ خطابت سے واقف تو ہیں مگر ان کے یہاں خطیب کوئی نہیں[۳] معانی کی تولید انسانی ذہن میں ہوتی ہے، ان کو محدود کرنا گویا زندگی کی وسعتوں کو تنگ کر دینا ہے،

ابن مقفع طالب ادب سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کو ادب کے بنیادی اصولوں سے واقفیت

---

۱ الدرۃ الیتیمہ ص ۶۳ - ۶۴ -

۲ ایضاً ص ۱۵ - ۱۶ -

۳ نقد النثر از اسحاق بن ابراہیم ملاحظہ ہو مقدمہ از قلم طہٰ حسین،

حاصل کرنی چاہئے تاکہ وہ جو کچھ کہے وہ اہل نظر کی طرح کہے، اور غلطیوں سے مجتنب رہے،

یہ تنقیدی خیالات ابن مقفع کے دور کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جب کہ نثر کی تنقید کا سرمایہ بھی عربوں کے پاس برائے نام تھا، اسی بنا پر امیر شکیب نے اس کتاب کے تنقیدی افکار کو دوسرے ناقدوں سے بلند و برتر قرار دیا ہے،

سلسلۂ تاریخ ہند

۱۔ مقدمۂ رقعات عالمگیر۔	(زیر طبع)	۳۶۲ صفحے	قیمت	لعہ/
۲۔ بزم تیموریہ	〃 〃	۴۷۸	〃 〃	لعہ ۲۵/
۳۔ بزم مملوکیہ		۳۲۴	〃 〃	صعہ/
۴۔ بزم صوفیہ	〃 〃	۵۳۸	〃 〃	عہ ۲۵/
۵۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک		۵۲۴	〃 〃	عہ ۲۵/
۶۔ مختصر تاریخ ہند		۲۰۸	〃 〃	للعہ/
۷۔ ہندوستان کی کہانی		۸۰	〃 〃	عا/
۸۔ تاریخ سندھ	〃 〃	۴۰۸	〃 〃	عہ/
۹۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام		۴۹۲	〃 〃	عہ/
۱۰۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں حصہ اول		۴۰۰	〃 〃	عہ/
۱۱۔ 〃 〃 〃 〃 حصہ دوم		۴۰۱	〃 〃	عہ/

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

جنوب مشرقی ایشیا کے مسلم ممالک

از ڈاکٹر چارلس کالاگھر

مترجمہ

جناب وارث رشید صاحب قدوائی

جنوب مشرقی ایشیا کے وسیع خطہ میں انڈونیشیا اور ملیشیا تقریباً پورے کے پورے اور تھائی لینڈ، فلپائن، اور سنگاپور کے کچھ علاقے اسلام کے زیر سایہ ہیں، جہاں تقریباً نو کروڑ بندگان خدا کے دل اسلام کے نور سے منور ہیں، (یہ تعداد ۱۱ کروڑ سے زائد ہے۔ مترجم) اس خطۂ زمین پر اسلام کی اشاعت کی تاریخ چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے، اسلامی مراکز سے بہت دور سات سمندر پار کے اس علاقہ میں اسلام کی تبلیغ صوفیوں اور برگزیدہ درویشوں کے مبارک ہاتھوں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ اس خطہ میں تبلیغ اسلام کی پوری تاریخ میں تشدد کی کہیں مثال نہیں ملتی،

اسلام کے اس دور دراز مشرقی علاقے میں یہ عجیب و غریب صورت نظر آتی ہے کہ جہاں بعض دینی امور میں شدت ہے، وہیں قدیم ہندوانہ اور مشرکانہ اعتقادات اور رسوم کو بھی قائم رکھا گیا ہے، (مثلاً وہاں کے لوگ رام، سیتا، اور دوسرے ہندو اور بدھ دیوتاؤں کے نام پر اپنے نام رکھتے ہیں، ہر سال رام لیلا بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے، رقص جو غیر اسلامی چیز ہے انڈونیشیا کی سماجی زندگی کا جزو ہے، شادی بیاہ کی رسمیں ہندوؤں سے مختلف نہیں ہیں،

قبیل کی اور چیزیں بھی ان میں رائج ہیں،

جنوب مشرقی ایشیا کی سیاسی، سماجی و اقتصادی صورت حال کے جائزہ میں یہاں کی چینی اقلیت جس کی تعداد ایک کروڑ ہے ایک اہم عنصر ہے، یہ تعلیم اور دولت کے اعتبار سے بڑی ترقی یافتہ اور بااثر اقلیت ہے، اس کو چین کی پوری امداد بھی حاصل ہے، ملائشیا میں چینی اقلیت جس طرح ملکی سیاست اور مذہب پر اثر انداز ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسی اقلیت کی بنا پر ملائشیا کو ایک بین الریاستی وفاق کی شکل دی گئی، جہاں پر ملائشیائی اپنے مذہبی اور شرعی معاملات میں مرکزی حکومت کی بجائے ریاستی حکومت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں، مرکزی حکومت میں وزارت امور مذہبی قائم نہیں کی جا سکی، جب کہ دستوری طور پر اسلام کو ریاست کا مذہب مانا گیا ہے (مذہبی وزارت اب قائم ہو چکی ہے) دونوں قوموں کی فرقہ وارانہ منافرت میں بڑی شدت آگئی ہے (کوالالمپور میں ہونے والے نسلی فسادات اس منافرت کا واضح ثبوت ہیں، مترجم) اس کے علاوہ چینی اقلیت کا تعاون متحدہ محاذ کو حاصل ہے، جو اعتدال پسندوں کی جماعت ہے، اور پین ملائن اسلامک پارٹی کو جس کا نصب العین خالص اسلامی حکومت کا قیام ہے، اس متحدہ محاذ کا سخت مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے،

۱۹۶۳ء میں جب ملائشیا اور سنگاپور کے وفاق کی تشکیل عمل میں آئی، تو سراواک اور صباح کی مسلم آبادی کے برطانوی علاقے بھی اس میں شامل کردیئے گئے، جس کا مقصد یہ تھا کہ چینی اقلیت کا زور کم کیا جا سکے، ۱۹۶۵ء میں سنگاپور کے وفاق سے الگ ہو کر ریاست بن جانا اسی کا واضح ثبوت ہے کہ دونوں عناصر میں کس قدر ذہنی بعد ہے،

انڈونیشیا ۱۹۴۵ء میں آزاد ہوا، اور اس وقت سے اب تک مختلف قسم کے سیاسی و اقتصادی مسائل سے دوچار ہے، ملائشیائی وفاق میں مسلمانوں پر قانون شریعت نافذ اور سرکاری طور پر ریاست کا مذہب اسلام ہے، چنانچہ دستور کے حصہ دوم دفعہ دوم میں

دستور میں اس کی بھی تصریح ہے، کہ حکومت کو قانون کے ذریعہ مسلمانوں میں دوسرے مذہبوں کے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کو محدود یا مسدود کرنے کا اختیار حاصل ہوگا" ملائی مسلمانوں کی اقتصادی پسماندگی کے پیش نظر ان کو دستور میں خصوصی مراعات مثلاً ملازمتوں میں تحفظ اور زمینوں کے مالکانہ حقوق جیسی مراعات دی گئی ہیں، اور سنگاپور کی آزاد سیکولر حکومت نے بھی ۱۵ فیصدی مسلم آبادی کو یہ مراعات دے رکھی ہیں، اس کے مقابلہ میں انڈونیشیا میں تاریخی وجوہ کی بنا پر انڈونیشی مسلمانوں کو کوئی خصوصی امتیاز حاصل نہیں ہے، جزیرہ جاوا کی مسلم آبادی پر قدیم ہندو اور بدھ دور کے ثقافتی اثرات بہت گہرے ہیں، ان کے عقائد اور رسم و رواج میں سرایت کئے ہوئے ہیں، سلنبدر اور ماجاپاہت تہذیبوں کے نقوش بہت واضح ہیں، جزیرہ بالی میں ہندو اور دوسرے علاقوں میں عیسائی اپنی تہذیبوں کے ساتھ موجود ہیں، چینی نژاد آبادی اگرچہ ۵ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے لیکن اقتصادی طور پر بہت مضبوط ہے، انڈونیشیائی نیشنلزم کی تاریخ اس صدی کے آغاز میں سارے کا ت اسلام" (۱۹۱۲ئہ) کی تحریک کے ساتھ شروع ہوتی ہے، جو بڑی حد تک مذہب کے ساتھ ہم آہنگ ہے، لیکن ۳۰-۱۹۲۰ء کے دوران سوکارنو اور ڈاکٹر محمد حطی کی قیادت میں سیکلر رجحانات ابھرے جو روز بروز قومی ترقی کرتے گئے، یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر جب انڈونیشیا کو سیاسی آزادی حاصل ہوئی تو "پنج شیلا" کے اصول کو دستوری طور پر قومی پالیسی تسلیم کیا گیا، جس میں خدا پر عقیدہ کا اظہار کیا گیا ہے، مگر اسلام کا ذکر نہیں ہے،

ملائشیا کے سیاسی مذہبی اور سماجی رجحانات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ سماجی طاقتیں جو ملائشیا میں علیحدہ مذہب اور زبان کا نعرہ بلند کر رہی ہیں، سیاست میں پیش پیش ہیں، اور قومیت کے معاملہ میں جن جذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اسلام

کی قوت کو نظر انداز کر کے زبان کا سہارا لیا جا رہا ہے، گو اب انڈونیشیا کا رویہ مذہبی اعتدال پسندی کا ہے لیکن احیائے مذہب کی تحریکوں کے قومی اثرات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا "دارالاسلام" کی گوریلا تحریک (۱۹۴۸ء) مسجومی پارٹی کے ساتھ سوکارنو کی مخاصمت اور ۱۹۶۵ء کی ناکام بغاوت کے بعد کمیونسٹوں کے خلاف تشدد کی مہم، یہ سب باتیں اسلام کے قومی اثرات کی نشاندہی کرتی ہیں، ملائشیا اور انڈونیشیا کے طرز فکر میں فرق یہ ہے کہ ملائشیا میں سیاسی معاملات میں بھی مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اور انفرادی زندگی کے تانے بانے بھی مذہب کی قدروں سے بنے جاتے ہیں، اور انڈونیشیا میں مذہب کو سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا ہے،

چینی اقلیت کے معاملہ میں انڈونیشیا اور ملائشیا کی حکومتوں کے طرز فکر میں نمایاں اختلاف رہا ہے ان دونوں کے نظریاتی اختلافات اور باہمی مخاصمت جنوب مشرق ایشیا کے اہم مسائل رہے ہیں، اور اب بھی ہیں، ان اختلافات کا اظہار ۱۹۶۳-۶۶ء کی کشمکش کی صورت میں ہو چکا ہے، جب دونوں جنگ کے دروازہ تک پہونچ گئے تھے، اب یہ آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے اور فلپائن کے ساتھ دونوں ملکوں کی مشترک تہذیبی اقدار کے پیش نظر تینوں ممالک کی ایک مشترکہ یونین "مافلینڈو" کے قیام کی تجاویز بھی پیش ہوئی تھیں، اور اب یہ توقع پیدا ہو گئی ہے کہ شاید "نوسانتارا" یعنی ہندوستان اور چین کے درمیان ایک وسطی علاقہ کا قدیم تصور پھر اپنا مقام حاصل کر لے لیکن سوال یہ ہے کہ اس اشتراک کی بنیاد کیا ہو سکتی ہے،؟ بلاشبہ ملائشیا کو انڈونیشیا کے لسانی اور ثقافتی خزانہ سے بہت کچھ مل سکتا ہے لیکن ملائشیا کے گہرے مذہبی جذبات اور انڈونیشیا کی نام نہاد سیکولرزم کے درمیان مفاہمت کی شکل کیسے پیدا ہو سکتی ہے،؟

انڈونیشیا میں اکتوبر کے انقلاب کے بعد کمیونسٹ چین اور چینی اقلیت کے خلاف بڑی شدت

سے جذبات ابھر آئے ہیں، ملائیشیا میں فرقہ وارانہ جذبات پہلے ہی سے عروج پر ہیں، دونوں میں مذہبی انتہا پسندوں اور انتہا قوم پروروں کے درمیان مفاہمت کی کوششیں جاری تھیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نفرت اور تشدد کا لاوا کب پھر پھوٹ نکلے، انڈونیشیا میں آباد چینیوں کیلئے تو چین نے اپنے ملک میں واپس آنے کی پیشکش بھی کی تھی،

انڈونیشیا اور ملائشیا کی چینی اقلیت کی مخالفت کے اسباب مختصراً یہ ہیں، اولاً یہ غیر ملکی اور غیر نسل کے ہیں، جو ملکی ثقافت اور معاشرہ سے الگ اپنی وحدت کو برقرار رکھتے ہیں دوسرے اقتصادیات پر مکمل طور پر چھائے ہوئے ہیں، تیسرے ان پر بین الاقوامی اشتراکیت کے گہرے اثرات ہیں، چوتھے یہ ملحد ہیں، اس لئے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان ملکوں کے موجودہ ارباب اقتدار فرقہ وارانہ انتہا پسندی کے بارے میں کوئی معقول اور منصفانہ رویہ اختیار کرنے کے اہل ہیں؟ یا ان عناصر کو من مانی کرنے کا موقع مل جائے گا،

حال ہی میں بورنیو ملائی حصے کے جنگلات میں روپوش چینی گوریلا دستوں کے لئے کچھ اشتہارات ملائی حکومت کی طرف سے پھینکے گئے تھے، جن میں ٹنکو عبد الرحمن کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر یہ دستے ہتھیار ڈال دیں، تو ان کو معاف کر دیا جائے گا، اور بحفاظت ملک سے باہر جانے کی بھی اجازت دیدی جائے گی، ان گوریلا دستوں کی تشدد انہ اور تخریبی کارروائیاں اگرچہ بہت حد تک کم ہوگئی ہیں لیکن ختم نہیں ہوئی ہیں، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ٹنکو عبد الرحمن کے ذہن میں وہ کونسی جگہ ہے جہاں ان باغی چینیوں کو بھیجا جا سکتا ہے، ؟ وہ جگہ چین یا سنگاپور ہی ہو سکتی ہے، ان اشتہارات میں سنگاپور کے وزیر اعظم لی۔ کوان۔ ایو کے اس بیان کو بھی نشر کیا گیا تھا کہ ریاست سنگاپور تمام چینی نژاد لوگوں کی آخری پناہ گاہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ٹنکو کے ذہن میں سنگاپور ہی رہا ہوگا،

(مسلم ورلڈ)

مطبوعاتِ جدیدہ

کتاب الاموال حصہ اول و دوم مترجمہ جناب عبدالرحمٰن طاہر سورتی صاحب، تقطیع کلاں،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات بالترتیب ۵۴۳ و ۴۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ عہ
و ۱۲ عہ، پتہ:- ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد (پاکستان)

امام ابوعبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) جامع کمالات اکابر علماے اسلام میں تھے، اُن کی تصنیفات میں کتاب الاموال بہت اہم اور مشہور ہے، اسلام کے مالیاتی امور و مسائل پر قدما کی جو چند کتابیں زیادہ مہتم بالشان اور مستند سمجھی جاتی ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے، اس میں ان اموال کا ذکر ہے، جو اسلامی حکومت (بیت المال) کی تحویل میں ہوتے ہیں، اس کے متعدد اجزا ہیں، زیرِ نظر کتاب اس کا اردو ترجمہ اور دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ان آمدنیوں کا ذکر ہے، جو اسلامی حکومتوں کو مفتوحہ علاقوں اور غیر مسلموں سے حاصل ہوتی ہیں، جیسے فَے، غنیمت اور جزیہ وخراج وغیرہ، اُن کی مختلف صورتیں اور سب کے احکام، غنیمت اور فَے کے مصارف، اُن کا فرق، جزیہ وخراج کی وصولی کے قاعدے، زمینوں کے احکام، تقسیم اراضی، جاگیرداری، فوجی قوت اور صلح سے فتح کئے جانے والے علاقوں کے قوانین، امن و صلح اور عہد شکنی کی صورتوں اور اُن کے احکام، شرائط صلح، اہلِ کتاب و مشرکین، اور مشرکین عرب و عجم کا فرق، اور ان کے احکام، ذمیوں کے مسائل و حقوق اور امام و رعایا کے باہمی حقوق اور ذمہ داریاں وغیرہ پر مفصل اور محققانہ بحثیں ہیں، اور دوسرے حصہ میں مسلمانوں سے ملنے والی اسلامی حکومت کی آمدنی یعنی صدقہ و زکوٰۃ کا ذکر ہے، اس میں زکوٰۃ کی فرضیت، اہمیت، فضیلت، مختلف قسم کے

اموال مثلاً مختلف مویشیوں، اور جانوروں، سونے چاندی کے زیورات اور سکوں، زرعی پیداوار درختوں کے پھلوں کی زکوٰۃ کے احکام و مسائل محصلین زکوٰۃ کے ضابطے مختلف پیمانوں اور اوزان کی تحقیق اور زکوٰۃ کے مصارف و مدات وغیرہ تمام مباحث آگئے ہیں، ان مسائل کے ضمن میں ابو عبید نے اسلام کے تقریباً دوسو سالہ عہد کے مالیاتی نظام کے واقعات، رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدینؓ کے فرامین اور تعامل نیز ائمۂ اسلام اور فقہائے امصار کے اقوال وغیرہ بھی تحریر کئے ہیں، اور مختلف اقوال میں محاکمہ اور اپنے اجتہادات و اختیارات بھی بیان کئے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب مالیات کے متعلق احادیث و آثار اور فقہی اقوال و احکام دونوں کا جامع ذخیرہ، اسلام کے مالیاتی نظام کی ایک مستند دستاویز اور مالیات کے متعلق مختلف النوع معلومات کا ایک وسیع دفتر ہے، جناب عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے جو علامہ محمد سورتی مرحوم کے لائق فرزند ہیں، اس پراز معلومات اور ضخیم کتاب کا اردو ترجمہ شائع کرکے ایک مفید دینی خدمت اور موجودہ زمانہ کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے، پہلی جلد میں انھوں نے امام ابو عبید کے حالات اور کارنامے بھی بیان کئے ہیں، اور ہر جلد کے شروع میں ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی ہے، اس میں دونوں حصوں کے مضامین و محتویات کی وضاحت اور کتاب الاموال کا تعارف کرایا گیا ہے،

العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین — مرتبہ مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، طباعت خوشخط ٹائپ صفحات ۲۳۰، قیمت درج نہیں، پتہ (۱) خالد کمال وظفر مسعود، مبارک پور اعظم گڈھ، (۲) ابنا مولوی محمد بن غلام رسول سورتی تاجران کتب جامع محلہ بمبئی نمبر ۳،

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے عرب و ہند خصوصاً ان کے ابتدائی اسلامی عہد کے تعلقات

پر اُردو اور عربی میں کئی کتابیں لکھی ہیں، یہ عربی کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاے راشدینؓ اور بنی امیہ کے زمانہ میں دونوں ملکوں کے تعلقات، اور خلافت راشدہ اور اموی دور میں ہندوستان کی سرحدوں اور بعض علاقوں میں مسلمانوں کی فتوحات کا تذکرہ ہے۔ غزوات و فتوحات یا دعوت و تبلیغ وغیرہ کی غرض سے یہاں آنے والے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تراجم قلمبند کئے گئے ہیں، اور آخر کے ایک باب میں اُس زمانہ کے مشہور ہندوستانی علماٗ و محدثین کا اجمالی تذکرہ بھی ہے، عرب و ہند کے متعلق قاضی صاحب کی تصنیفات میر انیس مرحوم کے اس مصرع کا

ع:۔ "اک پھول کا مضمون ہو تو سو طرح سے باندھوں"

بالکل نمونہ ہیں لیکن موضوع کی یکسانیت نے اُن کی ہر کتاب میں تکرار پیدا کر دی ہے، چنانچہ اس کتاب میں بھی دوسری کتابوں کے اکثر محتویات آگئے ہیں، اور حشو و زوائد سے بھی خالی نہیں، تاہم کتاب محنت سے لکھی گئی، اور پر از معلومات ہے، اس سے مسلمانوں کے ہندوستان پر ابتدائی حملے اور قبضے کی روداد اور قرن اول اور قرن ثانی کے ان مجاہدین، امراء عساکر، حکام و والیان ریاست کے جو یہاں آئے، اور مختلف مناصب پر فائز ہوئے، یا داعیوں اور مصلحوں یا جن کا کسی نوع کا بھی یہاں سے تعلق رہا ہے، کے حالات وغیرہ معلوم ہوتے ہیں، یہ کتاب عرب و ہند کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، زبان و بیان دلکش اور سلیس ہے،

فن اسماء الرجال مرتبہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۰، قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے، پتے:۔ (۱) مکتبہ فلاح دارین ترکیسر ضلع سورت، گجرات (۲) مکتبہ الفرقان کچری روڈ، لکھنو، یو۔پی،

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کو درس و تدریس کی طرح تصنیف و تالیف کا بھی اچھا ذوق ہے،

کئی سال سے وہ حدیث کی تعلیم کی خدمت انجام دینے کے علاوہ وقتاً فوقتاً اس کے متعلق مفید مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں جن کا ایک مجموعہ "محدثین عظام" کے نام سے پہلے شائع ہو چکا ہے، اب یہ نیا مجموعہ شائع کیا گیا ہے، اس میں رواۃ حدیث کی تحقیق و تفتیش اور روایات کے صحت و انضباط کے متعلق محدثین کے کارناموں اور بے نظیر خدمات کا ذکر، فن اسماء الرجال کی اہمیت، جرح و تعدیل کے اصول و ضوابط تحریر کئے گئے ہیں، اردو میں اس موضوع پر ضمناً بہت لکھا گیا ہے، سیرۃ النبی حصہ اول اور خطبات مدراس میں بھی اس پر سیر حاصل بحث ہے لیکن کوئی مستقل کتاب موجود نہیں تھی، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی، صفحہ ۱۶ پر جامع ترمذی کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے، اس میں تین غلطیاں ہو گئی ہیں، ترمذی نے "لا نترک" کے بجائے "لا ندع"، "سنۃ نبیہ" کے بجائے، "سنۃ نبینا" اور "او" کی جگہ "ام" نقل کیا ہے، البتہ امام مسلم نے "لا ندع" اور "او" کی اور امام دارمی اور دارقطنی نے "سنۃ نبیہ" کی روایت کی ہے، ص ۶۷ پر کذب بمعنی اخطاء کو علمائے امت کا متفقہ قول قرار دیا گیا ہے، حالانکہ حضرت عمرؓ کا قول خود اس اجماع کا ناقض ہے، اور مصنف نے ابن حجر اور خطیب کے جو بیانات اس کی تائید میں نقل کئے ہیں، ان سے کوئی ثبوت نہیں مہیا ہوتا ہے، ص ۷۳ پر ہے کہ خوارج اور روافض کے ظہور کے بعد روایات تحقیق و تفتیش کے بعد قبول کی جاتی تھیں" اور اس کے ثبوت میں حاکم کا ایک قول نقل کیا گیا ہے، جس سے اس کے بجائے شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) ہی کے زمانہ سے تحقیق روایات کا پتہ چلتا ہے، ص ۹۱ پر محمد بن طاہر کا نام محمد طاہر لکھا گیا ہے، جو غلط ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب مستند خصوصیت سے عربی خواں طبقہ اور طلبۂ حدیث کے مطالعہ کے لائق ہے، مصنف نے اسماء الرجال کے متعلق اکثر معتبر عربی کتابوں کا نچوڑ اس میں نہایت سلیقہ سے جمع کر دیا ہے،

بھوپال اور غالب :- مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی صاحب تقطیع خورد، کاغذ،

کتابت، وطباعت بہتر، صفحات:- ۱۲۸، قیمت:- ۲/۵ پیسے، پتہ:- شعبۂ اردو، سیفیہ کالج بھوپال،

مرزا غالبؔ مرحوم اگرچہ بھوپال نہیں جا سکے تھے لیکن اس سے ان کا کئی حیثیتوں سے تعلق رہا ہے، اردو کے متعارف اہل قلم جناب عبد القوی دسنوی نے اس کتابچہ میں اُن کے ان تعلقات کا ذکر، اور اُن کے گیارہ شاگردوں کے جن کا بھوپال سے کسی قسم کا تعلق رہا ہے حالات مختصر لکھے ہیں، اور غالبؔ کے دو ملاقاتیوں نواب صدیق حسن خاں اور امید علی اشہری کا بھی ذکر کیا ہے، آخر میں بھوپال کی ایک شاعرہ اور ایک شاعر کے غالبؔ کی غزل پر خمسے، شنکر پرشاد جوش بھوپالی کا ایک معترضانہ مضمون نمونۂ منظومہ بیت غالب نسخہ حمیدیہ، اور سہا صاحب بھوپالی کی شرح، دیوانِ غالب، مطالب الغالب کا بھی اجمالی ذکر ہے، اس حیثیت سے یہ نہایت دلچسپ، اور غالبیات کے متعلق انوکھے طرز کا کتابچہ ہے،

غزل انسائیکلوپیڈیا، مرتبہ جناب ذکی کاکوری صاحب ایم اے، علیگ تقطیع خورد کاغذ، طباعت وکتابت بہتر، صفحات ۲۰۴، قیمت:- صر پتہ:- مرکز ادب اردو ۱۳۷- شاہ گنج، لکھنؤ،

غزل اردو کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے، اس لئے ہر زمانہ میں اس کے انتخابات مرتب کئے گئے ہیں، یہ نیا انتخاب اردو کے ایک نوجوان اور خوش ذوق شاعر نے کیا ہے، گو اُس کو جامع اور مکمل نہیں کہا جا سکتا، تاہم مرتب نے شروع سے لے کر اب تک کی غزلیہ شاعری کے نمونے اس میں جمع کر دیئے ہیں، اور مختصر ہونے کی وجہ سے ہر شخص کے لئے اس کا مطالعہ آسان بھی ہے،

"ض"

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: للعہ

۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصۂ دوم) ” للعہ

۳۔ اسوۂ صحابیات: ” عہ

۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: للعہ

۵۔ حکمائے اسلام: (حصۂ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: للعہ

۶۔ حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: للعہ

۷۔ شعرالہند (حصۂ اول) ” للعہ

۸۔ شعرالہند (حصۂ دوم) ” للعہ

۹۔ انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ

۱۰۔ سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیرِ طبع)

۱۱۔ امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت للعہ

۱۲۔ ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیرِ طبع)

۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل اُنکے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت للعہ

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی تاریخی و تنقیدی ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب، اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہو جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۲۴۶ قیمت: عہ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ نے مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس
مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا
نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ
مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب
انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ا
کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ
اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے
لئے رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورت
درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب
پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب
غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو ابو
دنیا پر دینِ اسلام کے علمبردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف
ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۳۳۰ صفحے، قیمت :- عہ

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ